کاغذی ہے پیرہن
آپ بیتی
عصمت چغتائی

عصمت چغتائی سے انٹرویو

(از شمع افروز زیدی)

عصمت چغتائی اردو داں طبقہ کے لئے جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ تقریباً ہر اردو [illegible] ان کو جانتا ہے۔ میں نے بھی ایم۔ اے میں ان کو پڑھا اور جیسا کہ انسانی [illegible] کسی کو پسند کرنے لگتا ہے، تو اس سے ملنے کا اشتیاق بھی ہوتا ہے۔ [illegible] کیفیت میری بھی تھی۔ میں نے ان کو پڑھا اور دل میں خواہش بیدار ہوئی [illegible] ملوں۔

[illegible] قسمتی سے ڈاکٹر محمد حسن نے عصمت آپا کو جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں [illegible] انھوں نے ہنستے ہوئے قبول کر لیا۔ ہم سب کے چہرے مسرت سے [illegible]۔

[illegible] ان بھی آگیا جب میں اپنے کالج میں اپنے ساتھیوں کا انتظار کر رہی [illegible] عصمت آپا کی کار آکر رکی اور ہم سب ان کے استقبال کے لئے آگے [illegible] کی شال اور لائٹ کتھئی کلر کی ساڑھی کالے فریم کا چشمہ ان کی [illegible] بنائے ہوئے تھا۔ سیمینار روم میں ان کے استقبال کی رسوم ادا کی [illegible] کے بعد انھوں نے اپنی کہانی سنائی۔ کہانی ختم ہوتے طلباء آٹوگراف بک [illegible] لیتے ہیں۔ میرے ذہن میں ٹیڑھی لکیر سے متعلق سوالات کلبلا [illegible] ہی وہ اسٹیج سے اتریں میں نے انھیں جا لیا اور ان سے گھر پر ملنے کی [illegible] اظہار کیا۔ عصمت آپا نے بڑی فراخ دلی سے ہنستے ہوئے کہا "ضرور! [illegible]"

[illegible] شام ملاقات کا ٹائم دیا۔ عصمت آپا اپنی بھتیجی طاہرہ نیازی کے یہاں [illegible] پارٹ ۲ میں ٹھہری ہوئی تھیں۔ میں وہاں پہنچی، کال بیل پہ انگلی

رکھی' دروازہ کھلا' طاہرہ نیازی نے دروازہ کھول کر اندر بلاتے ہوئے کہا "آپ شمع-ہیں؟" میں مسکرا دی "جی ہاں۔"

مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر آواز دی "پھوپھو آپ کی مہمان آگئیں۔" چند منٹ بعد عصمت آپا چہرے پر بھرپور مسکراہٹ لئے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں۔

لائٹ بسنتی ساڑھی میں ان کی شخصیت نکھری ہوئی تھی۔ انہوں نے مردانہ گھڑی باندھ رکھی تھی۔ عصمت آپا سے باتیں کرتے ہوئے محسوس ہوا کہ بڑی موڈی ہیں۔ انہوں نے ہنس ہنس کر خود باتوں کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ میں ان کی باتیں سنتی رہی اور سوچتی رہی کہ آپا اتنی عمر میں بھی کتنی زندہ دل ہیں۔ میرا ذہن سوالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ آخر کار میں نے کہا "آپا آپ کا انٹرویو لینا ہے۔"

وہ چھناکے کے ساتھ ہنس پڑیں "اس عمر میں انٹرویو' چلو یہ بھی ہو جائے۔" میں نے پہلا سوال کیا "ٹیڑھی لکیر آپ کی پہلی کوشش کے ساتھ ہی آخری کوشش بھی ہے؟"

"مجھے اس سے زیادہ 'دل کی دنیا' پسند ہے" ان کا مختصر سا جواب تھا۔

"پہلا افسانہ آپ نے کب اور کس عمر میں لکھا؟"

"پہلا افسانہ ۱۲ سال کی عمر میں لکھا تھا نام یاد نہیں۔"

گویا انہیں معلوم تھا کہ میں افسانے کا نام ضرور پوچھوں گی' اس لئے اس کا جواب انہوں نے پہلے ہی دے دیا تھا۔

"شائع کرایا؟"

"نہیں' گھر کا ماحول ایسا نہیں تھا' افسانہ نگاری کو معیوب سمجھا جاتا تھا' اس لئے کسی سہیلی کے نام سے چھپوایا تھا۔" عصمت آپا کی باتوں کا طویل سلسلہ پھر شروع ہو گیا۔ وہ بڑی دلچسپی کے ساتھ اپنے بچپن کی شرارتوں کا ذکر کرنے لگیں "گھر میں شرارت [illegible] پھٹکار پڑتی تھی۔ مجھے گھر کے کاموں میں کبھی دلچسپی نہیں ہوئی۔ گڑیوں [illegible] کھیلنے میں بھی دل نہیں لگا۔ گڑیا پھاڑ کر رام رام ست کر دیتی تھی۔ سینے کے لئے [illegible] کے ڈھیر میں چھپا دیتی تھی۔ ہاں لکھنے لکھانے کا ابتدا سے ہی شوق تھا' [illegible] رات میں جب سب سو جاتے

تھے تب بیٹھ کر لکھتی تھی۔ ایک دن میرے بھائی نے میرے لکھے ہوئے کاغذات پکڑ لئے اور گھر میں خوب اودھم مچایا۔ میں نے یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ کسی انگلش ناول کا ترجمہ کر رہی ہوں۔"

میں نے پوچھا "آپا آپ نے کبھی عشق کیا؟"

میرے اس سوال پر وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑیں اور بہت دیر تک ہنستی رہیں۔ پھر بولیں "ہاں بھائی بہت عشق کئے یہاں تک کہ گنتی بھی یاد نہیں۔"

"پہلا عشق کتنی عمر میں کیا؟"

"یہی ۱۰۔ ۱۱ سال کی عمر میں' ہر خوبصورت لڑکا دیکھ کر آہیں بھرنے لگتی تھی۔ لیکن اس حد تک نہیں کہ کبھی عشق میں مرنے کے لئے سوچا ہو۔ پہلا عشق اپنے رشتے کے بھائی سے کیا تھا۔ بہت خوبصورت تھے۔ پھر وہ پاکستان چلے گئے' میں انہیں کبھی بھول نہ سکی۔ میرے دل میں ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ میں ان سے ایک بار ضرور ملوں۔ اپنے پہلے محبوب سے۔۔۔۔ گزشتہ سال پاکستان گئی' تو ان سے ملنے کا بہت اشتیاق ہوا۔ لیکن" ...... اتنا کہہ کر وہ ہنسنے لگیں۔

میں نے پوچھا "کیا ملاقات نہیں ہوئی؟"

"ملاقات تو ہوئی۔" وہ ہنستے ہوئے بولیں۔ "لیکن انہیں دیکھ کر سارا عشق رفو چکر ہو گیا۔ ان کا جھریوں بھرا چہرا' ایک آنکھ خراب اور پوپلا منہ دیکھ کر۔"

"کیا آپ نے شاہد صاحب کو پسند کر کے شادی کی تھی یا Arranged تھی؟"

"میری زندگی میں کبھی کچھ Arranged (طے شدہ) نہیں رہا۔"

"شادی سے پہلے عشق ضرور تھا لیکن ..... بعد میں سب رفوچکر ہو گیا۔"

"آپ کی ازدواجی زندگی کیسے گزری؟"

ہم دونوں بالکل ایک دوست کی طرح رہتے تھے' خوب گپیں مارتے تھے' لیکن جہاں بھی انہیں یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ میری بیوی ہے بس وہیں کھٹک جاتی تھی۔ کئی بار پکڑا چھوڑا' پکڑا چھوڑا' میرا خیال ہے' آخیر وقت تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ میرے لئے لڑکوں کی کمی نہیں تھی۔"

"اب بھی کسی سے عشق ہے؟"

"ہاں فیض اور سردار جعفری سے۔ ایک بار بنے بھائی سے بھی کہا تھا کہ سب سے عشق کر چکی آپ سے بھی کرنے کو دل چاہتا ہے انہوں نے ڈانٹ دیا بیچارے!"

عصمت آپا بڑی بے تکلفی سے باتیں کر رہی تھیں اور ساتھ ساتھ اپنے واقعات بھی سنا رہی تھیں۔۔ "ہنس کر بولیں' بھئی عشق کا جذبہ تو بچپن سے ہی کارفرما ہے اس پر تو میرا پیدائشی حق ہے۔ جب میں چھوٹی تھی' تو میری ہم عمر بھانجی بیمار پڑتی تھی' سب اس سے لاڈ پیار کرتے تھے۔ ڈاکٹر آتا تھا' وہ بھی اس سے پیاری پیاری باتیں کرتا تھا۔ اسے دیکھ کر رقابت کا جذبہ پیدا ہوتا تھا۔ مجھے بڑا رشک آتا تھا اور میرا بھی دل چاہتا تھا کہ میں بھی بیمار پڑوں اور ڈاکٹر مجھ سے بھی پیار بھری باتیں کرے۔ لیکن میری یہ تمنا دل میں ہی رہی۔ میں کبھی بیمار نہیں پڑی' اسی لئے سب نے میرا نام 'بھوت' رکھ دیا تھا!"

ان کی باتوں سے میرا ذہن فوراً ہی ٹیڑھی لکیر کی طرف مبذول ہو گیا۔ اسی کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے پوچھا۔

"آپا آپ کی تحریروں میں تخیل ہے یا حقیقت؟"

"تخیل سے میں نے کبھی کام نہیں لیا' حقیقت ہی بیان کی ہے!"

"پھر لحاف کو حقیقت سمجھوں؟"

"ہاں' ہمارے محلے کا یہ سچا واقعہ ہے۔"

" اس کا مطلب ہوا کہ ٹیڑھی لکیر بھی حقیقت ہے۔ اس میں آپ کی شخصیت نظر آتی ہے۔ آپ ہی اس کی ہیروئن معلوم ہوتی ہیں؟"

" نہیں' اس میں حقیقت کو دخل نہیں۔" وہ کچھ جھنجلا سی گئیں۔

میں بھی الجھن میں مبتلا ہو گئی اور سوچتی رہ گئی کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط' کسے حقیقت کہا جائے اور کسے تخیل' ایک ہی وقت میں دو بیان' بہرحال یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا اور بھی بہت سے سوالات میرے ذہن میں تھے۔

میں نے پوچھا "آپ اردو کی ادیبہ ہیں' پھر اس کی مخالفت کیوں کرتی ہیں۔ میرا مطلب ہے' اس کا رسم الخط کیوں بدلنا چاہتی ہیں؟"

میرے اس سوال کا جواب انہوں نے بڑی وضاحت سے دیا "اردو کا رسم الخط نہیں بدلنا ہے' کیونکہ یہ ایک طرح کا شارٹ ہینڈ ہے۔ اس سے میرا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ میں اردو کی مخالف ہوں یا رسم الخط بدلنا چاہتی ہوں۔ میں یہ کہتی ہوں' کہ اردو کے ادب عالیہ کو ٹرانسلیٹ نہ کیا جائے' ہندی میں جوں کا توں محفوظ کر لیا جائے۔ اردو کا Script بچوں کو سکھایا جائے' تو بچوں کو بہت فائدہ ہو گا۔ ہمارا ادب ہندی کی قطار میں کھڑا ہو کر بالکل ہی پٹ جاتا ہے۔ کیونکہ ادیب لوگ اس کا ترجمہ خود تو کرتے نہیں بلکہ اپنی بیویوں اور بیٹیوں سے کراتے ہیں' جس کی وجہ سے اس کی ہیئت ہی تبدیل ہو جاتی ہے اور کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ لوگوں نے میری باتوں کو غلط سمجھا۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میں اردو کا رسم الخط ہی بدلنا چاہتی ہوں۔ حالانکہ میں کہتی ہوں کہ جب اردو ادب کو ہندی میں منتقل کیا جائے' تو ترجمہ کرنے کے بجائے صرف رسم الخط ہندی رہے' باقی الفاظ اردو ہی کے رہیں۔"

"نئے ادیبوں کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟ کیا آپ انہیں پڑھتی ہیں؟"

"علی باقر کا نئے ادیبوں میں جواب نہیں۔ اس کی کہانیاں بھولی ہیں' لیکن کتنی گہری' اس نے کونین کو شکر میں لپیٹ کر رکھ دیا ہے۔ ایک نیا انداز لے کر آیا ہے' اس نے اونچے طبقے کے لئے نہیں' بلکہ اردو داں طبقے کے لئے لکھا ہے۔"

اتنی دیر تک میں ان سے باتیں کرتی رہی' مجھے اندازہ ہوا کہ وہ بس ایک جگہ تھوڑا سا الجھی تھیں' ورنہ مستقل سنجیدگی کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کرتی جا رہی تھیں۔ مجھے اتنی دیر میں ذرا سی بھی جھجک نہیں ہوئی تھی' ورنہ ملنے سے پہلے میں یہ سوچ رہی تھی کہ پتہ نہیں عصمت آپا کیسی ثابت ہونگی؟ لیکن ملنے پر اندازہ ہوا کہ وہ بہت ہنس مکھ ہیں۔ اب میں ان سے خوب کھل کر باتیں کر رہی تھی۔

میں نے پوچھا "آپ کی نظر میں ابھرتا ہوا ادیب کون ہے؟"

"جیلانی بانو یا پھر محمد اشرف' جو علی گڑھ میں زیر تعلیم ہے اس کی ایک کہانی قلم میں چھپی تھی' اس نے مجھے بہت متاثر کیا۔"

"آپ نے فلموں میں کسی مجبوری کی وجہ سے بطور ایکٹریس کام شروع کیا ہے!"

سوال پوچھتے ہوئے میرے ذہن میں ششی کپور کی فلم 'جنون' تھی۔

"مجھے کسی نے مجبور کیا ہے؟ ہاں شیام بینگل میرے بہت پیچھے پڑے تھے' تو میں نے کہہ دیا تھا کہ بیٹیوں سے پوچھ کر کروں گی۔ اس پر شیام بینگل نے کہا' کہ کبھی آپ نے پوچھ کر کچھ کیا ہے؟ ہاں بھائی میرا اور میری بیٹیوں کا معاہدہ ہے' جب میں نے اپنی بیٹیوں کو بتایا' تو وہ لگیں کودنے کہ ممی فلموں میں کام کریں گی۔ تمہیں شاید معلوم ہو کہ فلم "لالہ رخ" میں نے خود ہی ڈائریکٹ کی تھی۔"

"اپنی پسندیدہ شخصیت بتایئے؟"

"بھئی ایک بھیڑ ہے تعین کرنا مشکل ہے۔"

اب میرا اگلا سوال ذرا ہٹ کر تھا۔ میں نے کہا "حضرت محمدؐ کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟"

" He is a great man (وہ عظیم شخص تھے!)"

"خدا کے بارے کیا نظریہ رکھتی ہیں؟"

ہنستے ہوئے بولیں "بھئی خدا کا معاملہ .... بڑا پرائیویٹ ہے ..... لیکن میں اس سے ڈرتی نہیں ہوں!"

میں ایک لمحہ کے لئے سوچ میں پڑ گئی۔ مجھے ایسا لگا کہ میں خوشی کے پہاڑ سے گرنا شروع ہو گئی ہوں۔ میں پوچھتی ہوں :۔

"تسلیم تو کرتی ہیں' اس کے وجود کو؟"

"اس میں تسلیم کرنے نہ کرنے کی گنجائش ہی کہاں ہے۔ ایک چیز ہے تو ہے۔"

"کیا آخرت میں یقین کرتی ہوں؟"

"نہیں۔۔۔ البتہ ری برتھ (آواگوان) میں یقین رکھتی ہوں۔ جنت و دوزخ میں میرا یقین بالکل نہیں ہے۔"

میرے دل و دماغ کو جھٹکا سا لگتا ہے اور میں محسوس کرتی ہوں' جیسے میرے ذہن سے باقی سارے سوال غائب ہو گئے ہوں۔ اب کچھ پوچھنے کی خواہش ہی نہ رہی تھی۔ پھر بھی میں بجھے دل کے ساتھ ان سے پوچھتی ہوں:۔

"آپ کی آخری خواہش کیا ہے؟"

"میری کبھی کوئی خواہش آخری نہیں ہوئی۔ ہاں سیر کرنے کو دل چاہتا ہے' کچھ تخلیق کرنا بھی چاہتی ہوں۔ گاؤں کے اوپر لکھنا چاہتی ہوں' لیکن گاؤں کے دکھ برداشت نہیں ہوتے۔ وہاں رہ کر دیکھا ایک ہی پلنگ پر کئی کئی بچے سوتے ہیں۔ پاس ہی جانور بندھے ہوتے ہیں۔ بھئی گاؤں میں مجھے تو ایک دن بھی گزارنا دشوار ہو گیا تھا۔"

اب میں آخری سوال پوچھتی ہوں' ان سے انہیں کے بارے میں: "آپ عصمت کو بحیثیت افسانہ نگار پسند کرتی ہیں یا بحیثیت عورت!"

"مجھے عصمت افسانہ نگار پسند ہے۔" عصمت آپا نے برجستہ جواب دیا۔

قدرت نے ان کے بارے میں انہیں کی زبان سے درست بات کہلوا دی تھی۔ بحیثیت افسانہ نگار عصمت چغتائی مجھے بھی پسند تھی اور بحیثیت عورت سخت ناپسند! ان سے ملنے جو اشتیاق تھا' وہ ملنے کے بعد بقول عصمت آپا "رفو چکر" ہو گیا تھا۔

میں جب اپنے گھر جا رہی تھی بہت اداس تھی' جیسے میرا کوئی عزیز مر گیا ہو!!

جیسے ہی ننھے بھائی نے حامی بھری اماں نے خودکشی کا ارادہ ترک کر دیا اور اٹھ کر بیٹھ
گئیں۔ ننھے بھائی نے ایک شرط لگا دی کہ شادی میں بالکل پیسہ خرچ نہیں کیا جائے گا
ننھے بھائی اماں کے ساتھ جائیں گے اور دلہن بیاہ لائیں گے۔ نہ جہیز لیا جائے گا نہ چڑھاوا
چڑھے گا۔ خاموشی سے نکاح ہوگا اور بس۔ ابا نے ان کا ساتھ دیا۔ پنشن کے بعد منے بھائی
کی شادی میں اماں نے اتنا روپیہ پانی کی طرح بہایا تھا کہ ابا کا جی کھٹا ہوگیا تھا۔ اماں نے
فوراً وعدہ کرلیا۔ اماں جھوٹے وعدے کرنے کی عادی تھیں ابا ذرا بھی پیسہ دینے میں
کوتاہی کرتے تو وہ چپکے سے قرض لے لیتیں اور اللّے تللّے سے خرچ کرتیں اگر بعد میں ابا
چوں چرا کرتے تو وہ منہ پھلا کر بھوک ہڑتال کر دیتیں۔ ابا پست ہو کر ہار جاتے وہ جانتے
تھے خرچ کم کرنے کی دھمکیاں فضول ہیں۔ اماں جو چاہیں گی کریں گی مگر اس بار ننھے بھائی
ان کے ساتھ تھے اس لیے ابا کو یقین تھا کہ اماں ضرورت سے زیادہ من مانی نہ کرسکیں گی
اماں کہاں تو دنیا سے منہ موڑ رہی تھیں، کہاں ایک دم حکم دیا کہ اسی وقت پیغام
بھیجا جائے۔ ابا نے اپنا لکھنے کا صندوقچہ منگوایا اور پیغام کا مضمون مرتب کرنے لگے بڑے ابا فوراً
بلائے گئے کہ یہ کارِ خیر ان کے بغیر کیسے انجام دیا جا سکتا تھا مضمون مرتب ہونے لگا۔
"رقعہ فارسی میں لکھا جائے گا۔" بڑے ابا نے الٹی میٹم دے دیا۔ کیونکہ ہم پٹھانوں کی
مادری زبان فارسی تھی۔ مگر اماں بپھر پڑیں

"اے خاک ڈالو موئی فارسی پر۔ پہلا سا رقعہ کیا، وہ ظفر حسین دلہن کے باپ کس سے
فارسی پڑھواتے پھریں گے۔" بڑی رد و قدح کے بعد طے ہوا کہ رقعہ اردو میں لکھا جائے گا۔ گلابی
کاغذ کے نہ ہونے کا اماں کو بڑا غم ہوتا لیکن وہ کاغذ منگوانے کا انتظار کہاں کر سکتی تھیں۔ رقعہ لکھا
گیا اور طے ہوا کہ ہلدی کے چھینٹے برکت کیلئے ڈالے جائیں۔ ننھی بوا نے فوراً ہلدی پیس دی سب

بچے چھینٹے دینے پر جٹ گئے۔ اور کئی لفافے غارت ہوئے تب اماں نے جوتی سنبھالی اور
خدا خدا کرکے لفافہ سنوارا گیا اور رقعہ بھیجا گیا۔ اماں نے فوراً بزاز اور سنار بلوائے اور ابا
کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوئی اور جوڑے تیار ہونے لگے۔ ہم لوگ بڑے غمگین تھے کہ برات
میں نہیں جائیں گے۔ مگر اماں نے کہا "اے بس چپکے سے بیٹھے رہو تم سب جاؤ گے۔"
ابا اور ننھے بھائی سے چھپا کر سب کے نئے جوڑے بنے اور بری تیار ہونے لگی۔
"کوئی نہیں جائیگا۔" والے وعدے کو بھول کر اماں نے ساری برادری اور خاندان کو فوراً رقعے
بھجوائے ماموں کا جواب آیا تو تاریخ بھی طے ہوگئی آپا بھی دلی سے آگئیں اور باجی رامپور سے آن ٹپکیں
ننھے بھائی بہت چراغپا ہوئے کہ اماں وعدہ خلافی کر رہی ہو۔ اماں نے معصوم صورت بنا کر کہہ دیا
"سب اپنا اپنا خرچ کرکے شادی میں جائیں گے پھر تم روکنے والے کون ہوتے ہو؟" اس کا
جواب کسی کے پاس نہ تھا مگر ابا جانتے تھے سب کا خرچ انہیں دینا ہوگا اماں کو وہ اچھی طرح
جانتے تھے مگر ان سے ٹکر لینا فضول سمجھتے تھے۔ جانتے تھے ان کی ایک نہ چلے گی اماں جو طے
کر چکی ہیں وہ کریں گی۔ ننھے بھائی نے دولہا میاں کو خوب بھڑکایا۔
"مجھے معلوم ہوا ہے کہ سارے خاندان کو آگرہ بلا دیے گئے ہیں اور سب برات میں
جودھ پور چلیں گے۔"
"میں شادی نہیں کروں گا۔" ننھے بھائی نے دھمکی دی۔
"شادی تو اب کرنی پڑے گی پیغام منظور ہوگیا۔ اماں سب کو قتل کر دیں گی۔ ہم
اپنے ماموں کی اتنی خطرناک بے عزتی نہیں کرسکتے۔"
"مگر ساری برادری تو بہت لمبی چوڑی ہے بہت خرچہ ہوگا۔ میں کوڑی نہیں کماتا سرکار
کی پنشن ہو چکی ہے اتنے بڑے خاندان کا ان پر بار ہے شادی کا بوجھ میں نہیں ڈالنے دوں گا میں
غائب ہو جاؤں گا۔"
"اب پیغام منظور کرا لیا گیا ظفر حسین نے رقعے بھی چھپوا لیے اب کچھ نہیں ہو سکتا۔" ابا
نے سنا تو کہا۔
"میں شادی نہیں کرونگا میں نواب فیاض کے ساتھ شکار پر نیپال چلا جاؤں گا۔"
"ہم تمہیں جیل میں سڑوا دیں گے۔" ابا بولے۔

"وہ کیسے؟"

"چوری کا الزام لگا کر۔"

"آپ جھوٹ بولیں گے؟"

"نہیں جھوٹ تمہاری امی بولیں گی۔ ہم ان کی رپورٹ پولیس تک پہنچا دیں گے ان کی بات رکھنے کیلئے اپنا سارا رسوخ لگا دیں گے۔"

"یہ جانتے ہوئے بھی کہ اماں جھوٹ بولیں گی۔؟"

"جھوٹ کا عذاب وہ بھگتیں گی۔"

"الزام کیا لگائیں گے؟"

"زیور چوری کر کے بھاگے ہو۔"

"سرکار آپ زیادتی کر رہے ہیں۔" ننھے بھائی ہنس دیئے۔

"ہم بیٹیوں کے باپ ہیں ہم ظفر کی ذلت برداشت نہیں کر سکتے۔"

"مگر اتنے بڑے خاندان کو برات میں لیجانا کہاں کی عقلمندی ہے؟"

"کون سا خاندان؟" ابا چونکے۔

"آپکو پتہ نہیں اماں نے آگرے کے پورے خاندان کو برات میں چلنے کی دعوت دی ہے۔"

"یہ ان کی زیادتی ہے۔"

"ان کو منع لکھ دیا جائے۔"

"نہیں بلا وا دے کر ہم ایسا نہیں کر سکتے لوگ ناراض ہو جائیں گے۔"

"سرکار یہ تو اندھیر ہے۔"

"ہم تمہاری اماں کے اندھیر سہنے کے عادی ہو چکے ہیں۔" ابا مسکرائے انہیں اماں کی ان بچکانہ غیر ذمہ داریوں پر پیار بھی آتا تھا اور غصہ بھی مگر پیار ہمیشہ غالب آجاتا تھا۔

"ہم نے دانستہً انہیں کبھی دکھ نہیں پہنچایا۔"

دونوں بھائی مسکرانے لگے۔ اماں بڑی پیاری تھیں۔ انہیں جو چاہتا بیوقوف بنا کر ٹھگ لیتا اور وہ جیسے جان بوجھ کر ٹھگ جاتیں۔ ٹھگنے والے سے گھڑی بھر کو بھی بددل نہ ہوتیں۔ ان کے اس بھولپن پر سب کو پیار آجاتا اور بات بھلا

دُلہن کے لئے نہایت راز داری سے بے حد بھاری جوڑا بنا۔ اور جتنا زیور دُلہن بھابی یعنی عظیم بھائی کی دُلہن کے لئے بنا تھا اتنا ہی اُن کا بنا۔ اماں نے اپنے منہ بولے چاچا جی گرجا دیال سے قرض لے کر خوب کپڑے لتے بنائے۔ ابا کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوئی۔ آخر وہ خود ہی زور دینے لگے کہ ہلکا سا ایک جوڑا تو ضرور بناؤ اور دو چار زیور، مگر اماں یہی کہتی رہیں۔

"ظفر میری لاج رکھ لیں گے۔ میں اُن سے چڑھاوا لوں گی۔ آخر وہ ننھے کے ماموں ہیں۔ منتر دار چھوٹے ماموں فرحت حسین عثمانی بھی بھات دے گا مجھے باہنوں میں دس بارہ تولے کے کڑے دے گا۔ وہی میں چڑھا دوں گی۔"

اماں اس بھولپن سے جھوٹ بولیں کہ ابا نہایت دُکھی ہو گئے اور زبردستی اماں کو روپے دیئے۔

چاچا جی کے قرضہ کا تو ہمیں کسی کو پتہ نہیں تھا۔ ہم اپنے کپڑوں کا ذکر ابا کے سامنے ہرگز نہیں کرتے تھے یہ اماں نے سمجھا دیا تھا کہ اگر ابا کو پتہ چل گیا تو سارے کپڑے چولہے میں جھونک دیں گی۔ اور کسی کو شادی میں نہیں لے جائیں گی۔

ادھر ننھے بھائی اور منے بھائی نے نہایت خفیہ طور پر طور پر اماں کے پلان کی کاٹ شروع کر دی۔ ہم لوگوں سے آگرہ سے آنے والے مہمانوں کی فہرست لی کہ ان کے ٹکٹوں کا انتظام کریں گے اور ڈبہ ریزرو کروالیں گے تو کفایت ہو گی۔ اماں خوش ہو گئیں۔ اور دونوں نے سب مہمانوں کو پوسٹ کارڈ ڈال دیئے کہ دُولہا کو ٹائیفائیڈ ہو گیا ہے۔ اس لئے فی الحال شادی ملتوی ہو گئی ہے نئی تاریخ مقرر ہوتے ہی اطلاع دی جائے گی؟

ہم چھوٹا اور میرے ماموں زاد بھائی یعنی دُلہن کے سگے بھائی اور حسیم بھائی کو شادی میں نہیں جانے دیا گیا کیونکہ ان کے امتحان بھی قریب تھے۔ ابا بھی نہیں گئے۔ کیونکہ گھر میں

کسی کو نوکچوں پر لگا رکھی تھی۔ باقی ہم سب روانہ ہو گئے۔ جب بھی ہم لوگ کہیں آتے جاتے تیسرے درجہ کے دو ڈبے ریزرو ہو جایا کرتے تھے۔ اس میں کچر دھان بھر کے جاتی اور ابا فرسٹ کلاس میں جاتے تھے۔ اماں چاہتی تھیں کہ علی گڑھ سے ہی دونوں ڈبے ریزرو کر لئے جائیں تاکہ آگرے کے مہمانوں کو تکلیف نہ اٹھانی پڑے، منتظمین یعنی ننھے منے نے اماں سے روپے لے لئے مگر ایک ہی ڈبہ ریزرو کروایا خود مردانہ میں ٹھنس ٹھنسا کر کام چلا لیا۔

آگرہ پہ اماں پریشان!

"ہے ہے کوئی نہیں آیا؟"

"ہاں اماں کوئی نہیں آیا، کئی بار پلیٹ فارم کے چکر لگائے کوئی نہیں دکھائی دیا۔"

"مگر کیوں؟ رقعوں کے تو جواب آ گئے تھے کہ سب آ رہے ہیں۔" بڑی معصومیت سے اماں نے پوچھا۔

کہ اتنے میں منے بھائی نے کچھ ننھے بھائی کے کان میں کہا اور دونوں سرپٹ بھاگے اور ڈبوں میں گم ہو گئے۔

بھینس والے بڑے ابا بار والے پلیٹ فارم پر کھڑے سے چاروں طرف نظریں دوڑا رہے تھے۔ ان کے ساتھ کوئی سامان نہ تھا۔ وہ شادی ٹلنے کے پوسٹ کارڈ سے کچھ مطمئن نہیں تھے کچھ دل میں شبہ تھا کہ ان سے چال چلی گئی ہے۔ برات کو دیکھ کر وہ جلدی سے واپس لوٹ گئے اماں نے انہیں نہیں دیکھا اور پورے وقت خاندان کے ان ذلیل لوگوں پر لعنت بھیجتی رہیں۔ جو شاید دینے لینے سے جان بچانے کی وجہ سے نہ آ سکے تھے۔

"شاید طبیعت خراب ہو گئی ہو گی اس لئے نہ آ سکے۔" منے بھائی بھولی صورت بنا کر اماں کو تسلی دینے لگے۔

"اے ہے سارے کنبے کو ہیضہ ہو گیا۔ طاعون سمیٹ لے گیا۔" اماں رو پڑیں۔ "میں نے کتنا لیا دیا، اور آج میرے اپنے مجھے دغا دے گئے۔ ایسی بے مروتی کی مجھے اپنوں سے امید نہ تھی۔ قسم خدا کی اب کسی کی صورت بھی دیکھ جاؤں تو سؤر ہی کھاؤں۔"

ہم لوگ بالکل فکر مند نہیں تھے کیونکہ نہایت بزرگ بڈھے بڑھیاں شادی میں بلائی گئی تھیں جو بات بات پہ طعنے دیتیں دوپٹہ سر پہ ڈھکنے کو کہتیں۔

"اے ہے شریف بیٹیاں یوں اکڑ کر مردوں کی طرح نہیں بیٹھتیں۔" اُف آگ لگ جاتی تھی ان کی جلی کٹی باتیں سن کر۔ بڑی بہنیں تو طرح دے جاتیں، چپکے چپکے بڑبڑاتیں۔ لیکن میں کمبخت بے انتہا منہ زور تھی۔ میں تڑاتڑ جواب دینے لگتی۔ اماں مارنے کی دھمکیاں دیتیں۔ جوتی وغیرہ بھی پھینک مارتیں مگر میں ہمیشہ اماں سے دور ہی بیٹھتی تھی اور وار خالی دے جاتی جوتی کسی بے خبر معصوم کی چاند پہ پڑتی اماں کا نشانہ بے حد خراب تھا۔

"اماں ان بڑھیوں، بڈھوں کی پرستش کرتی تھیں اور ہم لوگوں کی اس بدتمیزی کی بدولت انہیں بڑی شرمندگی اٹھانی پڑتی۔ ابا سے شکایت کرتیں۔ وہ ہمیں ڈانٹتے ایسے کہ اماں بھی سمجھ جاتیں کہ دراصل وہ ہمیں شہ دے رہے ہیں۔

"ہاں ہاں، میں خوب سمجھتی ہوں تمہی نے ان نامرادوں کو شتر بے مہار بنایا ہے۔"

"تم کہو تو ہم ان کی مرمت کر دیں۔" ابا دھمکی دیتے۔ اور اماں سہم جاتیں اور خود ہی ہماری صفائی پیش کرنے پر تل جاتیں۔ کیونکہ وہ جانتی تھیں ابا نے بچپن سے پہلوانی سیکھی تھی، بلکے سے بھی ہاتھ لگا دیتے تو کچومر نکل جاتا۔ اور جب وہ کسی بات پر غصہ ہو کر کسی کو مارنا شروع کرتے تھے تو، اُف میں بیان نہیں کر سکتی تھی کہ کتنی بے رحمی سے مارتے تھے۔ لڑکیوں پر انہوں نے کبھی ہاتھ نہیں اٹھایا صرف خاکسار کی ایک بار باریک بینت سے تواضع کی تھی۔ مگر منے بھائی نے پہلے ہی بینت کے بعد دوڑ کر مجھے

اپنے جسم کی آڑ میں لے لیا تھا۔ وہ بخار میں جل رہے تھے اور دو چار بینت ہی پڑے تھے کہ بے ہوش ہو کر گر پڑے ہیں ڈیڑھ عدد بینت کھا کر سرپٹ بھاگی اور ابا عظیم بھائی کی حالت دیکھ کر ڈر گئے اور مجھے بھول گئے۔ اس لئے جب کوئی بھیانک شرارت کسی سے سرزد ہو جاتی تو اماں چھپا جاتیں۔ یا اگر سامنے ہوتے تو اس سے پہلے کہ ابا کو طیش آئے وہ خود مارنے لگتیں۔ ابا کی مار کے آگے اماں کی مار پھولوں کی پھوار لگتی تھی۔

اس سفر میں سب سے بڑا المیہ میری جان پر بیت رہا تھا۔ مجھے پہلی بار برقع اوڑھنا پڑا تھا اور بتا نہیں سکتی کہ احساس ذلت نے مجھے کئی بار ریل کی پٹڑی پر کٹ جانے کی صلاح دی میں سخت کوفت میں مبتلا تھی۔ عظیم بھائی انہی دنوں "قرآن و پردہ" "حدیث و پردہ" لکھ کر کافی ہنگامے کھڑے کر چکے تھے۔ پردے کی مخالفت اور موافقت میں زور شور کی بحثیں چل رہی تھیں۔ بیگم عطیہ فیضی، زہرہ فیضی، بیگم ہمایوں مرزا، اور چند منچلی بیبیوں نے بمبئی میں کانفرنس کے اجلاس میں جہاں عورتوں کا آنا قطعی منع تھا۔ ہلڑ بول کر ایک طوفان طوفان کھڑا کر دیا تھا۔ حالانکہ وہ برقعے پہنے ہوئے تھیں۔ مگر پھر بھی مسلمانوں نے سخت ہتک محسوس کی تھی اور اگر یہ خواتین بارسوخ تعلیم یافتہ اور دولت مند طبقہ سے نہ ہوتیں تو اس کی مٹی پلید کر دی گئی ہوتی۔ ان خواتین نے نہ جانے کتنے کچے ذہنوں سے پردے کا تصور جلا کر راکھ کر دیا ہو گا۔ عظیم بھائی پردے کے سخت مخالف تھے۔ اپنی بیوی کو وہ برقع اوڑھنے سے منع کرتے تھے۔ مگر سارا گھر ان کی طرف ہو جاتا تو وہ چپ ہو جاتے۔

ایک دن انہوں نے اپنے دوست خواجہ محمد اسحاق کو اپنے کمرے لا کر بیوی کے سامنے کھڑا کر دیا۔

"بھابی جان آداب" اسحاق بھائی نے نیچی نظروں سے شرماتے ہوئے کہا۔ دلہن بھابی

چیخ مار کر سرپٹ بھاگیں اور اماں سے لپٹ کر دھاروں دھار رونے لگیں۔ ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ عظیم بھائی کی طلبی ابا کے دربار میں ہوئی۔ کیونکہ اماں اڑ گئیں کہ اگر اس نامراد آوارہ مزاج کی خبر نہ لی گئی تو وہ بھوک ہڑتال کر دیں گی۔

"کیوں کر بھئی کیا قصہ ہے؟" ابا نے عظیم بھائی کی طرف نظر ڈالے بغیر پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں سرکار" عظیم کھانستے ہوئے بولے۔ گذشتہ رات انہیں دمہ کا دورہ پڑ چکا تھا۔

"تم نے پھر سوئیٹر نہیں پہنا بیوقوف"

"سرکار ابھی اتارا ہے بہت میلا ہو گیا تھا"

"لو دیکھو لولا ڈلے کو پھر سر چڑھا رہے ہیں"

"ابا خاموش اخبار پڑھتے رہے"

"چولہے میں ڈالو موئے اخبار کو" اماں نے اخبار ہاتھ مار کر گرا دیا۔

"اوہ، بھئی بتاؤ نا یہ کیا بیہودگی مچا رہے ہو تم؟"

"کچھ بھی نہیں سرکار"

"کچھ بھی نہیں کے بچے"

"اماں میں کچھ بھی نہیں کا بچہ نہیں آپ دونوں کا۔۔۔"

"دیکھ رہے ہو" اماں روہانسی ہو گئیں"۔ اس سے پوچھو دلہن کو اسحاق کے سامنے لے آیا کیا؟"

"اماں آپ بھی تو اسحاق کے سامنے آتی ہیں"

"اے لو اور سنو، اسے وہ میرے سامنے کا بچہ ہے۔ مگر دلہن۔۔۔۔"

"میرے بھائی کی طرح ہے۔ آپ کی دلہن کا دیور ہے"

"بس بک بک نہ کرو بیٹا کہتی ہوں کچھ کہتے کیوں نہیں؟" اماں پھر ابا پر حملہ آور ہوئیں۔

"کیوں بھائی تم نے پردہ کیوں تڑوایا؟"

"کس کا؟"

"دلہن کا ہے"

"دلہن میری بیوی ہے اور مجھے حق حاصل ہے چاہے پردہ رکھواؤں یا تڑواؤں۔"

"ہمارے گھر میں یہ نہیں ہوگا۔ سمجھے؟" اماں براہِ راست لنگا میں سنبھال کر میدان میں آگئیں۔ ابا نے اطمینان کا سانس لیا۔

"تو میں کل ہی اپنے ایک دوست کے ہاں منتقل ہو جاؤں گا۔ ایک کمرہ خالی ہے ان کے پاس ہم میاں بیوی اور دونوں بچے۔"

"نزہت نہیں جائے گی۔" اماں نے اپنی پوتی نزہت کو ذرا سی تھی تب سے پالا تھا، اور وہ دادی کے ساتھ سوتی تھی۔ کبھی بھولے سے بھی ماں باپ کی طرف نہیں جاتی تھی وہ دادی کو اماں، ماں کو دادی کی نقل میں اور باپ کو بھائی صاحب کہتی تھی۔ اسے معلوم بھی نہیں تھا۔ وہ دادی کی نہیں دلہن کی بیٹی ہے ذرا بیمار سی مسکین بچی تھی۔ ہر دم اماں اور ابا سے لپٹی رہتی تھی۔ "میں جاؤں گا تو بچے بھی جائیں گے۔"

"ارے جا مر گھلے پڑا آیا بچوں کا سگا۔ پالا ہم نے اور حق تو جتانے بیٹھ گیا۔" سب جانتے تھے دلہن سپوڑیا سے بچے نہیں سنبھلے۔ چھوٹی بیٹی مدحت کو منجھلی باجی اپنے ساتھ لے جانے کا پروگرام بنا رہی تھی۔ شادی میں شرکت کر کے لڑکی کو دے لیں گی۔ دلہن بھابی پورے دنوں سے تھیں ایسی حالت میں الگ مکان میں کیسے گذر ہوگی۔ عظیم بھائی ایل ایل بی کر رہے تھے۔ اور ساتھ میں تالوں کے کارخانہ میں پینتالیس روپیہ ماہوار پر کلرکی بھی کر رہے تھے، اور پھر ان کی بیماری۔

اماں رونے لگیں ابا بے چین ہو گئے۔

"نہیں دلہن کا پردہ نہیں ٹوٹے گا۔ ہم اسے منع کر دیں گے کہ وہ تمہارے ساتھ

نہ رہے۔ اُسے الگ کمرہ دے دیا جائے گا۔"

"اگر وہ میرا حکم نہ مانے گی تو میں اسے طلاق دے دوں گا۔"

"کیا بک رہے ہو گدھے۔" ابا غرائے۔

"تو میں کل بچوں کو لے کر......"

"تو نکل جا یہاں سے دلہن اور بچے نہیں جائیں گے۔" اماں نے فیصلہ کیا۔

"بس کوئی نہیں جائے گا۔ کل ہی دمہ کا دورا پڑا اور قمیص پہنے گھوم رہا ہے۔"

اماں اپنی ہار پر بھنّاتی ایک دم اٹھ کر دندناتی چل دیں۔

اس کے بعد سنا دلہن کے میکے بھی اُڑتی اڑتی خبر پہنچی۔ دلہن بھابی باجی کے جلیٹھ کی بیٹی تھیں۔ اور وہی انھیں بھاوج بنا کر لائی تھیں۔ انہوں نے فوراً اس خبر کو جھٹلا دیا کہ کوئی پردہ نہیں ٹوٹا ہے۔ سب لوگوں کی اڑائی باتیں ہیں۔"

کیونکہ دلہن بھابی کے بھائیوں نے کہا تھا۔ اگر ہماری بہن بے پردہ کی گئی اور اسے سربازار نچایا گیا تو وہ بہن اور بہنوئی کی گردنیں اڑا دیں گے۔ عظیم بھائی اس ہنگامے سے ...دب گئے مجھے تھرڈ کلاس کے ڈبہ میں غصہ اور لاچاری سے بے حال دیکھ کر سمجھ ...لئے کہ یہ سب برقع کی وجہ سے ہوا۔ کیونکہ جب میں نے برقع اوڑھا تو میرے بدذات بھائیوں نے خوب قہقہے لگائے اور میں ان سے بھڑ گئی تو اماں نے انہیں کچھ نہ کہا میرے ہی دھول جڑ دی۔ بڑی ہتھ چھٹ تھیں میری اماں

انہوں نے میری کھڑکی کے پاس آکر چپکے چپکے مجھے سمجھانا شروع کیا اور میں سمجھ گئی۔ جودھپور کا اسٹیشن آنے لگا تو نوکروں کو بلا کر بستر بندھوائے جانے لگے۔ سب بستر ایک ہاتھی نما پلندے میں جمع کر کے اوپر سے رسّی کا جال باندھ دیا گیا۔ اس میں بڑی کفایت ہو جاتی ہے۔ دس بستروں کے دو بنا دیئے گئے۔ جاڑوں کا زمانہ تھا لحاف توشک بھی تھے۔ اگر الگ الگ بستر ہوتے تو قلیوں کو بہت پیسے بھرنا پڑتے۔

اب اسٹیشن آیا اور سب بُرقعے پہننے لگے تو میرے بُرقعے کی کیپ غائب یعنی کا کوٹ سارہ گیا تھا۔ جو میں نے نہایت فرمانبرداری سے پہن لیا تھا اور بڑی تندہی سے اوپر کا حصّہ ڈھونڈھ رہی تھی جب نہ ملا تو اور سب بھی میری مدد کرنے لگے۔

"شاید بڑے بستر میں بھولے سے بندھ گیا" میں نے دبی زبان سے کہا۔

"کیسی کمبخت" چاروں طرف سے دھموکے پڑنے لگے "تو نے جان بوجھ کر ٹھونسا ہوگا"

میں نے وہ گھونسے لڈّوؤں کی طرح نگل لئے۔ مجھے معلوم تھا آدھ گھنٹہ میں رسّی کا جال بندھا ہُوا بستر کھولنے کا سوال ہی نہیں اُٹھ سکتا۔ مجھے ایک چادر اڑھادی گئی۔ اور میں ایک جانباز فاتح کی طرح پلیٹ فارم پر اتر گئی۔ عظیم بھائی سے آنکھیں ملیں، وہ اتنی زور سے ہنسے کہ کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ میں نے بھی اپنی ہنسی مصنوعی کھانسی میں گھونٹ دی۔ چادر بار بار پھسل جاتی اور میرے اوپر گھونسوں اور چٹکیوں کی بوچھاڑ ہوتی۔

مگر فتح کا نشہ جس نے چکھا ہے وہی وہ مزے جی سکتا ہے جو میں اُس دن پلیٹ فارم پر کھلے منہ جی رہی تھی۔ جلد ہی لوگوں کو محسوس ہونے لگا کہ اس ہٹ دھرمی کی چنگاری کو عظیم بھائی نے ہوا دی ہے۔ بلکہ انہوں نے ہی ماچس لگائی تھی کیونکہ وہ پیغام جو بنا تار برق کی طرح میری اور ان کی نگاہوں کے درمیان چل رہا تھا جلد ہی واضح ہوگیا۔

اسٹیشن پر ماموں مع دوستوں اور رشتہ داروں کے ہمارے سوالت کو موجود تھے۔ ہمارے تایا ابراہیم بیگ چغتائی آفت بھول ہوئے۔ میرزا لگانا بھول گئے بار ہا بڑے ابا ہمیں اسی لفظ میرزا اور چغتائی کی عظمت اور شان پر مدلّل لکچر دے چکے تھے۔ ہمیں کسی حالت میں بھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ ہم چنگیز اعظم کی اولاد میں سے ہیں۔ اور چغتائی خان چنگیز کا بیٹا تھا۔ اور میرزا۔ یہاں دو نکتے بڑی اہمیت رکھتے ہیں خالی مرزا سے بات نہیں بنتی، یہ لفظ میرزادہ خطاب تھا جو میرے جدِ امجد نے کشتوں کے پشتے لگا کر اور خون کی ندیاں بہا کر حاصل کیا تھا۔ گائے بکری کا ذ

نہیں یہاں انسانی کھوپڑیوں کے میناروں اور گھوڑوں کے سُموں کا ذکر خیر ہے جو انسان کے خون میں ڈوبے تھے۔

یقیناً یہ میرے ننہال کے شیخوں کا پھیکا پتلا پانی خون ہے جو فخر سے کھول اٹھنے کے بجائے کم ہمت اور ڈرپوک جوہے کی رطوبت کی طرح میری آنکھوں میں جھلک آتا ہے۔

میری بڑی مصیبت تھی ننہال کی طرف سے میرا ناطہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے جا ملتا تھا۔ اور ددھیال کی طرف سے انسانی کھوپڑیوں کے میناروں اور خون کی ندیوں سے یہ لیا گھپلا کر دیا تھا۔ میرے ابا نے شیخوں میں شادی کرکے ہاں تو میرے بڑے ابا اور ہماری اماں کے ماموں ظہور نانا پہلے سے جودھپور پہنچ گئے تھے وہ ماموں کے بلاوے پر گئے تھے۔ اس لئے یہاں سے بھیجے ہوئے پوسٹ کارڈوں کے بھیدے ہی نہیں پھٹے تھے

اِن دونوں کو دیکھ کر عظیم بھائی اور نسیم بھائی پر اوس پڑگئی۔ یہ بزرگ خاندان کے لیں کیا تیا ہیں کیا مانے جاتے تھے۔ اماں اور ابا دونوں ان سے انتہا مرعوب تھے اور وہ رعب ورثہ میں ہمیں تھمانے پر مصر تھے۔

ان دونوں بزرگوں کے پرنور چہرے اور لباس سے اُن کی آبائی شان نمایاں تھی ظہور نانا نہایت سفید براق کپڑوں اور سفید مقدس داڑھی کی وجہ سے کوئی پیر مرشد لگتے تھے۔ میں نے کبھی انہیں ملگجے شکن دار کپڑوں میں نہیں دیکھا۔ سفید شرعی ٹخنوں سے اونچا پاجامہ سفید انگرکھا اور حکیموں جیسی ٹوپی۔ دور ہی سے ان میں سے بھینی بھینی کافور کی سی خوشبو آیا کرتی تھی انہیں دیکھ کر نہ جانے کیوں ہم کمبختوں کو قبرستان یاد آجاتے تھے قبرستان ہی آخر کا منزل ہے انسان کی پُرسکون سرسبز پیڑوں کی چھاؤں میں بے

خاموش قبرستان!

بڑے ابا اکثر کچھ ان جانے قسم کے امراض میں مبتلا رہتے تھے۔ اس لئے بہت کم، اکثر ہفتوں نہیں نہا پاتے تھے۔ جس دن ان کے نہانے کو حجام آتا تھا۔ اور گرمی سردی ہر موسم میں بڑے تپیلے میں پانی گرم ہوتا تھا تو وہ بے انتہا فکرمند بلکہ خوفزدہ سے ہو جاتے تھے۔ بار بار سب کو یاد دلاتے ہے۔

"آج مجھے غسل کرنا ہے!" جیسے لام پر جانا ہو۔

غسل کے بعد وہ اتنے خوبصورت اور گورے نکلتے تھے کہ ہمیں حیرت ہوتی تھی، کہ بڑے ابا تو بالکل انگریز ہیں۔ پھر چند ہفتوں کے بعد وہ پھر بھورے پڑھ جاتے تھے۔ مغلوں کے بارے میں ان کے خیالات بہت کچھ ہٹلر کے جرمن قوم کی برتری کے فلسفہ سے ملتے تھے۔ مغل سے برتر بہادر انصاف پسند عالم منکسر المزاج دریادل وغیرہ وغیرہ۔ اور کوئی قوم دنیا کے پردے پر نہیں۔ اور بڑے ابا نہایت ہی مکمل اور کھرے مغل تھے۔ کیونکہ شہنشاہ تیمور کی طرح ان کے پیر میں بھی پیدائشی لنگ تھا۔

بڑے ابا جس دن نہا کر سیاہ چوگوشیہ ٹوپی اور نسواری رنگ کا چوغہ پہنتے تھے تو بالکل بہادر شاہ لگتے تھے۔ سنتے ہیں جوانی میں وہ اتنے حسین اور طرحدار تھے کہ لوگ انہیں گذرتا دیکھ کر ٹھٹک جاتے اور جہاں کے تہاں کھڑے رہ جاتے تھے۔

چار بجے بری جانا تھی، پچیس[۲۵] تیس[۳۰] خوان مع زرنگار خوان پوشوں کے ماموں نے دوباری توشہ خانہ سے نکلوا کر بھیج دیئے۔ اماں نے پانچ من میوہ، مصری ان تھالوں میں سجوائی، باداموں، پستوں، کشمشوں اور ثابت کھوپرے کے تھال۔ ایک بری کا جوڑا، ایک سہاگ کا جوڑا، زیور اماں نے آپا کی حفاظت

میں دے دیا۔

بری باجے گاجے سے گئی۔

ہم لوگ بھی پہنچے۔ اماں دلہن کی اکلوتی سگی پھوپی بھی تو تھیں۔ لہٰذا دونوں ماموؤں نے انہیں بھات دیا۔ بہنوں کو دوپٹے، بہنویوں کو صافے جو بہنوں نے پھاڑ کر آخر میں دوپٹے بنا ڈالے اور کمیوں کے جوڑے ابا اماں کو جوڑا اماں کو سونے کی چوڑیاں۔

"اور بری میں بھی تو میرا حصہ ہے۔" اماں نے کہا۔

ایک تھالی میں دس بارہ بادام چھوارے ایک ناریل اور تھوڑے سے پستے اور کشمش ممانی جان نے لا کر رکھ دی۔

"اوئی، بس میں اکلوتی پھوپی اور یہ موا ٹھینگا میرا حصہ میں تو پورا تھال لوں گی۔" اماں اڑ گئیں۔

ممانی جان ماموں کی دوسری بیوی تھیں، پہلی بیوی شوکت آپا۔ یعنی دلہن کی ماں تو انہیں ذرا سا چھوڑ کر مر گئی تھیں۔

"آپا دو، دو دانے شگن کے سب ہی کو بانٹنے ہو رہے۔"

"ماشاء اللہ پانچ من بری لائی ہوں، دو دو دانے کی بھی اچھی کہی۔"

"پانچ من؟"

"ہاں ہاں تمہارے رمجو میاں ہی لائے، اور میں نے اپنے ہاتھوں سے بیس[۲۰] تھال بھرے۔"

"ایک من شکر، ایک من لڈو، اور تین من میوہ، مزدورنیوں کی گردنیں ٹوٹی جا رہی تھیں۔"

"آپا کمرے میں جا کر دیکھ لو بری۔"

کمروں میں تھالوں پر سے خوان پوش اٹھائے تو دس بارہ ناریل لڑھک رہے تھے دو چار سیر سوکھا میوہ اور بیس پچیس لڈو۔

" ہے ہے لوگو یہ کیا اندھیر ہے۔ پوری پانچ من بری لائی اور ۔۔۔" اور خوب کائیں کائیں ہوئی۔ اماں نے جان لیا کہ ممانی جان نے ساری بری اپنے میکے گلاب ساگر پار کر دی۔ بڑی تیمیاں پیدا ہوئیں۔ ممانی جان بے انتہا روزے نماز کی پابند صبح کے گھنٹے تلاوت قرآن اور آٹھ وقت کی نماز پڑھتی تھیں۔ نہایت نازک بدن حسین بے انتہا لمبے سیاہ بال صورت کچھ حضرت مریم سے ملتی جلتی۔ کونے میں بیٹھی خاموش آنسو بہا رہی تھیں۔ اماں نے سارے سمدھیانے کو بے نقط سنائیں۔ نہ جانے اتنی سیدھی سادھی اماں اپنے سے زیادہ بھولی عورت کو دیکھتیں تو ان کی رگ بھڑک اٹھتی اور بے حد غضبناک ہو جاتیں۔ ماموں انہیں بے انتہا چاہتے تھے۔ جان چھڑکتے تھے انہیں جب پتہ چلا کہ بیگم نے بری میکہ پار کر دی تو تلواریں سونت لیں جب سمدھنیں رخصت ہو گئیں تو انہوں نے ان کی خبر لی۔ ان کی میکہ والیاں پہلے ہی سٹک لی تھیں انہوں نے اپنی بیوی اور سسرال کی دھجیاں بکھیر دیں۔ ممانی جان خاموش لاالٹہ، جو انے رات بھر تلاوت قرآن کرتی رہیں۔ ماموں زہر اگلتے رہے اور وہ غٹا غٹ پیتی رہیں چور ڈائین نہ جانے کیا کیا کہہ ڈالا۔ اُف نہ کی۔

" ڈھٹائی کی انتہا ہے۔ نمازوں اور تلاوت سے گناہوں کی سیاہی دھونے سے کیا فائدہ، تم نے میری بہن کا دل دکھایا۔ میں کبھی تمہیں معاف نہیں کروں گا۔ اور وہ نیچے جا کر سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

اب دوسرے دن برات چڑھی۔ ماموں نے اپنا پورا رسوخ استعمال کر کے مہاراجہ کے خاص ہاتھی اور کوتل گھوڑے، چاندی سونے کے زیور سے جھم جھماتے سب سفید ایک قد کے عربی گھوڑے اور دس سیر سونے کا جھومر اور بیس سیر کی پازیبیں پہنے زردوزی

کام سے مرصع جھول پہنے ہاتھی۔ تخت رواں یعنی ایک تخت پر ایک حسین اپسرا رقص کرتی ہوئی۔ قدم قدم پر برات رُک جاتی، تخت زمین پر رکھ دیا جاتا اور رقاصہ اپنے فن کا مظاہرہ کرتی۔

دُلہا کے گھوڑے کا تو جواب ہی نہ تھا ـــــ بس جیسے سونے کا ڈلا دونوں طرف دو مورچھل بردار پیچھے چھتر بردار۔

مگر دُلہا دولتیاں جھاڑ رہا تھا۔ کوئی کمخواب کی اچکن فٹ نہ بیٹھی پہن کر سینہ پھلاتے کندھے جھٹکتے اور جیڑے سے پیٹھ پر سے اچکن پھٹ جاتی۔ اتفاق سے کئی اچکن بھجوا دی تھیں۔ ماموں نے توشہ خانہ سے اور کوئی فٹ نہ بیٹھی۔ آخر میں یونیورسٹی کے یونیفارم کی اپنی کالی اچکن پہن کر دولہا بنے۔ بنارسی سیلے کا صافہ بندھتا ہی نہیں بار بار پھسل کر گردن میں۔ خیر ایک سوتی گلابی صافہ باندھ لیا۔ سہرے پر تو پوری طرح بدکے اور ہار کی طرح گلے میں ڈال لیا۔

اِدھر عظیم بھائی کی بڑی مصیبت دولہا کے اچکنیں تنگ اور ان کے اتنی ڈھیلی کے دو آدمی سما جائیں۔ خیر انہوں نے دو سوئیٹر پہن کے ایک اچکن جگمگاتی ہوئی ڈاٹ لی اور بڑی کوششوں سے دولہا کار دکیا۔ واسلہ پنوں سے چپکا کر پہن لیا۔ آئینہ میں اپنی شکل دیکھ کر دوسروں کی ہنسی کا راز سمجھ کر خود بھی ہنسے۔

بارات کو سارے شہر میں گشت لگا کر دُلہن کے دوارے پہنچنا تھا۔ نسیم بھائی ہایت مشتاق تھے۔ چار قدم چلے تھے کہ گھوڑا بدکنے لگا۔ جلوسوں کا عادی مسکین گھوڑا تبر عزائیں کو الف ہو گیا اور کبھی آگے بڑھتا کبھی دُلتیاں جھاڑتا۔ ساتھ میں سات، م کے بلینڈ تھے وہ باری باری اپنا فن دکھا رہے تھے۔ مگر گھوڑا بارات کا پٹرا کئے ے رہا تھا۔ سمدھنوں یعنی ہم لوگوں کو گھوڑے کے بگڑنے کی اطلاع مل رہی تھی۔ ہم سب سے پیچھے موٹروں میں تھے۔

"یہ ننھے بدمعاشی کر رہا ہے" بڑی آپا بڑبڑائیں۔

"اے نہیں ایسا بھی کیا، کوئی دیوانہ ہے کہ بارات کو لوٹ دے گا" اماں نے کہا

"ارے یہ سب منے فساد کی جڑ ہے اس نے سکھا دیا ہوگا دیکھو سب پریشان ہیں۔ منے کھانس رہا ہے" یعنی ہنسنے کے ساتھ انہیں ہمیشہ کھانسی آجاتی تھی۔

اور پھر اندھیر ہو گیا۔ دولہا گرتے گرتے سنبھلا اور گھوڑا تیزی کی طرح بارات چھوڑ یہ جا وہ جا اور پھل والے ہکا بکا، چھتر بردار مجسم حیرت۔

خیر بغیر دولہا کے بارات اپنی چیونٹی کی چال چلتی رہی دور سے زیادہ پتہ بھی نہیں چل رہا تھا کہ مورچھل اور چھتر خلا میں تنے ہوئے ہیں دولہا نہیں ہے۔ ادھر ماموں شہر کے رؤسا اور چھٹ بھیوں یعنی چھوٹے موٹے راجاؤں کے ساتھ جگمگاتا گیٹ پر بار پھول لئے منتظر کھڑے تھے کہ دولہا حیران پریشان ایک گھوڑے پر سوار عین دروازے کے سامنے ساکت ہو گیا۔ دولہا جست مار کر اترا اور ہانپتا کانپتا سیڑھیوں پر لڑکھڑاتے قدموں سے چڑھنے لگا۔

"ماموں۔ ماموں، بس اللہ نے بچا لیا۔ ورنہ یہ شیطان کا بچہ آج میرا کچومر نکال دیتا۔ نہ پوچھئے راستے بھر کیا ناکوں چنے چبوائے ہیں"

"بارات"! سواگت کرنے والوں نے پوچھا۔

"آ رہی ہے۔ پیچھے" دولہا نے سیڑھیوں کا سہارا لے کر فرشی پسینہ پونچھا۔

"ماموں ایسے ناسمجھ نہیں تھے۔ وہ ننھے بھائی کی سواری کے کرتب بارہا دیکھ چکے تھے۔ ایک دم اچھی خاصی چال چلتے چلتے وہ ایسا گھوڑے کو اچھالتے کداتے کہ چک میں سے دیکھتے ہوئے اماں چیخیں مارنے لگتی تھیں۔

"ارے بیگم ننھے کرتب دکھا رہا ہے۔ وہ گھوڑے پر سوار ہے اس پر گھوڑا سوار نہیں"

مگر اماں کہتیں خدا کے لئے روکو۔ میرا دم نکلا جاتا ہے۔

"پانچ روپے" ننھے بھائی گھوڑا روکنے کی قیمت لگاتے۔

"چل سوا ایک روپیہ سے زیادہ نہیں دوں گی"

"اور کبھی دو کبھی تین پر سودا ہو جاتا اور ننھے بھائی چک کے پاس آتے"

"لاؤ اماں"

"پہلے نیچے اتر"

"نہیں، پہلے روپے دو نہیں تو اندر چڑھا لاؤں گا گھوڑا"

"اے ہے کمینے۔ کتے۔ سور" اماں گالیاں دیتیں اور روپیہ چک سے باہر پھینک دیتیں اور ننھے بھائی ایک بار گھوڑے کو اچھالتے ایسے اترتے جیسے گھوڑے نے پٹخ دیا۔ اماں چیخ مارتیں وہ لپک کر روپے چھین کر بھاگ جاتے۔

"ہاں ہاں وہ مجھے دہلائے ڈرائے تم ہنسو۔ اس کی پیٹھ ٹھونکو" اماں ابا کو مسکراتا دیکھ کر کہتیں، اور ابا چور سے رہ جاتے۔

"نکاح کے وقت ظاہر ہے۔ ظہور نانا اور بڑے ابا کھنکار کر قاضی کے قریب کھسک آئے ننھے بھائی نے دونوں کو بڑے پیار سے دیکھا۔

"ارے آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں۔ حدیث میں لکھا ہے داڑھی والے نکاح میں گواہ یا وکیل نہیں بن سکتے"

دونوں بزرگ سکتہ میں رہ گئے۔ ابھی چند منٹ پہلے بڑی عالمانہ بحث ہو رہی تھی کہ آج کل کے کلین شیو نوجوان کی نماز واجب ہوتی ہے یا مکروہ!

فیصلہ ہوا تھا کہ مکروہ ضرور ہوتی ہوگی۔

لہٰذا دولہا اڑ گیا کہ گواہ داڑھی کے ساتھ تو نہیں بن سکتا۔ مگر۔۔۔"

پوچھیے کیا حالت ہوئی، نکاح تو ہونا ہی تھا۔ چھوٹے ماموں اور عظیم بھائی

گواہ اور وکیل بنے۔ خیر سے نکاح ہوا۔

اماں بے بسی سے روتی بسورتی دُلہن کو لے کر آگئیں۔ علی گڑھ پہنچے تو ہم بھیّا نسیم اور عظیم نے چند صندوق ابّا کے سامنے رکھ دیئے۔

"ان میں کیا ہے ہم جہیز نہیں دیکھنا چاہیئے۔ یہ جاہلانہ رسم ہے باپ ماں نے جو کچھ بیٹی داماد کو دیا۔ اس سے ہمیں کیا واسطہ۔"

"یہ جہیز نہیں ہے سرکار۔"

"پھر کیا ہے؟"

"مالِ غنیمت!" یہ کہہ کر صندوق کھولے جو پستہ بادام مصری کے کوزوں اور شکر کی تھیلیوں سے بھرے ہوئے تھے۔

یہ پانچ من کی بَری اماں نے چڑھائی تھی۔ جب مزدورنیاں نیچے لے کر اتریں تب ہمیں پتہ چلا۔ ہم نے سب نکال کر ذرا ذرا سا ملا کر آدھا من مال چھوڑ دیا۔"

امّاں اس وقت باورچی خانہ میں تھیں۔ انہوں نے ابا کی آنکھوں میں جگمگاتے جگنو نہیں دیکھے۔

"بیگم نے دیکھ لیا تو۔"

"نہیں ہم اسے آپ کے پچھلے کمرے میں چھپا کر تالا ڈالیں گے صندوق بند کر دیئے گئے۔

"ہوں، تمہارے ولیمہ میں کام آجائے گا۔ یہ میوہ اور شکر۔"

"مگر گاجر کا حلوہ بنے پہلے تھوڑا۔"

اور جب ننھے بھائی نے کہا۔

"اماں یہ میوہ شکر میرے دوست فیاض خاں نے بھیجا ہے کہ گاجر کا حلوہ جب آپ بناتی ہیں ویسا کوئی باورچی بھی نہیں بناتا۔

حلوہ بنا، نواب صاحب کو بھی بھیجا گیا۔ دوستوں نے اُڑایا۔ کافی دن بعد امّاں

کو حقیقت معلوم ہوئی تو سر پیٹ لیا۔

"ہائے میرے پروردگار میں نے اپنی فرشتہ صفت بھاوج پر دوش لگایا یا خدا میرا قصور بخش دے۔ ارے لوگو میں کیا کروں، اس سے تو میں کلو ہی بانجھ ہوتی۔ ایسی اولاد سے تو۔۔۔۔"

ننھے بھائی نے ہاتھ جوڑ کر سر ان کی گود میں رکھ دیا۔

"لو اماں جی بھر کے مار لو۔"

مگر اماں نے رکھائی سے اپنے پیر سمیٹ لئے اور منہ موڑ لیا۔

ننھے بھائی کا مُنہ اُتر گیا۔

"مِنتے اماں سچ مچ خفا ہو گئیں۔" اماں مار لیتیں تو بوجھ اُتر جاتا۔ مُنتے بھی فکرمند ہو گئے۔

شادی ننھے بھائی نے اس شرط پر کی تھی کہ ایل ایل بی تک سارا تعلیم کا بوجھ سرکار کی طرف اور روٹی کپڑے کے علاوہ تیس روپیہ میاں بیوی کا جیب خرچ۔

"بس اَب چھ مہینے جیب خرچ نہیں ملے گا تمھے۔"

"کیوں؟"

"اس بدمعاشی کی سزا میں۔"

"اے ہوش میں، پڑھنے والا لڑکا۔۔۔۔ اور پھر نئی دلہن۔ میرے جیتے جی یہ ناانصافی نہ ہوگی۔"

"ماں بھی عجیب گورکھ دھندہ ہوتی ہے۔" ابا سوچنے لگے۔ "نہ اُس کی نفرت کا مہر و سر نہ محبت کا۔"

ننھے کلاس کے ڈھیر میں جتنا مشکل چڑھنا ہے اس سے زیادہ مشکل اترنا ہے۔

آگرہ کے اسٹیشن پر تل دھرنے کو جگہ نہ تھی اوپر سے سودے والے الا بلا آنکھوں کے سامنے نچا رہے تھے جھانج۔ سجائی گڑیاں، ڈگر ڈگر تار کی گردن کے جھلوں پر ملتا بڈھا، گجریاں، پاپڑ، تل کے لڈو، تاج محل کھریا کے بنے، اور اناپ شناپ پھر پیچھے سے باہر نکلنے والے ڈھکیلتے ہیں اور سامنے سے بڑے بڑے گھٹر، گنڈوں کے بنڈل اُسے کیا کہا جائے جو بہت سے ٹیڑھے میڑھے گتے موتیوں کے رسی سے باندھ کر ریل کے ڈبہ میں مسافر داخل ہونے سے پہلے ٹھونستا ہے خود دکھائی بھی نہیں دیتا۔ ایک ملبے سے بانس ہیں یا شاید دو بانسوں میں صراحیوں کی ٹکٹکی پھر مہکتی عورتیں پگڑ باندھے مرد اور چُوتے ہوئے بچے۔ یا اللہ !

اوپر سے شوکت آپا کو پورے دن، زچگی کے ارادے سے آگرے اپنی نانی کے ہاں جا رہی تھیں۔ میری بھی شامت آئی تھی۔ اس کے لبعد سوچا ذرا چار دن کے لئے آگرہ ہو آؤں۔ شوکت آپا بڑی لاڈلی صورت بنا کر مصر ہو رہی تھیں۔ اب مجھے پتہ چلا کہ اتنے زور شور سے اصرار کیوں ہو رہا تھا۔ نعیم ان کا ڈھائی برس کا لحیم شحیم بچہ ڈیل ڈول میں ددھیال پر گیا تھا۔ اسے اٹھانا بس جیسے تڑپتے لاتیں چلاتے بم کے گولے کو اٹھانا تھا۔ فرق اتنا تھا کہ وہ نہیں پھٹے گا۔ مگر اٹھانے والا خود ایک دھماکے سے اڑ جائے گا۔ ان محترم کی عادت تھی کہ اپنے وزن کی جانچ پڑتال سے قطعی نابلد سوتے ہوئے انسان پر اچانک دھم سے کودنے کے بے انتہا شوقین۔ اس کے علاوہ گھونسے چلانے اور کاٹنے سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ خیر مجھے کاٹنے کی عادت انہیں چھوڑنا پڑی کیوں میں نے جسم کے مختلف حصوں پر پنیل گننے کے بعد سیلف ڈیفنس میں ان کے منہ میں کونین کے پاؤڈر کی ایک چٹکی جھونک دی۔ بس اس کے بعد انہوں نے آج تک مجھے کاٹنے کی پھر کبھی کوشش نہیں کی۔

خیر صاحب صحیح سلامت اتر ہی لئے۔ میرے پاس تو بس ایک اٹیچی تھی مگر

شوکت آپا کئی ماہ کا پروگرام بنا کر آئی تھیں۔

"مجھے مائی تھان اتار دینا" تانگہ کھسکا تو وہ بولیں۔

"اتار دینا کیا مطلب ؟" میں نے پوچھا۔

"بس اتار دینا مطلب اتار دینا"

"اور میں کہاں اتروں گی ؟"

"میں کیا جانوں ؟"

"پنجہ شاہی نہیں چلو گی ؟"

"اے میں کوئی دیوانی ہوں جو اس وقت جاؤں گی۔ صبح جا کے گھر صاف کرنا ہے لیاڑ بھرا ہوا ہے کمروں میں۔ اور منوں خاک الگ ہیں تو دو تین دن لبعد جاؤں گی

تو میں جاؤں اس کباڑ خانے میں ؟

"نہ جاؤ"

"تو پھر ؟"

"پھر کیا ؟"

"شوکت آپا میں بھی پھر کل ہی پنجہ شاہی جاؤں گی۔ یا دو تین دن بعد"

"آج کہاں رہو گی ؟"

"تمہارے ساتھ"

"دیوانی ہوئی ہو ؟"

"کیوں ؟"

"میں تو اماں کے ہاں جا رہی ہوں" اماں وہ اپنی نانی کو کہتی تھیں جو بدقسمتی سے میری اکلوتی پھوپی بادشاہی خانم عرف بچھو پھوپی تھیں، جنہیں بجائے زیر لگانے کے لوگ زبر لگا کر پکارتے تھے۔ ان کی پیٹھ کے پیچھے انہیں میں نے اکثر حرف

بھائی کے کوٹھے کی کھڑکی سے جو ہمارے صحن میں کھلتی تھی. نہایت بلند و بالا آوازیں میرے پورے خاندان کو کوستے اور گالیاں دیتے ہی دیکھا تھا۔ ان کی میرے ابا سے بے حد مخلصانہ قسم کی جنگ میری پیدائش سے بہت پہلے سے چھڑی ہوئی تھی۔

بڑی باقاعدگی سے پھوپی اماں رحمٰن بھائی کے ہاں کھڑکی میں بیٹھ جاتیں اور گولہ باری شروع ہو جاتی۔ اماں اور ابا مع سمجھدار افراد کے فوراً تہہ خانوں میں یعنی برآمدے کی آڑ میں چھپ جاتے۔ ہم چند چھوٹے بچے کھڑکی کے نیچے کھڑے منہ اٹھائے حیرت سے انہیں دیکھا کرتے۔ نہ وہ کبھی ہمارے ہاں آئیں اور نہ کبھی ہم گئے۔ صرف ابا میاں عید بقرعید کو پابندی سے ماں جائی بہن سے عید ملنے جاتے تھے۔ ساتھ صرف جوان لڑکوں کو لے جاتے تھے جو عید کی نماز پڑھنے ساتھ جاتے تھے۔

یہ عجیب لڑائی تھی۔ جیسے عام جنگ میں کرسمس پر جنگ بندی لاگو ہو جاتی ہے اسی طرح عید کے دن بھی اعلان صلح ہو جاتا اور ابا حزر در جاتے۔ پھوپی اماں اندر کپڑے پہن ہو جاتیں، ابا صحن میں بیٹھ جاتے اور دونوں طرف سے چلے کٹے جملوں اور طعنوں کا تبادلہ ہونے لگتا۔ پندرہ بیس منٹ تک دھواں دھار گولہ باری ہوتی رہتی، پھوپی اماں کوستیں اور روتیں ابا میاں چٹکیاں بھرتے اور قہقہے لگاتے۔

بچپن میں تفصیل سن کر ذرا بھی تعجب نہیں ہوتا تھا کہ پھر ابا جاتے کیوں ہیں؟ کیونکہ اماں کہتی تھیں پھوپی اماں کی گالیاں کوسنے ہمارے خاندان کو بے طرح راس آتے ہیں ان کے کوسنے کی ہی برکت تھی کہ اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ ایک بچہ تک نہ مرا۔ ادھر پھوپی کے تیرہ چودہ کچے پکے بچوں میں بس حشمت خانم جنہیں سب خانم صاحب کہتے تھے زندہ تھیں، ان کی بڑی بہن مسرت خانم یعنی میرے بڑے ماموں ظفر حسین کی بیوی کا انتقال جب ہی ہو گیا تھا جب شوکت آپا سال دو سال کی ہوں گی۔

" ہے نامراد میت پیٹا ظفر حسین میری بچی کو کھا گیا " پھوپی اماں رحمٰن بھائی کی کھڑکی میں بیٹھ کر دھرانا کبھی نہیں بھولتی تھیں۔

" ظفر ماموں مسرت ممانی کو کیوں کھا گئے ؟" میں نے باری باری سب بزرگوں سے پوچھا، مگر ہمارے ہاں بزرگ بچوں کے سوال کا جواب کب دیتے تھے۔

" اے بس غارت ہو، جان نہ کھاؤ " ساتھ میں اگر ہاتھ لگ گئے تو ایک آدھ دھموکہ۔

اور میں جو عجیب اور بھیانک خواب دیکھ کر راتوں کو چیخنے چلانے کے مرض میں بچپن سے مبتلا رہی ہوں بری طرح سہم جاتی تھی۔

بڑے ماموں بے حد جامہ زیب گورے چٹے اور وجیہہ تھے۔ سونے کے رنگ کے بہت گھنے اور گھونگریالے بال، بڑی بڑی شربتی آنکھیں، ہموار موتیوں جیسے دانت ہم سب کے لئے مٹھائیاں اور کھلونے لاتے تھے، بے حد لاڈ کرتے تھے۔ وہ خود جودھپور میں رہتے تھے ان کے ساتھ ان کے بڑے بیٹے مظہر حسین رہتے تھے۔ ان سے چھوٹے اظہر حسین جو شوکت آپا سے دو ڈھائی سال بڑے ہوں گے۔

ہمارے ہاں بچپن سے رہتے تھے اور شوکت آپا بھی پھوپی کی طرح تھیں تو ہمارے ہاں ہی رہتی تھیں۔ سال میں ایک دو بار ماموں اور مظہر بھائی آیا کرتے تھے اور ان کی آمد پر گھر میں خوب رونق رہتی، دعوتیں ہوتیں، اماں انہیں بے انتہا چاہتی تھیں۔ چھوٹے ماموں فرحت حسین سے بھی زیادہ۔

ٹھیک ہی کہتے ہوں گے سب کہ میں کچھ دیوانی سی تھی۔ جب ماموں قہقہہ مار کر ہنستے اور ان کے سفید دانت چمک اٹھتے تو میرا تخیل مجھے لے اڑتا۔ میرا چھوٹا بھائی بھی میرا ہم خیال تھا۔ ہم دونوں اکیلے میں ماموں کے تیز دانتوں پر تبصرہ کرتے، کیسے

ممانی کو کھایا ہوگا۔ پہلے انگلیاں چبائی ہوں گی۔ ہڈیاں تھوکتے گئے ہوں گے۔ کیا انسان کی ہڈیوں میں گودا ہوتا ہے؟ چیونپرا ظالم تھا۔ کافی چھوٹا تھا۔ جب ہی دوپہر کو ڈلیا کی ٹھٹکی لگا کر چڑیا پکڑتا۔ اس کی گردن مروڑ کر توڑتے وقت اللہ اکبر ضرور کہتا۔ کیونکہ ابا میاں کہتے تھے۔ شکار پر گولی چلاتے وقت اللہ اکبر کہہ لینا چاہیئے تاکہ ہرن ذبح کرنے سے پہلے دم توڑ دے تب بھی حلال رہے اللہ اکبر کی برکت جیسے چھری ہیں دبے گولی میں، شکار کو تو مرنے سے غرض۔ چڑیا کو نارنگی کی طرح چھیل کر کچی چبا جاتا تھا

میں نہایت پھُس پھُسی تھی چونکہ میں لڑکی تھی اس لئے مجھے اُبکائیاں آنے لگی تھیں۔

چیونپرا تفصیل سے ماموں کے دانتوں کی کارگزاریوں پر تبصرہ کرتا۔ اور مجھے اُبکائیاں آنے لگتیں۔ نہ جانے کب مجھے معلوم ہوا کہ وہ دق میں مری تھیں۔ ماموں نے کھایا نہیں تھا۔ پھوپی اماں شاعرانہ تشبیہیں استعمال کرنے کی عادی تھیں۔

راستے بھر میں اور شوکت آپا لرزتے رہے وہ کہتی تھیں اگر میں نے پھوپی اماں کے گھر میں قدم بھی رکھا تو قیامت آجائے گی۔ میں منّی بچی قیامت دیکھنے سے بھلا کیونکر باز آسکتی تھی۔

"اور جو انہوں نے نکال دیا"

"کیسے نکالیں گی۔ دھکّے دے کر؟ میں تمہاری طرح سٹھیائی نہیں، بیگم میں بھی منلانی ہوں"

"تم اماں پر ہاتھ اٹھاؤ گی؟" شوکت آپا روپڑیں۔ مجھے ترس آگیا۔ نہیں

"نہیں نہیں، تم ڈرو نہیں۔ میں نے کبھی پھوپی اماں کو پاس سے نہیں دیکھا۔ دُور سے تو ابا میاں جیسی لگتی ہیں۔ اور اب تو انہیں دیکھے پندرہ سولہ برس ہوگئے۔ کچھ دھندلی سی یاد ہیں۔ اگر وہ مجھے دھکّے بھی دیں گی تو صورت تو دیکھ لوں گی۔ بس پھر میں واپس اسٹیشن چلی جاؤں گی اور پہلی گاڑی سے علی گڑھ۔

"[illegible] مجھے بہت ڈر لگتا ہے کہیں خفا ہو کر نکال دیا تو؟"

"[illegible] واپس پلٹ چلنا"

[illegible] آپا کی زچگی میں کچھ پھندا پڑ رہا تھا۔ ڈر تھا کہ بچہ ضائع نہ ہو جائے۔ اسی [illegible] وہ اماں کے پاس آئی تھیں۔ اگر انہوں نے نکال دیا تو پھر کیا ہوگا۔ میں نے انہیں [illegible] پھر ہم حکیموں والی گلی میں مشرف خالہ یا رفاقت خالہ کے ہاں چلے جائیں گے۔ [illegible] پھر تو اماں ساری عمر میری صورت نہیں دیکھیں گی۔ شوکت آپا کی آنکھیں [illegible] بڑی ہیں، اس لئے آنسوؤں کے سرّارے چھوٹنے لگتے ہیں، اتنے میں گھر [illegible] آپا میری خوشامد کرتی رہیں مگر میں تانگے سے اتر کے اندر داخل ہو گئی"

[illegible] سامنے برآمدے میں کھڑی شاید طوطے کو امرود کی پھانک سلاخوں میں سے [illegible] آہٹ سُن کر انہوں نے پلٹ کر دیکھا۔

"[illegible] شوکت؟ آگئی بچی" انہوں نے بے توجہی سے کہا۔

[illegible] آپا تانگے میں بیٹھی رو رہی ہیں۔ میں ۔ ۔ ۔ ۔ میں"

[illegible] نے مجھے غور سے دیکھا۔ امرود کی پھانک ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ شیر اور بکری [illegible] کو بڑی نزاکت سے نظروں میں تول رہے تھے شیر کون اور بکری کون؟ یہ اس [illegible] مشکل تھا۔ ان کی بڑی بڑی غلافی آنکھوں میں ایک کوندا سا لپکا۔ میں آنکھوں [illegible] بڑھتی گئی۔ اماں تو کہتی ہیں میں سوکھا روتی ہوں۔ جب بچپن میں پٹتی تھی تو [illegible] آنسو ایک نہیں نکلتا تھا۔ چلّی گو بار سے اکثر حملہ آور بوکھلا جاتا اور مارکم [illegible] سے پہلے ہی چلانے لگو تو دو چار تھپڑ مارنے والا سمجھتا ہے بہت [illegible] کرنے کی نوبت نہیں آتی، مگر میری آنکھوں میں دھند چھا گئی۔

[illegible] آپا نے ڈرتے ڈرتے ڈیوڑھی سے جھانک کر دیکھا تو ڈاکٹر

کی پیشین گوئی پوری ہوتے ہوتے بچی۔

دو احمق عورتیں ایک دوسرے کے گلے سے لگی یوں یوں رو رہی تھیں۔

خانم صاحب بوکھلائی ہوئی کمرے سے نکلیں اور مجھے دیکھ کر ٹھٹک گئیں پس نے اپنے گال پر سے پھوپھی اماں کے آنسو اور رال پونچھ کر انہیں سلام کیا۔

"جیتی رہو" انہوں نے اہنیں پھیلا دیں۔

شوکت آپا کچھ حیرس سی کھڑی تھیں نسیم آتے ہی مرغیوں کے پیچھے بے تحاشہ دوڑ رہا تھا۔

"بالکل باپ پر گئی ہے اللہ کا شکر ہے ننھیال پہ نہ گئی۔ موٹے حبشی بدوؤں کا میل ہے تمہاری ننھیال میں" انہوں نے ڈنک سنبھالنے شروع کئے۔

"توبہ ہے اماں، بس شروع ہوگئیں" خانم صاحب تنک کر بولیں۔

"تو کیا میں جھوٹ کہہ رہی ہوں، بدوؤں کا میل نہ ہوتا تو پھیلے دہانے، چپٹی ناکیں اور گھونگھریالے بال کہاں سے آتے۔ میرا بھائی تو مغل ہے"

"ارے ہاں، کبھی غور ہی نہ کیا" میں بولی "سچ تو ہے، ہمارے ننھیالی بزرگوں میں ضرور کسی نہ کسی نے بد دلڑکی سے شادی کی ہوگی۔

پھوپھی اماں کی آنکھوں میں شعلے بھڑکنے لگے مگر مجھے ہنستا دیکھ کر بولیں۔

"مگر ڈھٹائی ننھیال سے پائی ہے"

توبہ کیجئے پھوپھی اماں وہ موٹے پتلی دال کے کھانے والے عثمانی ہم چنگیزیوں کی کیا برابری کریں گے۔ کتنے سو سال حکومت کی ہے ہم نے اس ملک پر، ہماری ڈھٹائی کے تو جھنڈے گڑے ہیں سارے ملک میں"

"ہاں بھی کسی شیخ چلی سے نہ ہوسکی حکومت" پھوپھی اماں وار پر وار کرنے کی عادی تھیں۔ "کر دم نہ لینے پائے غنیم" "بس مجاور ہی رہ گئے"

ذرا سی تفصیل طلب ہے یہ بات نہ جانے کدھر سے ہماری ننھیال کا کچھ حضرت

سلیم چشتی سے ڈورا ملتا تھا۔ ضرور کچھ گھپلا ہوگا۔ یا شاید پھوپھی اماں نے یہ رشتہ طعنہ دینے کے لئے گڑھا تھا۔ وہ کہتی تھیں حضرت سلیم چشتی جن کا ہماری نانی سے سلسلہ ملتا تھا—— مجاور تھے ——

"مگر بڑے زردار مجاور تھے۔ اکبر نے بیٹے کی خاطر ان کے قدموں پر سر جھکایا" اور پھوپھی اماں تلملا گئیں۔

"اڑے دعا خاک میں مل گیا۔ سنپولیے میری جان کو چھوڑ گیا۔ ارے تیری اماں نے یہ زہر گھولا ہے میرے خلاف۔ شوکت نکل اسی وقت"

"کیوں اماں" شوکت آپا رو پڑیں"

"کیوں لائی اس کلموہی کو"

"میں نے بہت منع کیا"

"ہاں پھوپھی اماں، ان بیچاری نے بہت منع کیا۔ مگر میں زبردستی آگئی"

"کیوں؟" پھوپھی اماں غرائیں۔

"اماں!" خانم صاحب بولیں۔

"تو چپ رہ، ہاں بول کیوں آئی؟"

"آپ کو دیکھنے۔ کھڑکی میں سے صاف نہیں دیکھا تھا۔ پھر بہت سال ہوگئے تھے۔ پاس سے تو کبھی نہیں دیکھا تھا!"

"تو پاس سے دیکھنے آئی ہے؟"

"ہاں" میں نے مری آواز میں کہا۔

"کیوں؟ کیا میرے لئے کوئی بڈھا ڈھونڈا ہے، میرا بیاہ رچائے گی؟"

مجھے ایک دم ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ پھوپھی اماں کچھ جھینپ گئیں۔ میں ہنسی سے بے قابو ہو کر پاس والے پلنگ پر گر گئی۔

"ارے ارے، کیا کرتی ہو۔ یہ اماں کا پلنگ ہے۔ اس پر تو نعیم کو بھی نہیں چڑھنے دیتیں۔" میں جلدی سے کھڑی ہو گئی۔

"بیٹھ!" پھوپھی اماں نے ڈانٹا۔ میں جلدی سے واپس بیٹھ گئی۔ وہ شوکت آپا کی طرف مڑیں۔

"ہوں تو یہ یہاں نہیں بیٹھے گی؟ تیرا باوا کا ہے یہ پلنگ؟"

"اے اماں اللہ کا واسطہ" خانم صاحب بولیں۔

"تم چپ رہو حشمت خانم، ہاں تو بول یہ یہاں کیوں نہیں بیٹھے گی؟" تمہارا ہے یہ پلنگ، تم کسی کو نہیں بیٹھنے دیتیں، اس لئے مجھے بھی تو منع کرتی ہو۔"

"تو میرے پلنگ پر بیٹھنے کے قابل ہے؟"

"میں نے کب کہا؟" شوکت آپا منہ پھلا کر چوکی پر ڈھ گئیں۔ پھوپھی اماں میرے پاس بیٹھ گئیں۔ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔

"ارے ناشکری پھوپھی بھتیجی ایک ذات اور نانی تین پانی۔ یہ میرے بھائی کی اولاد ہے، سمجھی اور تو؟" شوکت آپا رونے لگیں۔ پھوپھی اماں نے نعیم کو پاس بلا کر گود میں بٹھا لیا۔ اور یہ میرے بھائی کا پوتا ہے، شیر تھا میرا بھیا شیر۔ ایک دفعہ کیا ہوا کہ کسی نے چھوٹے کو مارا (چھوٹے چچا مستقیم بیگ چغتائی) وہ آیا روتا۔ بھائی نے دو جھاپڑ لگائے۔ روتے ہیں مرد؟ اور بس اسی دن دونوں مل کر اکھاڑے میں اترنے لگے۔ پورے تین مہینے کس کس کے ڈنڈ بیٹھک لگائی۔ بھر بھر کٹورے گھی پیتے تھے دونوں۔ میں اپنے ہاتھ سے مکھن تایا کرتی تھی۔ اے چوتھے مہینے نکلے دونوں گلی میں۔ نادو پہلوان کے پاس سے گزرے تو مار دیا کندھا۔ وہ لگا اکڑنے کہ اندھے دیکھ کر نہیں چلتا۔ بس جی وہیں نگوڑے کا بلستر کر دیا۔ ہم مغل ہیں، لڑکی یہ نہ بھول جانا کہ ہم نے بڑے بڑوں کے چھکے چھڑا دیئے۔"

میں نے اپنی ہنسی جمائی میں چھپا لی۔ جی چاہا کہہ دوں اور وہ جو بڈّوں کا میل ہے تجھ میں

اور تم تو کہتی ہو میری ماں نے کوچوانوں اور گراسکٹوں سے آشنائی کر کے کالے پیلے سنپولیے جنے ہیں۔ تمہارا شیر بھائی تو نامرد تھا۔ پچھلی بار رحمٰن بھائی کی کھڑکی میں بیٹھ کر تم نے خود میرا شجرہ گنایا تھا۔ مگر اس وقت مجھے پھوپھی اماں پر بہت پیار آ رہا تھا۔ وہ اپنی صراحی اپنا کٹورہ، اپنی رکابی، پلنگ، چادر، لحاف، تکیہ کسی کو چھونے نہیں دیتی تھیں۔ خانم صاحب کو کبھی منع نہیں کیا۔ مگر جب شوکت آپا کو منع کیا تو ان کے آنسو پونچھنے کے لئے انہوں نے بھی ہاتھ لگانا چھوڑ دیا۔

خانم صاحب کو میں نے سب سے پہلے دھنکوٹ کے اسکول میں دیکھا تھا۔ آگرہ کا سب سے سڑیل اسکول تھا۔ وہاں میں ٹاٹ پر میلی گندی بچیوں کے ساتھ دن بھر کشتم پچھاڑ کیا کرتی تھی۔ ہم نو دس لڑکیاں ایک بڑی سی ڈولی میں بھر کے جایا کرتی تھیں۔ ڈولی اتنی بھر جاتی تھی کہ عبارہ بن جاتی تھی۔ بس ڈنڈا اکڑ کر پٹی پر پیر جما کر لٹک جاتے تھے۔ تین ادھر تین اُدھر اور تین کبھی چار بیچ میں۔ بیچ والیوں کی موت ہوتی تھی۔ کبھی کسی کی بالی کھنچ کر خون بہنے لگتا، کبھی نتھنی کھنچ جاتی۔ بھائیوں سے جنگ بازی میں بالیاں تو میں نے اتار کے کھو دیں، تنکے ڈال لئے تھے، اور چوٹی میں نے اپنے کرتے میں پیٹھ پر اندر ڈال لیتی تھی۔ دوپٹہ سے بھی پھانسی لگ جانے کا اندیشہ رہتا تھا۔ لہٰذا اتار کر بستے میں ٹھونس لیتی تھی۔

پتہ نہیں وہ وہاں کیوں آئی تھیں؟ میں نے زندگی میں اتنی حسین عورت نہیں دیکھی وہ اس وقت شاید چوبیس پچیس برس کی ہوں گی۔ پانچ فٹ چھ انچ کا قد اس پر اونچی ایڑی، ٹانک کمر، لمبے بال، نیلا ریشم کا گھیر دار غرارہ، سفید لمبی آستینوں کی قمیص اور سفید بیل لگا نازک سے کپڑے کا دوپٹہ۔ میں انہیں دیکھتی میں سستی چھینٹ کا اُٹنگا پاجامہ دو ڈورے کا میلا کرتا اور موٹی ململ کا گندہ سا دوپٹہ پہنے ٹاٹ پر بیٹھی تختی پر ا۔ ب۔ لکھ رہی تھی۔

"تو یہ ہیں ہماری ماموں زاد بہن!" انہوں نے آسمان سے نیچے موری میں جھانکتے ہوئے کہا اور میرا جی چاہا میں چیونٹی بن کر ٹاٹ کے نیچے رینگ جاؤں۔

وہ چلی گئی تھیں اور میری تختی پر آنسو اور ناک ٹپکے، ا۔ب، پھیل کر پنجہ شاہی کا نقشہ بن گیا تھا جس پر استانی نے اتنی زور سے چپت ماری تھی کہ میرا سر تختی سے جا ٹکرایا تھا۔ اور میں نے اپنی عزیز از جان سہیلی بگو کو کھسوٹ ڈالا تھا کہ وہ مجھے چمکار رہی تھی۔

خانم صاحب پندرہ سولہ برس بعد بھی حسین تھیں۔ مگر جسم ذرا بھاری ہو گیا تھا۔ چہرہ کچھ سوجا ہوا سا لگ رہا تھا۔ ہاتھی دانت جیسی شفاف جلد کچھ بھوری اور کملائی سی ہو گئی تھی۔ پھر بھی وہ بہت حسین تھی۔ مہارانی سی لگنے لگی تھیں۔ مسکراہٹ اب بھی قیامت تھی۔

رات کو تخت پر دستر خوان لگایا۔ یاد نہیں کیا کھایا۔ مجھ پر کچھ نشہ سا طاری تھا۔ پھوپھی اماں نے مجھے ہاتھ سے نوالے بنا کر کھلائے۔ اپنی رکابی میں ساتھ کھلایا اپنے کٹورے سے پانی پلایا، اور بغیر کھنگالے خود بھی پیا۔ شوکت آپا سناٹے میں بیٹھی دیکھ رہی تھیں۔ اور شاید تھوڑی کیا کافی جل بھی رہی تھیں مگر پھوپھی اماں بڑی زبردست پالیٹیشن تھیں وہ مار کے چمکار لینے کی عادی تھیں۔ انہوں نے ایک صندوق بھر سامان شوکت آپا کو دیا ان کے اور نعیم کے کپڑے پاؤڈر اور صابن کے ڈبے۔ شوکت آپا خوش ہو گئیں وہ اپنے بیٹے کو لے کر اپنے کمرے میں جا کر سو گئیں۔

یہ طے ہوا کہ پھوپھی اماں، خانم صاحب اور میں اندر چوکے پر سوئیں گے چار تخت ملا کر ان پر موٹی سی توشک اور چاندنی بچھی تھی لحاف دوہی تھے پھوپھی اماں کا بہت بڑا تھا۔ انہوں نے مجھے اپنے ساتھ سلا لیا۔ سردی کڑاکے کی پڑ رہی تھی، دو انگیٹھیاں سلگ رہی تھیں۔

"پھوپھی اماں، میں نے ہوش سنبھالا تو آپ کی اور ابا کی لڑائی کے بارے میں سوالات دل میں اُبھرے۔ پوچھا تو کوئی کچھ نہیں بتاتا بس کہتے ہیں آپ مغرور ہیں۔ صاف کہو خرد ماغ ہوں، لورائی کٹنیا ہوں۔ مجھے لگی لپٹی نہیں بھاتی۔"

"مگر پھوپھی اماں ذرا سوچیے میں آپ سے کیوں بدظن ہوں گی"

تمہارے اماں باوا کا بھرا ہوا زہر۔ سچ بتاؤ تم نے میرے اور میری بیٹی کے بارے میں اپنے خاندان بھر سے کوئی اچھا بول سنا ہے"

"نہیں، مگر کیوں؟"

"تمہاری اماں اپنے میکے والوں کو پالتی ہیں"

"میری اماں کے میکے والے اور سسرال والے الگ نہیں۔ انہوں نے بڑے ابا اور ان کے بچوں کو پالا اپنی نند کے تین بچے پالے۔ اور تو اور غیروں کے بچے پالے۔ چچا میاں کی کتنی خاطر کرتی ہیں۔ سارا کنبہ ان کی تعریف کرتا ہے۔ سوائے آپ کے اور کسی سے ان کے خلاف ایک لفظ نہیں سنا۔ ابا کی اور ان کی جیسی بنتی اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اپنی منہ بولی بہن کے ساتھ بھی وہ کیا جو مشکل سے کوئی کرے گا"

اماں کے بچپن کی ایک سہیلی تھیں، ان سے بڑی اور سمجھدار اماں نے زندگی کے حقائق ان کے ہی ذریعہ سنے اور جانے۔ وہ بہت غریب تھیں، ان کے میاں پیراسی تھے اور جب میں نے انہیں دیکھا تو کافی بوڑھے ہو چکے تھے بیوی سے عمر میں بہت بڑے تھے اور نوکری ختم ہونے کے بعد مسجد میں پڑے رہتے تھے وہیں کسی گھر سے کھانا مل جاتا تھا کوئی اللہ کا بندہ کپڑے بنوا دیتا تھا۔

بڑی بیٹی رقیہ آپا سہارن پور میں ایک بہت بڑے زمیندار سے بیاہی گئی تھیں۔ وہ خوبصورت اور کم عمر تھیں۔ ان کی پہلی بیوی سے لڑکا نہیں تھا کسی غریب اچھے خاندان کی لڑکی سے بیاہ کرنا چاہتے تھے۔ مختصر سے مہر پر ان سے بیاہ کر لیا تھا۔ مگر ان سے بھی ایک بیٹی ہوئی۔ مجھ سے کچھ بڑی تھی، اور میری بڑی دوست تھی۔ چھوٹی بی بیاریں ہے۔ یاد نہیں کیا نام تھا۔ اچھی خوبصورت اور ذہین لڑکی تھی۔

اچانک باپ کا انتقال ہوگیا۔ دادا نے جب چھوٹی بی پانچ برس کی تھی تب اس کی شادی اپنے دوسرے بیٹے کے لڑکے سے کر دی جو دو سال کا تھا۔ یہ سب اس لئے کہ جائیداد باہر نہ جائے۔ رقیہ آپا لڑکی کو لے کر میکے چلی آئیں۔ اور کوشش کرنے لگیں کہ طلاق ہو جائے تاکہ چھوٹی بی کے باپ کی جائیداد کا حصہ وہ لے سکیں۔ دو بیویوں میں بٹنے کے بعد بھی کافی حصہ ملتا۔ مگر خلع جو اسلام میں جائز ہے اور کوئی بھی عورت معقول وجہ پر خلع لے سکتی ہے، مگر چھوٹی بی خلع نہ لے سکی۔ یہ کہ دولہا تین سال چھوٹا تھا کوئی معقول وجہ نہ تھی۔ بڑے مقدمے چلے مگر کامیابی نہ ملی، اور چھوٹی بی کو آخر جس لڑکے سے نکاح ہوا تھا اس کے پاس جانا پڑا۔

دوسری لڑکی بہت خوبصورت تھی۔ احمدی بیگم اس کی ایک چھوٹے سے زمیندار سے شادی ہوگئی۔ اور چوتھے بچے کے جاپے میں مرگئی۔

تیسری لڑکی کی شادی ایک معمر آدمی سے ہوئی جو چھتاری کے نواب صاحب کے ہاں منیجر تھے ایک لڑکی پیدا ہوئی اور وہ لڑھک گئے۔ نواب صاحب نے انہیں کافی روپیہ دیا اور وہ بھی بیٹی کو لے کر گھر آگئیں۔ آتے ہی انہوں نے دونوں ہاتھوں سے روپیہ اڑایا۔ خوب دعوتیں کیں۔ سارے خاندان کو بانٹا اور کنگال ہوگئیں ادھر ادھر رہتی پھرتی تھیں۔ چوتھی لڑکی کی بھی ایک کافی بڈھے امیر آدمی سے شادی ہوئی۔ جس کے لڑکے اس سے بہت بڑے بڑے تھے۔ بڈھے کو ایک نرس کی ضرورت تھی۔ بے حد بیمار تھا۔ دو چار سال بعد مرگیا۔ اور کچھ چھوڑ بھی نہیں گیا۔ کیونکہ لڑکوں نے شادی اسی شرط پر کی تھی، کہ جائیداد پہلے بانٹ دو۔ مرنے کے بعد وہ سوتیلی ماں کو بس بے تنخواہ کے نوکر کی طرح رکھتے رہے۔

چوتھے نمبر پر ایک لڑکا تھا وہ بالکل باپ کی طرح نکما کچھ پڑھا یا لکھا یا نہیں

نہ ہی اسے اتنی عقل۔ لاڈلا بیٹا تھا۔ اسکول میں لڑکے ستاتے تھے تو اماں نے گھر بٹھا لیا۔

ہماری اماں کا جو گھر تھا اس میں دو بھائیوں کا حصہ تھا۔ کرایہ کچھ نہیں تھا اماں نے بھائیوں سے کہا۔ یہ گھر مجھے دے دو۔ وہ گھر انہوں نے اپنی سہیلی کو دے دیا۔ وہ لڑکا شادی کے بعد بھی کچھ نہ کر پایا اور تین چار بچے پیدا کروا کے پلنگ پر لیٹ گیا۔ اماں نے ساری عمر اپنی سہیلی کو نبھایا۔ وہ سال میں دو دفعہ آتی تھیں۔ ایک دفعہ جڑاول بنوانے اور ایک دفعہ گرمی کے جوڑے بنوانے بیٹیوں کی شادی میں پورے پورے جہیز بنوائے۔

یہ سب مجھے پھوپھی اماں نے بتایا۔ اماں کہتی تھیں سب جھوٹ۔ ابا کو بھی پتہ نہیں تھا اور جب پتہ چلا تو اماں صاف مکر گئیں۔

”مگر پھوپھی اماں یہ باتیں سن کر تو میرے دل میں اپنی ماں کی اور عزت بڑھ گئی۔ وہ بڑی دل والی تھیں۔“

”ہاں ہاں تو تو میاں کی چچ کرے گی۔“ وہ بھنائیں اور لحاف سمیٹ کر الگ لیٹ گئیں۔

”[illegible] اگر میں مر گئی تو کفن دفن لحاف سے زیادہ مہنگا پڑے گا۔“ ایک دم لحاف میرے اوپر پھینک کر خود پیٹھ موڑ کر لیٹ گئیں۔ میں نے لحاف ڈھانکنا چاہا ان پر تو بپھر پڑیں۔ خانم صاحب نے بہت مشکل سے راضی کیا کہ میں ان کے لحاف میں آجاؤں، تو ایک دم من گئیں۔

”نیند آرہی ہے پھوپھی اماں؟“ میں نے پوچھا۔

”مر گئی پھوپھی اماں۔“

خدا کے لئے بات کچھ ہو رہی تھی اور آپ خالہ بی کا رونا لے کر بیٹھ گئیں۔ بتائیے آپ کی ابا میاں کی لڑائی کس بات پہ ہوئی۔“

"بڑا لمبا قصّہ ہے"

"تبائیے تو......"

"میں تباؤں" خانم صاحب بولیں۔ یہ تین بھائیوں کی لاڈلی بہن بڑی تنک مزاج تھیں۔ لڑکیاں جب لڑکوں کے برابر یا ان سے بہتر لاڈ پیار سے پالی جائیں تو وہ اچھی بیویاں نہیں ثابت ہوتیں"

"کیوں آپا؟"

"اب تمہیں کیسے تباؤں"

حشمت خانم ہمارے خاندان کی پہلی لڑکی تھیں جنھوں نے مڈل پاس کیا اور لکھنؤ میں استانی کی نوکری کی۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب میری بڑی آپا کی شادی ہو گئی تھی۔ لیکن منجھلی اور سنجھلی ابھی چھوٹی تھیں اور نہ جانے کیا سوجھی کہ ابّا میاں نے ان دونوں کو کرامت حسین بورڈنگ میں داخل کرا دیا۔ میں چونکہ منجھلی بہن سے بہت مانوس تھی مجھے بھی بھیجا گیا۔ مجھے کچھ نہیں یاد بس اتنا یاد ہے کہ باجی غائب ہو جاتی تھی اور میں ایک نوکرانی کے پاس گلا پھاڑ پھاڑ کر باجی باجی پکارا کرتی تھی۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ ہمیں واپس بلا لیا گیا۔ میں نے بڑے ہو کر پوچھا تو کوئی تسلی بخش جواب نہ پایا۔ بس بڑی بدنامی ہو رہی تھی۔ سارا خاندان بائیکاٹ پر تل گیا کہ تم لڑکیوں کو سٹائن بنا رہے ہو ان کی شادیاں نہ ہو سکیں گی سب کو ساری عمر پالنا۔ ماں نے رو رو کر برا حال کر لیا۔ ابا نے ہتھیار ڈال دیئے ان کے تمام ملنے والوں کی یہی رائے تھی کہ لڑکیوں کو تعلیم دلوانا انہیں پیشہ کرانے سے بھی زیادہ ذلیل حرکت ہے۔

میں خوش قسمت تھی کہ دیر سے پیدا ہوئی اور مجھے تعلیم پانے موقع ملا۔ وہ بھی کیا کیا جتن کرنے کے بعد، میرا قلم بہک رہا ہے اور بار بار پٹڑی سے اتر جاتا ہے۔ بات اس وقت میرے ابا میاں اور پھوپھی اماں کی لڑائی کی ہو رہی تھی اور میں کہاں پہنچ گئی۔

"بات دراصل یہ تھی کہ اماں کچھ پڑھی لکھی بھی تھیں۔ یعنی ایک تو کریلا اوپر سے نیم چڑھا" حشمت جہاں نے چپکے سے کہا۔

"صاف بات کیوں نہیں تباتی۔ میرے اوپر تو بھی الزام رکھ دے بس" پھوپھی اماں غرائیں مگر حشمت جہاں نے سُنی اَن سُنی کر دی۔

"اماں کی کم عمری ہی میں ماں گزر گئیں۔ ہمارے نانا اور تمہارے دادا مرزا کریم بیگ چغتائی کی پہلی بیوی کے انتقال کے بعد انہوں نے ہماری نانی سے شادی کی"

"مجھے معلوم ہے پہلی بیوی سے سب سے بڑے ہمارے تایا مرزا نعیم بیگ اور پھوپھی امراؤ خانم تھیں۔ میں نے انہیں نہیں دیکھا صرف ان کے بارے میں سُنا ہے" میں نے کہا۔

"ہاں ان کی شادی رشتہ ہی میں عمدہ خانم سے ہوئی تھی"

"ان کے بیٹے مرزا ولی اللہ بیگ، وہ لمبے بانس سے ولّو چچا۔ ہم انہیں چچا کیوں کہتے تھے۔ وہ تو ہمارے تایا زاد بھائی تھے خیر، وہ افیون کھاتے تھے، اور میٹھے پر جان دیتے تھے۔ ننھے بھائی انہیں بہت ستایا کرتے تھے، ان سے پوچھتے شہد کھائیں گے۔ وہ کہتے ہاں، تو ننھے بھائی کہتے منہ کھولیئے۔ وہ منہ کھولتے تو ننھے بھائی ان کے منہ میں لیموں نچوڑ دیا کرتے تھے۔ اُوہ کتنا غل مچاتے تھے، چیخ چیخ کر روتے تھے۔ سارا نشہ کاٹ ڈالا مردود نے"

ولّو چچا کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ وہ کسی مصرف کے نہیں تھے۔ بس تیرے میرے ہاں پڑے رہتے تھے۔ نہایت میلے، نوکر تک ستاتے تھے۔

"اور سُنا ہے تایا نعیم بیگ گوالیار کے گورنر تھے ایک زمانہ میں"

مگر وہ تو سنا ہے ہمارے ہاں رہا کرتے تھے۔ بیوی آگرے میں رہتی تھیں، لڑکا ہی ادھر کبھی اُدھر، عربی فارسی کا مصرف ختم ہو گیا تھا۔ بڑے بڑے عالم بھوکے مر رہے

تھے وہ تو چچا سنا ہے فارسی کا دیوان لئے پھرتے تھے۔

"ہاں ذہین تھے سنا ہے۔ مگر باپ کے تباہ ہونے کے بعد ان کی بھی مٹی خراب ہوگئی۔ اور جانتی ہو کس نے تباہ کیا؟"

"نہیں تو، ان کا تو کبھی ذکر ہوتا ہے تو یہی کہ بس رہتے تھے۔"

"تمہارے دادا نے۔"

"دادا یعنی خود باپ نے؟"

"ہاں، وہ رنگین مزاج تھے۔ بس شراب کباب اور رنڈی بازی ایک دن جلسہ جما ہوا تھا بارہ دری میں، چراغاں سے باغ جگمگا رہا تھا۔ اور رنڈیوں کے طائفے محفل کو گلزار بنائے ہوئے تھے کہ کسی نے نانا جان کو جا کے خبر کر دی۔ وہ گرجتے برستے آئے۔ بیٹے پکڑ کے چوکے سے گھسیٹا اور جوتے کاری شروع کر دی۔ نانا جان کی لوگوں پر بڑی دہشت تھی، بھگدڑ مچ گئی۔ نانا جان کا بڑا رسوخ تھا۔ فوراً معطل کر دیا کہ یہ ناہنجار نکما اور عیاش ہے، اس عہدے کے قابل نہیں۔"

"کمال ہے ایسی حد کر دی۔ اقوہ!"

زمین جائیداد کچھ جمع نہیں کیا تھا۔ کچھ سال زیور برتن بیچ کے گذر کی۔ جب فاقوں کی نوبت آئی اور محلہ والوں کے رحم و کرم پر بسر ہونے لگی تو کچھ انتظام کیا گیا۔"

"مگر دادا جان نے تو بہت جائیداد چھوڑی تھی۔"

"انہیں عاق کر دیا تھا نا۔ انہیں کوڑی کا حق نہیں تھا۔ ایسی تھڑی تھڑی ہوئی کہ بیچارے منہ چھپا کے پڑ گئے۔"

"کوئی اور نوکری کیوں نہ ڈھونڈھی کسی ریاست میں چلے جاتے۔"

"اول تو اتنی بدنامی کے بعد کہاں دوسری نوکری ملتی۔ پھر نوکری تو نانا جان کے رسوخ سے ملی تھی دوسرے عیاشی اور نشہ بازی نے انہیں بالکل مست کر دیا تھا۔"

"مگر دادا جان نے بھی حد کر دی۔"

"اس زمانہ کے لوگ ایسے ہی گھن چکر چلایا کرتے تھے۔ مثل تھوڑے سے پاگل تو ہوتے ہیں۔ پھر انگریز نے احساس کمتری اس شدت سے پیدا کر دیا تھا۔ انگریزی نہ جانے وہ نکما۔ حالانکہ ان دنوں زیادہ تر کارروائی فارسی میں یا اردو میں ہوتی تھی۔ اور سنا ہے بیں نے ہندی بھی پڑھنی شروع کر دی ہے۔"

"ہندی؟" میں چونک پڑی، ہندی کا تو اس وقت کہیں نام و نشان بھی نہیں تھا۔ جب کسی کے ہاں کتھا ہوتی تھی تب ہندی کی بھور سے کاغذ کی پستک لے کر پنڈت جی آتے تھے اور پاٹھ ہوتا تھا چاچی بھی ہندی کی پستک سے پاٹھ کرتی تھی۔ مگر چچا جی تو اردو فارسی بہت اعلیٰ درجہ کی جانتے تھے۔

"اماں کو پتہ چل گیا تو بہت بگڑیں۔"

"کیوں؟"

"پتہ نہیں میں نے کہا میں دیو مالا پڑھنا چاہتی ہوں، بس پھر تو بپھر گئیں۔ ہاں بس میں جو سب جانتی ہوں تو ہندو ہونے والی ہے۔"

"کیوں"؟

"طلاق لینے کے لئے۔" پھوپھی اماں بنی پڑی تھیں، سوئی نہیں تھیں۔

"کیا ہندو ہو جائے تو طلاق مل جائے گی؟"

"یا عیسائی ہو جاؤ، طلاق مل جائے گی۔"

"بھاڑ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان، حشمت جہاں، اگر ایمان نہ رہے تو ....
لعنت، پھٹکار۔" پھوپھی اماں اور گرم ہوئیں۔

"مگر طلاق تو مل جائے گی۔"

"مذہب کا خون کر کے؟"

"مگر زندگی کا خون ہو جائے تو کوئی بات نہیں۔ ہندو ہو جائیے دل میں مسلمان رہیئے اصل بات تو دل کی ہے۔"

"بس دیوانوں جیسی باتیں نہ کرو۔ ہے نہ بدو کا خون موئے۔"

"دیکھئے پھوپھی اماں بدّوؤں کو کچھ نہ کہیئے گا۔ میرے دل میں کالے انسانوں کے لئے بہت گہری جگہ ہے۔ آپ نے پال رابسن کا "اولڈ مین روز" سنا ہے کبھی؟"

"کون ہے اللہ مارا؟" میں نے ان سے نہیں حشمت آپا سے پوچھا تھا۔ مگر وہ ٹپک پڑیں۔

"امریکہ کا عظیم موسیقار"

"کوئی اللہ والا ہے۔"

"وہ بیچارا اللہ والا، توبہ کیجئے، توبہ۔"

"اچھا بابا توبہ۔ اب سو جاؤ۔"

"آج تو میں جاگی ہوں، یہ اتنا بڑا المیہ کیسے ہوا۔ حشمت جہاں جیسی بے مثال حور، اس لنگور دیبی لیاقت کے پلے کیوں باندھ دی گئی۔ نہ پڑھا نہ لکھا، ارسے دولت بھی تو نہیں کہ دولت کے لالچ میں کر دی اور کم بخت کی صورت نہ شکل، چپراسی ہے۔" "صرف چپراسی ہونا تو بھی کوئی بات ہوتی۔ میں بھی نوکری کرتی ہوں۔ چھوٹا بڑا کیا۔ تنخواہ کا فرق ہے، مگر آدمی تو ہوتا۔"

"تو پھر، یہ آپ لوگوں کو کیا ہو گیا تھا۔" میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"ارے میرے ہاتھ بندھ گئے تھے۔" پھوپھی اماں کراہیں۔

"کس نے باندھے ہاتھ اور آپ تیار ہو گئیں۔"

"میں اس وقت پورے سولہ برس کی بھی نہیں تھی۔ بس قرآن ختم کیا تھا۔ تھوڑی فارسی، ہاں اردو اچھی آتی تھی۔"

"تو پھر پھوپھی اماں.....؟"

"دیکھو تو تم نے مجھے اور جلایا تو دیوار سے سر پھوڑ لوں گی۔" پھوپھی اماں بڑبڑائیں "اری ہتو، مت۔ پوچھ کلیجے کے کھرنڈ اکھڑ جائیں گے۔" اور پھوپھی اماں ہچکی ہچکی رونے لگیں۔

"نا اماں نا" خانم صاحب نے ماں کو بچے کی طرح تھپکنا شروع کیا۔ میں بیچ میں لیٹی تھی۔ خانم صاحب کا ہاتھ میرے اوپر سے گذر کر ماں کو چھو رہا تھا۔ ان کی بند آنکھوں سے گنگا جمنا چھلک رہی تھی۔ رات کے تین بج رہے تھے۔

ایک دم نیند لوٹ پڑی جیسے کسی نے دوائے بے ہوشی چھڑک دی اور ہم سو گئے۔ جذباتی تصادم نے ہم تینوں کو شل کر ڈالا تھا۔

دھنی ہوئی سیمل کی روئی کے لحیم شحیم گالے میرے نتھنوں میں گھس رہے تھے، دھنکڈ مرغولے امنڈ رہے تھے۔ ایک میلا سا ہیولا کہرے کی چادر میں لپٹا کوئی سفید سفید چیز سل پر پیس رہا تھا۔ شاید کھیر کے چاول ہوں گے۔ دور کہیں عورتوں کے بین کرنے کی آواز گونج رہی تھی۔ میرا دم نکل رہا تھا۔ اب سانس واپس سینے میں نہیں آئے گی۔ میں مر رہی ہوں۔

بچپن سے مجھے ڈراؤنے خواب ستایا کرتا ہے۔ میں جینے پر تلی ہوئی ہوں۔ میں سانس کو واپس پھیپھڑوں میں کھینچنے کا فیصلہ کر چکی ہوں۔ اور آج تک اس پر قائم ہوں۔ میرے سینے پر دھرا پہاڑ بڑھتا جاتا ہے۔ روئی میرے پھیپھڑوں میں گھس کر پھول رہی ہے۔ میں جاگ چکی ہوں مگر سانس ابھی تک نہیں آئی۔ میں بھاگ رہی ہوں دور بلندیوں کی طرف، تازہ ہوا کو دونوں مٹھیوں میں دبوچنے کے لئے۔ ہوا کو میرے چنگل میں آنا ہی ہوگا۔ اور میں مرجاؤں گی!

اور میں نہیں مرتی۔ ایکدم میں عذاب کے شکنجہ سے چھوٹ جاتی ہوں۔ ہوا کر

میرے پھیپھڑوں نے دبوچ لیا۔ کراہتی ہوئی میں لحاف دُور پھینک کر خود کو ڈھیلا چھوڑ دیتی ہوں۔

میں کہاں ہوں؟ مجھے کون اٹھا لایا، یہ اجنبی کمرہ، میں نے زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔

"خدا کی مار نا شدنی، ڈھول   جا رہی ہے" پھوپھی بادشاہی گرج رہی ہیں۔

اوہ میں مائی تھان اپنی پھوپھی کے ہاں ہوں۔

مہترانی بانس کے تنکوں کی جھاڑو دنل سے بیری اور امرود کے جھڑے ہوئے خشک پتوں کو سمیٹ رہی ہے۔ میری کڑوی کسیلی چھپتو بنکار رہی ہیں سر سر جھاڑو میں معصوم سا نغمہ ہے جیسے غلماں سنتور کے تاروں کو آسمانی انگلیوں سے چھیڑ رہے ہیں۔

جب مجھے یہ ڈراؤنا خواب نظر آتا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے میں مر کر زندہ ہوئی ہوں۔ کون جانے چند لمحوں کی موت ہو بھی جاتی ہو۔ مگر عالم نزع بیت جانے کے بعد میں خود کو پہلے سے زیادہ چاق و چوبند پاتی ہوں۔ میرا دماغ دور دور دستوں کو ناچنے لگتا ہے۔ انگ انگ میں زندگی کی طلسماتی لہر دوڑ جاتی ہے۔ عمر کے چند سال گھٹ جاتے ہیں۔ اُس طوفان سے میں نئی شکتی کھینچ لائی ہوں۔ بے وجہ ہنسی آنے لگتی ہے۔ دل میں لڈو سے پھوٹنے لگتے ہیں۔ نتھنوں میں گیلی مٹی کی سوندھی سوندھی مہک بھر جاتی ہے۔

میں باہر نکلی تو پھوپھی اماں چوکی پر بیٹھی ایک صندوقچہ کھولے الٹ پلٹ میں مشغول تھیں۔ صحن میں دھوپ اتر آئی تھی۔ میں نے سلام کیا تو چونک کر اجنبیوں کی طرح خونخوار آنکھوں سے گھورنے لگیں جیسے پوچھتی ہیں یہ بلا کہاں سے آن ٹپکی۔

میں اُن کی گولر بار آنکھوں سے ذرا بھی مرعوب نہیں ہوتی۔ میں جان گئی ہوں، وہ کاغذ کا شیر ہیں۔ جبروت تن و توش کے باوجود ننھی سی بچھو ہیں۔ جنہیں میرے سادیت پسند ابا خون کے آنسو رلاتے رہے ہیں۔

"جیتی رہو" وہ جبراً بڑبڑائی ہیں "شوکت اے شوکت"

"جی اماں!"

"بے بس بہت ہوا۔ کوڑا کرکٹ سمیٹو اور دفان ہو"

"اماں" شوکت آپا روہانسی ہو جاتی ہیں۔

"ہاں شوکت آپا، تم جا کے گھر در صاف کر دیں کل شام تک آؤں گی۔"

"دیوانی ہوئی ہو" شوکت آپا لرزیں۔

"ہاں تم جاؤ، کوڑا کرکٹ گھورے پر چھوڑ جاؤ"

پھوپھی اماں کی آنکھوں میں پھن ہوتے تو میں کبھی کی نیلی لاش بن چکی ہوتی۔ حرف ڈھٹائی سے میں نے بڑے بڑے میدان مارے ہیں۔ میں نے بڑے بڑے زہریلے ناگ کھلائے ہیں صرف سُنی اَن سُنی کر کے۔ پھنکارتی بسلاتی چھپتو مجھے بھولی سی گڑیا لگ رہی تھیں اور اُن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کون سا ہتھیار استعمال کریں۔

"نہیں، بس غارت ہو میری نظروں کے سامنے سے میرے گھر میں سنپولیوں کی گنجائش نہیں۔

رات کو کتنے پیار سے مجھے چھاتی سے لگانے والی نرم گرم چھپتو بچھو کا ڈنگ بنی ہوئی تھی۔ مگر مجھے ان پر ٹوٹ کر پیار آ رہا تھا۔

"آپ کے گھر میں نہیں میں تو حشمت آپا کی مہمان ہوں" اور میں نل کی طرف چل دی جہاں خانم صاحب ہودی کی منڈیر پر اکڑوں بیٹھی کوئلے سے دانت مانجھ رہی تھیں انہوں نے ایک کوئلے کا ٹکڑا دیا اور میں چبانے لگی۔

"تم تو ٹوتھ پیسٹ استعمال کرتی ہو گی میم صاحب جو ٹھہریں۔"

"ہاں مگر کالے منجن سے بھی مانجھتی ہوں۔ دانت بہت صاف ہو جاتے ہیں ابا میاں اکثر بچوں کو پکڑ کر ان کے دانت ایسے دیکھتے تھے جیسے گھوڑا خریدتے وقت دیکھتے ہیں۔ ذرا بھی ہلتا دانت ہو فوراً گھٹنوں میں داب کر توڑ دیتے تھے۔ کبھی خود بھی منجن کا ڈبہ لے کر سارے بچوں کے دانت مانجھنے لگتے تھے بڑے بھائیوں تک کو معاف نہیں کرتے تھے۔ دانت مانجھنے کے بعد کالی انگلی سے مونچھیں بنا دیا کرتے تھے۔ خود انہوں نے پائریا کی وجہ سے سارے دانت تیس بتیس برس کی عمر میں ایک دن میں اکھڑوا دیئے تھے۔ اماں کو بھی پائریا تھا۔ مگر وہ بے انتہا پان کھاتی تھیں اور اچھے دانت نکلوانے پر قطعی تیار نہیں ہوئیں۔

"اماں کی بات کا بُرا مت ماننا" خانم صاحب بولیں۔

"بُرا ماننا۔ اُف آپ کو معلوم نہیں میں کتنی سخت جان ہوں۔ کئی برس سے ڈانٹ پھٹکار نہیں سُنی۔ چھٹیوں میں جاتی ہوں تو اماں بڑی خاطر کرتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے بڑھاپا آ رہا ہے کوئی ٹانگ نہیں لیتا۔ ارے اب تو آپا بھی محبت سے بات کرتی ہیں۔ بڑے ہو کر پڑھ لکھ جانے کے بعد ہی تو مصیبت ہے۔ سب خیال رکھنے لگتے ہیں۔ اور مار کھائے تو برسوں ہو گئے۔"

"پیٹھ کھجلاتی ہے؟"

"اکثر آپ کو کبھی مار پڑی؟"

"توبہ کرو، کبھی پھول کی چھڑی نہ چھوائی کسی نے۔ مگر ....."

"مگر؟"

"کیا کرو گی سن کر؟"

"چراغ سے چراغ جلتے ہیں۔"

"اس چراغ میں نہ تیل ہے نہ باتی۔"

"مگر لو مجھ تک پہنچ گئی۔ آپ نے راستے کے پتھروں کو ٹھوکروں سے مسمار کیا۔ سانپ بچھوؤں کے جنگل پار کیئے۔ آگ کے دریا آنسوؤں سے سینچے آپ سے یہ پہلی ملاقات ہے، وہ بچپن میں جو جھلک دیکھی تھی اتنی ہی شفاف دل پر نقش ہے۔ جب سے ہوش سنبھالا آگرہ آنا ہی نہیں ہوا۔ سچ پوچھئے تو اپنی دوڑ بھاگ میں آپ یاد ہی نہیں آئیں۔ قسمت میں ملنا تھا۔ سو مل لیئے۔"

"تمہیں پڑھنے کا موقع کیسے ملا۔ میں نے مڈل کے بعد ٹریننگ لی اور نوکری کی تو سارے خاندان نے میرا ناطقہ بند کر دیا۔ گھر میں آگ لگانے تک کی دھمکیاں ملیں۔ ابا تو برسوں سے زیادہ وقت باہر گزارتے ہیں۔ کبھی راتوں کو بھی غائب رہتے ہیں ہم دو ماں بیٹیاں ڈھنڈار مکان میں کیسے جیتی ہیں یہ کچھ ہم ہی جانتے ہیں۔ اور پھر میں تو زیادہ تر لکھنؤ ہی رہتی تھی اماں پر جو گزری ہے وہ کون جانے۔"

"مگر اتنا بڑا خاندان ہے۔"

"خاندان؟ کس کا خاندان۔ تمہاری اماں نے سب کو ہماری طرف سے بدظن کر دیا۔"

"ارے میری اتنی معصوم سی اماں اپنا نام تک تو لکھ نہیں پاتیں، ہاں سپارے پڑھ لیتی ہیں۔"

"اماں کے لیئے کڑوے بول سننے کی تاب نہیں؟"

"قسم خدا کی یہ بات نہیں میں نے اپنی اماں سے بغاوت کی، ابا تو ہوش کی بات سن کر قائل ہو جاتے تھے۔ مگر اماں نے تو مجھے چودہ پندرہ برس کی عمر تک مارا ہے۔ کیا آپ سمجھتی ہیں۔ مجھے والدین نے شوق سے پڑھایا ہے؟"

"شوکت بتاتی ہیں کہ تم بڑی بدزبان اور خودسر ہو۔"

"وہ سچ کہتی ہیں، کبھی موقع ملا تو بتاؤں گی کہ میں نے کیسے کیسے دنگل لڑے ہیں۔ اور آج میں نے جب بی۔ اے کر لیا تو خاندان میں میری مثالیں دی جاتی ہیں جیسے میں نے بڑا تیر مارا۔ اب تو میری اماں کو بھی میرے وجود سے شرم نہیں آتی بس یہی دکھ ہے کہ میرے بجائے شمیم میرے بڑے بھائی نے بی اے کیا ہوتا۔ تو ماموں انہیں جودھپور میں بڑی اچھی نوکری دلوا دیتے۔ چار بار میٹرک میں فیل ہونے کے بعد وہ بور ہو گئے۔ کتابیں پھینک دیں اور میونسپلٹی میں کلرک ہو گئے۔ مجھے اماں سے کوئی شکایت نہیں۔ میری جیت ہوئی، ہارے ہوئے پہ غصہ نہیں پیار آتا ہے۔ انہوں نے اپنی عقل اور تجربہ کے مطابق میری زندگی سنوارنے کے ہزار جتن کئے مگر میں اڑیل ثابت ہوئی۔ جو کبھی میری مخالفت کرتے تھے اب خجل ہیں، مگر یہ ذرا زیادتی ہے کہ میری اماں نے سارے خاندان کو بھڑکا کر اپنی پارٹی میں شامل کر لیا۔"

"دفعہ اماں تو میری بلا سے۔" خانم صاحب نے تولیہ سے منہ پونچھ کر کہا۔ "تمہاری اماں جاہل ہوں گی مگر احمق نہیں تھیں۔ ذہانت کہو ہوشیاری کہو۔ سیاستدانی کہو انہوں نے روپیہ کے بل پر سارے خاندان کو سمیٹ لیا۔ سسرال میکہ تھا ہی ایک اور پھر تمہاری نانی ایک چلتی پرزہ تھیں تمہاری ماں کا ہاتھ کھلا تن کا کپڑا کسی کو بھا جائے تو اتار کے دے دیں۔ سارے کنبے کو ہاتھ بندھوا دیا تھا۔ جب آگرہ آئیں تو وہ اللّے تللّے سے خرچ کرتیں، خاندان میں زیادہ تر بے مال اور مفلس تھے سب مکھیوں کی طرح چمٹ گئے۔"

"پھوپھی اماں نے انہیں توڑ لیا ہوتا۔"

"اماں کو یہ گر نہیں آتے۔ ان سے میاں تو سنبھلے ہی نہیں۔ بی بی تم نہیں جانتیں اماں کتنی ادھوری عورت ہیں۔ بچپن میں ماں مر گئیں تین بھائیوں کی اکلوتی بہن، بڑے لاڈ

ہوتے تھے۔ سوتیلی ماں کا ڈر کے مارے دم نکلتا تھا۔ سوتیلی بیٹی سے لرزتی تھیں۔ لڑکی کو ماں ہی رکھ رکھاؤ سکھاتی ہے۔ میاں کو مٹھی میں رکھنا سسرال والوں کا پتہ کس ہوشیاری سے کاٹنا کہ الزام ان کے ہی سر جائے۔ اپنے بھائیوں کی قدم قدم پر تیج کرنا۔ سنا ہے اگر تمہارے ماموں خالی ہاتھ آجائیں تو تمہاری اماں چپکے سے مٹھائی منگا کر کہہ دیتی ہیں میرا بھائی لایا ہے۔ بہنوئی کے لئے تحفہ بہن کے لئے جوڑا سب خود بنا کر دیتا ہے کہتی ہیں۔ دیکھو میرے بھائی کتنے دریا دل ہیں!" اور مجھے یاد آیا ماموں آتے تھے تو روپے بھی بانٹا کرتے تھے۔ بچوں سے اماں سب چھین لیتی تھیں۔

بھئی واہ میری اماں اتنی بڑی پالیٹیشن ہیں۔ مجھے بڑا فخر ہوا۔

"اور پھر میٹھی زبان، ادھر ہماری اماں کی زبان میں ڈنک ہیں اکیلی اولاد ہوں، کبھی میری جان کو آجاتی ہیں تو جی چاہتا ہے جل کے جمنا میں چھلانگ لگا دوں۔ تاج محل کی برجی سے کئی بار کودنے کا قصد کیا۔ مگر ادھوری ماں کی پالی بیٹی کچھ کم ادھوری نہیں۔"

"لوگ کہتے ہیں آپ لوگ معزز ہیں۔"

"بزدل اور ڈرپوک انسان عزت کی ٹٹی کی آڑ لیتے ہیں۔ اماں میکے میں دھونس جمانے کی عادی سسرال میں بھی سب پر چھا گئیں۔ میاں بھی پھس پھسے نکلے۔"

"ان سے سب ڈرتے ہیں۔ اور اس پر وہ بڑی نازاں ہیں۔"

"نہیں وہ چھپ چھپ کر روتی ہیں۔ ایسے کہ میں نے بھی آج تک ان کے آنسو نہیں دیکھے اور اپنے زخم چھپاتی ہیں اور جلی کٹی سنا کر جی کی بھڑاس نکالتی ہیں۔"

"پتہ نہیں اسے میاں سے کبھی محبت کی تھی کہ نہیں۔"

"دس بارہ سال تو سنا ہے میاں دیوانے تھے۔ اسی عرصہ میں چودہ کچے پکے بچے پیدا ہوئے۔ بس ہم دو بہنیں اللہ سے بچے۔ تو ان کا بول نصیبہ پھوٹا۔ میاں عام

مردوں کی طرح ادھر اُدھر مونہہ مارنے لگے، اماں عام عورت ہوتیں تو ہائے توبہ کرتیں آنسو بہاتیں بھائیوں کو لپکارتیں۔ مگر اماں کو کسی نے عورتوں کے ہتھیاروں سے مسلح تو کیا نہیں تھا۔ اپنے مزاج کے مطابق غم کا اظہار غصّہ سے کیا۔ جب مہترانی سے قصّہ چلا اور انہیں معلوم ہؤا تو باقاعدہ چوڑیاں توڑیں اور اس دن سے سفید دوپٹہ اوڑھنے لگیں۔"

"اور پھوپھا میاں کو مرنے والا کہنے لگیں۔ بیچارے بڑے سیدھے ہیں۔"

"معلوم ہوتا ہے ابھی اونٹ پہاڑ تلے نہیں آیا۔"

"یہ اونٹ کترا کے نکل جائے ہیں یقین رکھتا ہے۔"

"کسی پر دل نہیں آیا"

"درجنوں پر آیا مگر رو پیٹ کر صبر آگیا۔"

"برا نہ مانتا تم کیسے ادھوری رہ گئیں، تمہاری سب بہنیں تو بڑی مثالی بیویاں ہیں۔ مگر مجھے ڈر ہے کہ تم مثالی بیوی بڑی مشکل سے بن سکو گی۔ اللہ رحم کرے اس بیچارے پہ کیسے جھیلے گا۔ تم جیسی بے پٹری کی دندنانے والی ریل کو!"

"میں بڑی سخت جان ہوں بہرائچ میں ملیریا کی وبا پھیلی سارا گھر روز جوڑی بھوگتا تھا مجھے ایک دن بھی بخار نہیں آیا۔ شاید زہریلے مچھر میرے زہر سے مرگئے۔ بچپن میں مجھے بیمار پڑنے کا بڑا ارمان تھا۔ اس زمانے میں ہر رومینٹک کہانی کا ہیرو ڈاکٹر ہؤا کرتا تھا۔ بس میں بھی سوچا کرتی تھی، اللہ کوئی مرض دے اپنی رحمت کا صدقہ لے کر ڈاکٹر آئے اور مجھ پر عاشق ہو جائے۔ پھر چاہے میں مر بھی جاؤں، صرف اس امید میں کہ شاید وہ ڈاکٹر بھی میرے غم میں صحراؤں کی خاک چھانتا پھرے اور پھر ایک دن میری تربت پر پچھاڑ کر گرے اور دم توڑ دے، پھر میری قبر شق ہو اور حلّہ بہشتی پہنے اپنے سنہرے بال لہراتی نیلی آنکھوں سے آنسو چھلکاتی برآمد ہوں اور ہم دونوں جنت میں ٹہلتے پھریں۔ دودھ اور شہد تو

میرے لئے مضر ہوگا کیونکہ موٹا کرتا ہے۔ ہاں بھنے ہوئے پرند اور تازہ پھل صحت کے لئے انتہائی مفید ہیں ڈائٹنگ میں بھی۔"

اچھا بس بکواس بند، اماں بار بار پہلو بدل رہی ہیں کوئی دم میں آتش فشاں پھٹے گا اور لاوا چھلکنے لگے گا۔

میں نے پھوپھی اماں کے پاس جاکر کہا:

"بڑی بھوک لگ رہی ہے"

"تو مجھے کھالو"

"ارے یہ تو پتہ ہی نہیں تھا کہ آپ کو بھی کھایا جاسکتا ہے۔ خوب" میں نے جھک کر ان کے گال پہ پیار کیا۔

"ام ام...... ڈلیشس بالکل آئس کریم۔ آپ بھی چکھیئے" میں نے خانم صاحب کو بھی مدعو کیا۔

"ارے تیری اماں ڈکار گئی میرے پورے خاندان کو، اب یہ ہڈیاں رہ گئی ہیں سو تو چھوڑ دے" پھوپھی اماں جب جلی کٹی پر اتر آتی تھیں تو عجیب لَے میں بولنے لگتی تھیں جیسے مجلس میں نوحہ خوانی سے پہلے ایک لہراتی ہوئی آواز میں بیان پڑھا جاتا ہے۔ میں نے بالکل ان کے لہجہ کی نقل میں اسی لَے سے کہا۔

"ارے رحیم بیگ کی اکلوتی بیٹی اور تین جغادری بھائیوں کی لاڈلی بہن اور مجھ معصوم بھتیجی کی واحد پھوپھی، چائے ناشتہ نہیں تو غم نہیں، مجھے ہمیشہ ڈائٹنگ کی ضرورت رہتی ہے۔ پانی تو پینے دے گی کہ دریائے فرات پر بھی شمر کی فوج کی ناکہ بندی ہے" میں نے شوکت آپا کی صراحی سے ان کے بیٹھے کے گلاس میں پانی انڈیلا۔

"یہ پانی تو میرے بھائی کا ہے اس پر تو کسی کو اعتراض نہ ہوگا"

"خبردار جو تو نے ہمارا منہ پانی پیا" پھوپھی اماں گرجیں۔ میرے ہاتھ سے گلاس

چھوٹتے چھوٹتے بچا۔ شوکت آپا بتا رہی تھیں کہ ایک دن پھوپھا گرم پانی کی پتیلی غسل خانہ میں لے جا رہے تھے۔ پھوپھی اماں اتنی زور سے دہاڑیں کہ ہاتھ سے پتیلی اُچھل کر پھوپھی اماں پہ گری، پوری پنڈلی اُبل گئی۔ مگر وہ کہتی ہیں کہ مرنے والے نے جان بوجھ کر میرے اوپر کھولتا پانی ڈالا۔ اگر اس وقت کڑکڑاتے جاڑے میں بھی بدحواس ہو کر ان پر ٹھنڈا پانی ڈال دیتی تو مزہ آجاتا۔

پھوپھی اماں نے ڈھیر سارا ناشتہ منگایا جو تیار رکھا تھا۔

"نگوڑی، ذرا بھی شرم نہیں۔ میں نے تو اس لئے دے دیا کہ خانم صاحب بھی منہ پھلا کے بیٹھ جائے گی۔"

میں ناشتہ کرنے لگی۔

"ارے تجھے ذرا بھی شرم نہیں، کچھ تو تکلف کیا ہوتا۔"

"ہم مغل تکلف کے عادی ہوتے تو ہندوستان فتح کر کے حکومت نہ کر پاتے بیٹھے تکلف نہیں کرتے اور پھر مجھ میں دور سے دو چار بوندیں حضرت سلیم چشتی کے خون مبارک کی بھی پائی جاتی ہیں۔ اس لئے کھائے لے رہی ہوں کہ برکت سے آپ کے گناہوں کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔"

پھوپھی اماں بھونچکی سی مجھے تکنے لگیں۔ حشمت آپا نے زور کا قہقہہ لگایا۔

"اماں تو بھیگی بلی بنی رہتی ہیں۔ یہ کترنی سی زبان کہاں سے ملی۔"

"ہمارا کوچوان بڑا باتونی تھا۔" پھوپھی کہا کرتی تھیں، ارے نصرت خانم بدچلن ہے میرا بھائی تو نامرد ہے، یہ کالے پیلے بچے کوچوان اور گراسٹکوں کے ہیں پھوپھی فوراً سمجھ گئیں۔

"نہ جانے کس اللہ کے بندے کا نصیبا پھوڑے گی۔"

"کاش آپ کا کوئی بیٹا ہوتا صفا اڑا لے جاتی۔"

"اری تجھے ذرا بھی شرم نہیں۔"

"جس نے کی شرم اس کے پھوٹے کرم۔"

"اسے غارت ہو۔"

"آپ کی بد دعاؤں کا نتیجہ ہے کہ میں اپنی ماں کی کوکھ سے جنمی۔ آپ اماں کو بہت کوستی تھی۔ چلئے آپ کا ایک کوسنا تو لگا۔ اور پھر کوچوان۔"

"خبردار، جوتی سے منہ مسل دوں گی۔ نصرت خانم میری دشمن سہی مگر میرے سگے پھوپھی زاد بھائی کی بیٹی ہے۔ اور میرا بھائی شیر تھا۔ بڑے بڑے سورماؤں کی اس کے سامنے پھونک سرکتی تھی۔ ارے ایک دن فتو پہلوان نے مستقیم کو سربازار دھول جما دی، بس میرے شیر نے . . . .؟"

"اماں یہ قصہ تو سنا چکی ہو" خانم صاحب نے لقمہ دیا۔

"ارے بس تو چپ رہ۔ بڑی مغلانی بنتی ہے۔ تولہ بھر کا خصم تو سنبھلا نہیں۔"

ایک دم خانم صاحب کا چہرہ سفید پھر ہلکا نیلا پڑ گیا۔ جیسے ذہن کا سارا زہر اچھل کر چہرے پر پھیل گیا۔ میں لڑ پڑی۔

"ارے تو اپنے اتنے حسین نوجوان پر سر روز گا دو چار سو گھونٹ کمبخت شوہر کی کرسی کم مٹی پلید کی، انسان سے بجر بٹو بنا دیا۔ سنتے ہیں پولیس میں اُن کے کارناموں کی دھوم تھی۔" میں نے بات میں کلی پھندنے لگانے شروع کئے۔ "اپنے انہیں مرگھلا چوہا بنا دیا۔ انہیں دھمکاتی ہیں۔" جب پھوپھا میاں سے لڑائی ہوتی تھی تو وہ ہمیشہ کہتی تھیں۔

"ارے اٹھائی گیرے، اوقات میں رہ کوئی نگوری ناٹھی نہیں تین بھائیوں کی آنکھ کا تارہ لاڈلی بہن ہوں۔ انہیں بھنک بھی پڑ گئی تو بس دین دنیا سے جائے گا... بڑا اللہ والا ہے وہ تیری عاقبت خاک میں ملا دے گا۔ چوبیس گھنٹے عبادت

کرنا ہے چاہے تو عرش کے کنگورے ہلادے اور منجھلا یعنی میرے ابا مجسٹریٹ ہے ساری عمر کو چکی پسوادے گا۔ اور تیسرا ہے چھٹا ہوا دس نمبری بدمعاش تین قتل کر چکا ہے۔ آؤ دیکھے گا نہ تاؤ آنتیں نکال کر ہتھیلی پر دھر دے گا۔"

"کیا نام وہ" پھوپھا کا تکیہ کلام کیا نام تھا وہ پھوپھی اماں کی گولہ باری سے نروس ہوتے تھے۔ انہوں نے اس قسم کی مارتے خاں عورت خواب میں بھی نہیں دیکھی تھی۔ ساری عمر بھلی بیویوں سے واسطہ پڑا تھا۔

"کیا نام وہ ...... گھر میں سے جو ہیں وہ سڑن ہیں" وہ انہیں پاگل سمجھ کے بہت سے بچے مرے تو اُن کا ضرور غم سے دماغ الٹ گیا ہوگا۔

"مگر ویسے تو ہوش و حواس میں ہیں" لوگ ان سے کہتے۔

"کیا نام وہ۔ دیوانہ بکار خویش ہوشیار" وہ دھیمے سے فیصلہ کرتے ان سے لوگ زیادہ خوش نہیں تھے۔ جورو کے غلام خواہ سیلف ڈیفنس میں بھی ہوں۔ مردانگی کے نام پر سیاہ داغ ہے۔

"اور بڑے ابا سے تو ان کی بالکل کٹی ہو چکی تھی۔ بڑے ابا مصطفےٰ کمال پاشا کے پرستاروں میں سے تھے۔ کسی زمانے میں جب انہوں نے ترکی میں انقلاب برپا کیا تھا انہیں پوجنے لگے تھے اور ہر سانس میں خدا کے بعد انہیں کا نام لیتے تھے کچھ اتاترک کے بارے میں پھوپھا میاں کو حیرت انگیز بات سنا رہے تھے۔

"کیا نام وہ کون مصطفےٰ کمال پاشا" انہوں نے سہم کر پوچھا۔

"تم اتاترک کو نہیں جانتے" بڑے ابا چت ہو گئے۔

"کیا نام نہیں تو ...."

"تو میں تمہیں نہیں جانتا" بڑے ابا منہ پھیر کر چل دیئے اور پھر اُن کی صورت نہیں دیکھی۔ پھوپھا میاں بھونچکے رہ گئے۔ شاید بچوں کی موت سے پھوپھی اماں

نازک کیس بن گئی ہوں گی۔ مگر جراثیم پورے خاندان میں ورثہ کے طور پر پہنچے ہوں گے۔ ویسے اصیل مغل کی پہچان یہی ہے کہ محور سے دماغ تھوڑا بہت ضرور کھسکا ہوا ہو۔

"پھوپھی اماں رات کو آپ نے ٹال دیا۔ بتایئے ناخانم صاحب کی شادی ایک چپراسی سے کیوں کر دیا جبکہ ان کے قدموں میں بڑے بڑے رشتہ پڑے ہونا چاہیئے تھے۔"

پھوپھی اماں نے لمبی سانس بھری۔

"کیوں کھرنڈ اکھیڑتی ہے لہو بہنے لگے گا۔ تجھے معلوم ہوگا کہ مسرت جہاں کی شادی میری مرضی کے خلاف ہوئی۔ لاکھ منع کیا مگر وہ تو دیوانی ہو گئی تھی عمر بھی کیا تھی مشکل سے سولہواں لگا ہوگا۔ ارے خانم صاحب تو اس کے سامنے چماری ہے۔ جب پیدا ہوئی تھی تو میں بیٹھی گھنٹوں تکا کرتی تھی جی ہی نہیں بھرتا تھا۔ اللہ نے کرشمہ میرے آنچل میں ڈال دیا تھا۔ کیا بس لگڑی کھیرے کی طرح بڑھی جسامت سے بارہ تیرہ سال بڑی تھی۔ بیچ میں تین جاتے رہے۔ اماں خانم ہماری پھوپھی کی اب تب ہو رہی تھی۔ سارا خاندان جمع تھا تمہاری اماں اور ماموں بھی دونوں آن دھمکے پھر خدا جانے کیا ہوا۔ بڑھیا ایک دن اُٹھ کر بیٹھ گئی اور بولی کہ قاضی کو بلواؤ۔ ہے ہے بڑھیا کا چتیا پگھل گیا۔ اب ملک الموت سے دو بول کا وقت آ رہا ہے اور یہ قاضی بلوا رہی ہے پتہ چلا کہ رات کو ظفر حسین، خدا کرے اس کی قبر میں کیڑے پڑیں، ڈھائی گھڑی کی آئے، اور مسرت جہاں بڑھیا کے سرہانے بیٹھی تھی کہ ہم سب تھک کر سو رہے تھے۔ بڑھیا کسی طرح مرنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔"

"وہ تو ماموں کی شادی کے بیس سال بعد مریں۔"

"اور کیا، مگر گانٹھ رہی تھی۔ میری بچی کو پھانسنے کے لیے جال بچھایا گیا تھا۔ بس نکاح ہو گیا، میں نے مسرت جہاں سے کہہ دیا تیرا کالا منہ غارت ہو۔ تمہاری

اماں گھی کے چراغ جلانے لگیں اور بھائی بھاوج کو لے کے چل دیں۔ میرے بیٹے پر کو دوں دلہنے کے لئے بڑی دھوم سے ولیمہ کیا۔ تو یہاں سے میرے گھر پر عذاب نازل ہونا شروع ہوا۔

میں سوچ رہی تھی بڑے ماموں کتنے پیارے ہیں۔ ہم سب پر جان چھڑکتے ہیں، بارہ برس انہوں نے بیوی کی موت کا سوگ منایا۔ وہ تین بچے چھوڑ کر جا چکے ہیں زہرباد پھیل جانے سے فرشتہ ہو گئیں معمولی بخار، دق میں بدل گیا اور پھول کی طرح مرجھا گئیں۔

"اُس وقت میں پندرہ برس کی بھی نہیں تھی"، خانم صاحب بولیں۔

"ہاں مگر ظفر کی نظر میں تو کھوٹ تھا"

"شاید آپا کو وہم ہو گیا تھا۔ ظفر بھائی مجھے ہنسی میں چھیڑا کرتے تھے، وہ اُن کی بیماری سے بہت خائف تھے اور پاس نہیں بیٹھتے تھے۔ آپا کا خون کھولتا تھا"

"حشمت جہاں کے باپ کا خون جوش مار رہا ہے۔ میرا دودھ تو تو نے زہر جان کر اگل دیا۔ ظفر کی نظر بُری تھی۔ اس کے دل میں کھوٹ تھی تو دیوانی کیا جانتی ہو گی"

خانم صاحب چُپ ہو گئیں۔

"میری بچی کا کفن بھی میلا نہ ہوا ہو گا کہ ظفر حسین نے حشمت جہاں کو مانگ لیا۔ میری نامراد بچی، اُس نے مجھ سے ہاتھ جوڑ کر وعدہ لیا تھا کہ حشمت کو ظفر سے بیاہا گیا تو قبر پھاڑ کر نکل آئے گی۔ میں نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھ کر قسم کھائی کہ حشمت جہاں کو زہر دے دوں گی پر ظفر کو ہرگز نہ بیاہوں گی"

"تو آپ نے زہر دے دیا" میں نے منہ دہرایا۔

"ہاں اپنی جان کے ٹکڑے کو، زندگی کی اس کو، اندھیری رات کی آخری کرن کو، میں نے پیروں تلے مسل ڈالا۔ خاک میں ملا دیا۔ پھول کو اژدہے کے منہ میں جھونک دیا۔ بھسم کر دیا۔ اور اُس آنچ میں ساری عمر سلگتی رہی ہوں جھلستی رہی ہوں۔ ایک الاؤ ہے جو میرے دل و دماغ میں بھڑک رہا ہے۔ زہر ہے جو میری نس نس میں رچ گیا ہے" پھوپھی اماں بین کے انداز میں کہہ رہی تھیں آگے پیچھے جھول رہی تھیں جیسے وظیفہ پڑھ رہی ہوں۔

"کوئی اور نہ ملا" میں نے لقمہ دیا۔

"جو چٹ منگنی اور پٹ بیاہ پہ تیار ہو جاتا۔ ارے میرا کوئی نہ تھا، تمہارے پھوپھا رات گئے آتے اور صبح دم نکل کھڑے ہوتے میں نے جھک مار کر ان کی منتیں کیں مگر کیا نام کرتے رہے۔ اور پھر یہ تو تمہیں معلوم ہو گا کہ حشمت جہاں تمہارے نسیم بیگ میرے بڑے بھائی (جو اس وقت شوکت سے شادی کر چکے تھے) کی ٹھیکرے کی مانگ تھی۔ جب ظفر اور مسرت کا قصہ نہیں ہوا تھا۔ میرے بھائی اور بھاوج مجھ پر جان چھڑکتے تھے۔ سارا کنبہ ایک تھا۔ کیا خوشیاں منائی گئی نہیں۔ اللہ یاد کرتی ہوں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے"

"پھر منگنی توڑ دی؟"

"سنتی جاؤ، ظفر حسین نے کہا حشمت کی شادی ہو گی تو مجھ سے ورنہ میں دولہا کو گولی مار دوں گا۔ بات چھپی تھوڑی رہتی ہے، جب میں بے حیا بن کر بھائی کو لکھا کہ اپنی امانت سنبھالو کہ میری چھاتی کا بوجھ کم ہو، آگرہ اور پھر یہ محلہ مائی تھان، خدا غارت کرے اس پہ بجلی ٹوٹے ظفر حسین کی دھمکی گلی گلی مشہور ہو گئی میں نے لکھا"

"جانتی ہوں اماں نے کیا لکھا ہو گا۔ حکم شاہی نازل کیا ہو گا"

"ارے تو ہیں نصیبوں جلی بیٹی کی ماں کس منہ سے کہتی کہ میری بیٹی پہ ایک غنڈہ

دانت لگائے بیٹھا ہے جو تمہارا چھیتا سالا ہے۔ پہلے تو بھائی نے کہا ابھی لڑکا پڑھ رہا ہے سترہ اٹھارہ برس کا بے قابو لڑکا اس کی شادی کرنا غلطی ہے تم اپنی بیٹی کی بیٹھک چال نہیں ڈال سکتیں۔ پڑھائی سے جان چراتا ہے۔ تم بیٹی کی شادی جہاں چاہو کھو بیں نے کہا تم نکاح تو کر لو۔ مگر اتنے میں ظفر کو پتہ چل گیا اس نے بہن کو لکھا کہ بیسم میرا پیارا بھانجا ہے مگر میں اس کو گولی مار کر خودکشی کر لوں گا۔"

"اُف ماموں تر پورے ...... تو یہ" میں نے منہ میں آئے لفظ چبا ڈالے۔

میرے تو حواس گم! میری نامراد بچی، ہائے وہ قبر میں بھی تڑپتی رہے گی۔ ان دنوں میں رات رات بھر جاگ کر ٹہلا کرتی تھی، ایک میں اور ایک بیٹی۔ ظفر حسین نے دھمکی دی تھی کہ حشمت جہاں کو اٹھوا لے گا۔ میں رات بھر جلے پیر کی بلی کی طرح گھر میں چکر لگایا کرتی، ذرا سا کھٹکا ہوتا تو دل دھائیں دھائیں کرنے لگتا۔ نیند آتی مگر منہ پر پانی ڈال کر ٹہلنے لگتی۔ یا اللہ ان راتوں میں میں نے کتنے میل کے چکر لگائے ہوں گے۔ کبھی اتنے زور سے نیند آجاتی کہ کھڑے کھڑے آنکھیں بند ہو جاتیں اور میں سو جاتی پھر جب ہوش آتا جب میں وہیں ڈھیر ہو جاتی۔ کبھی جی چاہتا حشمت جہاں کا گلا گھونٹ دوں اور پل بھر کے لئے سو جاؤں۔ پھر اس کے سوگ میں نیند سے چھٹکارا مل جائے گا۔ یہ نہ سمجھنا کہ میں نے کوشش نہیں کی۔ بھابی کی طرف سے ٹکا سا جواب ملا تو کئی دن حواس گم رہے۔ تمہاری نانی زندہ تھیں اور بیٹی کے ساتھ ہی رہتی تھیں۔ چھوٹا بھائی فرحت حسین بھی تمہاری ماں کے ساتھ بیاہ کے دن سے رہتا تھا۔ تمہاری نانی بیوہ ہونے کے بعد سے بیٹی کے پاس ہی رہتی تھیں۔ انہوں نے تمہاری ماں کے دل میں بھائیوں کی محبت کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی۔ انہیں دونوں بھائی اولاد سے زیادہ پیارے تھے۔ پھر بھی میں نے فرحت کو بلایا تھا وہ ایک بار وہ آیا تھا تو حشمت جہاں پر جس انداز سے اس کی نگاہیں پڑی تھیں۔ ان کا سہارا لے کر میں نے چپکے سے فرحت کو بلایا اور بے حیا بن کر

کہا حشمت سے بیاہ کر لو، وہ سر سے پیر تک کانپنے لگا اور زار و قطار آنسو بہنے لگے۔ میں نے کہا کیا بات ہے میاں، کہنے لگا میری ایسی قسمت کہاں جو آپ جیسی لڑکی ملے۔ میں مجبور ہوں بھائی صاحب من موجی ہیں۔ وہ کہتے ہیں حشمت سے جو شادی کرے گا، اُسے گولی مار کر خود پھانسی پر چڑھ جائیں گے۔ میری ماں دو بیٹوں کی موت پر کیسے زندہ رہیں گی۔ میں نے ماں کے لئے کبھی کچھ نہیں کیا، اتنا بڑا غم بڑھاپے میں کیسے دے سکتا ہوں۔ فرحت کی چند ماہ بعد تمہاری اماں نے شادی کر دی۔"

"یا خدا قہاری اور جباری تو نے بندوں کو کیوں سونپ دی۔"

"میں نے پھر کوشش کی اور اسحاق حسین کو بڑی ترکیبوں سے بلایا۔ اسحاق سات آٹھ جماعتیں پڑھ کر آوارہ گردی میں پڑ گئے تھے۔ میں نے بے حیا بن کر شادی کی درخواست کی۔ مگر اسحاق کی سٹی گم ہو گئی۔ وہ میرے بھائی کے ٹکڑوں پہ پلا تھا۔ بھابی کا حکم کیسے ٹال سکتا تھا۔ ظفر کی دھمکیاں زور باندھ رہی تھیں میں نیم پاگل ہو چکی تھی۔ گرمی کھلس میں میں حشمت جہاں کو اندر کال کوٹھری میں بند کر کے بڑا سا تالہ لگا دیتی، دروازے کے سامنے پلنگ بچھا کر سو جاتی۔ حشمت مچھروں والی کال کوٹھری میں گرمی میں ابلتی رات رات بھر رو کر بتاتی۔ اللہ ظفر حسین، خدا تمہیں سمجھے کتے کی موت مرو۔"

ظفر حسین جو شوکت آپا کے باپ اور میرے بڑے ماموں تھے۔ ہمیں اُن سے گھن آرہی تھی۔ انہوں نے بارہ برس سوگ منا کر دوسری شادی کر لی تھی۔ نئی ممانی بڑی معصوم اور اللہ والی تھیں۔ ہر وقت تلاوتِ قرآن اور نفلیں پڑھا کرتی تھیں۔ کتنی محبت کرتے تھے ماموں اور میرا تو خاص طور پر بہت ہی خیال رکھتے تھے برسوں بیتی ہوئی ان کی زیادتی ایک لطیفہ بن چکی تھی۔ ہمیں کوئی اندازہ نہیں تھا کہ ہماری پیدائش سے پہلے ماموں نے کیا گل کھلائے تھے۔

"اب میرے لئے بس ایک راستہ رہ گیا تھا لیاقت تمہارے پھوپھا کا سگا

بھانجا کہیں چپراسی تھا نام کو مگر خدا جانے کیا دھندہ کرتا تھا، لوگ کہتے ہیں گوالبار میں عورتوں کی دلالی کیا تھا - باپ بچپن میں مر گئے، ماں نے نہ جانے کیا دکھ جھیل کر بیٹے کو پالا تھا - ہڈی میں کھوٹ نہ تھا - لیں میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، اُسے بلا کر چٹ نکاح کر دیا "

"اور ایک رات کے بعد "

"میں نے اُسے نکال دیا - وہ موا درندہ تھا - میری کچی کلی کے دل میں اس کی دہشت بیٹھ گئی - میں نہ لیتی تو کلائی کی رگ کاٹ ڈالتی - تب تم فیصلہ کر و بی بی کہ میں نے کہاں بھول کی تھی "

مجھے زندگی میں پہلی دفعہ احساس ہوا کہ میری پھوپھی کتنی دکھی ہیں - انہیں کسی نے دنیاداری نہیں سکھائی زنانہ سیاسی ہتھکنڈے نہیں سکھا - ئے -

میری ماں ایک بھرپور عورت تھیں ،

اور پھوپھی اماں ادھوری عورت تھیں ،

رات کو میں اور خانم صاحب سر جوڑ کر باتیں کرتے رہے ۔

"آپ طلاق کیوں نہیں لیتیں !"

"ہندوستان کے علماء نے خلع کو مسلم لا میں شامل نہیں کیا "

"وہ کیسے ؟"

"جب انگریز حکومت جم گئی تو قانون سازی کے وقت ہر فرقہ کے رہنماؤں سے رائے لی گئی - ہمارے عالموں نے خلع یعنی عورت کو طلاق لینے کے حق کا کوئی ذکر نہیں کیا - اس کے بعد بھی کسی نے حق طلاق کی مانگ نہیں کی - روشن خیال والدین حق طلاق الگ سے لکھوانے کے حق میں تھے - مگر شادی کے موقع پر حق طلاق پر لوگ ناک بھوں چڑھاتے تھے - خود میرے بھائی جسیم نے عین شادی کے دن کہہ دیا حق طلاق

کو وہ منحوس سمجھتے ہیں - بیٹی والے مجبور ہو گئے - خواجہ عبدالمجید خواجہ فیملی کے روشن خیال بزرگ تھے - حق طلاق پر زور دیتے تھے - وہ خود نکاح پڑھاتے تھے اور اگر لڑکے حق طلاق پر تیار نہیں ہوتے تھے تو وہ نکاح نہیں پڑھاتے تھے، کم از کم علی گڑھ میں تو انہوں نے حق طلاق کے لئے بڑی جد و جہد کی اور بہت سے خاندانوں میں حق طلاق پر اصرار ہونے لگا ۔

دوسری رات رہنے کی ضرورت نہ پڑی اور ننھے بھائی آ کر ہمیں پنچہ شاہی لے گئے - پہلے تو میں نے اُن سے ہی اُلجھنے کی کوشش کی کہ وہ وکیل ہیں - خانم صاحب کی طلاق کی کوشش کیوں نہیں کرتے -

" یہ علت ہے" وہ حسب عادت ٹال گئے - میں بکتی رہی اور وہ بالکل بے توجہ گھٹنا ہلاتے رہے مسکراتے رہے -

" میں گھوڑی والا گھر بیچنا چاہتی ہوں - اُس کے کاغذات آپ کے پاس ہیں " میں نے عاجز آ کر بات پلٹی -

" ہاں ہیں ، مگر کیوں بیچنا چاہتی ہو "

"ٹیچر ٹریننگ کا کورس کرنے انگلینڈ جاؤں گی "

" کیا کرو گی ٹریننگ کر کے ؟"

"نوکری کروں گی "

"کیوں ؟"

"ارے ، آپ کیوں وکالت کرتے ہیں ؟"

"غلطی کرتے ہیں ہم تو "

"تو ہم بھی غلطی کریں گے "

"زبردستی ہے کچھ، ہم نہیں کرنے دیں گے تمہیں غلطی - تم ہماری پیاری بہن

ہو۔" ننھے بھائی جی جلانے میں ماہر تھے۔ ان سے بحث کرنا ناممکن تھا۔ پھر مسکرا کر بولے۔

"وہ گھر ہم نے تو بیچ بھی دیا۔"

"کیسے؟ میرے دستخطوں کے بغیر؟"

"تمہارے دستخط ہم نے خود کر دیئے۔"

"یہ تو بے ایمانی ہوئی۔"

"قطعی بے ایمانی ہوئی۔"

"کیوں کی آپ نے بے ایمانی۔"

"ہماری مرضی۔"

"آپ پر مقدمہ چل سکتا ہے۔"

"ضرور چل سکتا ہے۔ مگر ہم نے تو سب پیسے بھی خرچ کر دیئے۔"

"کاہے میں خرچ کر دیئے؟"

"کچھ کھا ڈالے کچھ شوکت کو دے دیئے۔ یہ بچہ وچہ دینے والی ہیں اور سو نے کے کڑے بنوائے ہیں۔

دکھاؤ شوکت اپنے کڑے، پتہ ہے ہم نے خود بنائے ہیں۔ آٹھ تولے کے کڑے۔"

وہ اس سادگی سے بولے کہ کوشش کے باوجود مجھے غصہ نہ آسکا۔

"آپ مقدمہ ہار جائیں گے تو؟"

"تو کیا؟"

"جیل جائیں گے۔"

"اور کیا۔"

میری سمجھ میں نہیں آیا کیا کہوں۔ غصہ بھی آرہا تھا، ہنسی بھی آرہی تھی۔ ننھے

بھائی بڑی میٹھی میٹھی نظروں سے مجھے دیکھ کر شرارت سے مسکرا رہے تھے۔ مجھے خاموش دیکھ کر بولے۔

"ولایت جانا چاہتی ہو؟"

"ہاں۔"

"تو چلی جاؤ۔"

"مکان تو آپ نے مار لیا، اب کیسے چلی جاؤں۔"

"تیرنا آتا ہے؟"

"کچھ یوں ہی سا۔ علی گڑھ میں سوئمنگ پول میں دو چار دن چھپ چھپ گیا تھا۔"

"ایسا کرو ہمارے ساتھ روز جمنا میں تیرنے چلو، ایک ہفتہ میں فرآٹے بھرنے لگو گی۔"

"اونہہ تیرنا سیکھنے سے اور ولایت جانے سے کیا تعلق؟"

"ارے بھئی مزے سے تیرتی چلی جاؤ۔"

"اور سامان، ننھے میاں آپ بھی کیا باتیں کرتے ہیں۔" شوکت آپا بولیں۔

"سامان کی کیا ضرورت ہے؟"

"لو بھئی سامان کی ہی ضرورت نہیں۔ آپ تو بے سمجھے بوجھے بات کہہ دیتے ہیں۔" شوکت آپا چڑھ گئیں۔ "سردی میں ٹھٹھر کے مر نہ جائیں گی۔ سوئٹر، گرم کوٹ کپڑے۔"

"ارے کچھ مشکل نہیں۔ موم جامے کے تھیلے میں سب ٹھونس کے ایک رسی سے کمر سے میں باندھ لینا۔"

"اور مچھلیاں، یہ بڑی بڑی وہیل مچھلی، ہاتھی کو بھی ہڑپ کر لے، کیا باتیں کرتے ہیں ننھے میاں۔"

"ارے ایک لمبا سا بانس لے کے پانی پر پھٹکارے چلو مچھلی پاس نہیں پھٹکے گی۔"

"پھ، پھوپھو۔" نعیم ان کے صاحبزادے ہکلائے "ہم بھی چلیں گے ولات۔"

"ہاں بھئی تم بھی جانا، مگر گدھے پہلے تیرنا سیکھو۔"

مجھے معلوم ہو گیا کہ میری کھنچائی ہو رہی ہے۔ ننھے بھائی نے کبھی مجھ سے سنجیدگی سے بات نہیں کی میں نے جل کر ٹاپک بدل دیا اور خانم صاحب کے ساتھ جو ظلم ہوا اُس کا ذکر چھیڑ دیا۔

"اتنا بڑا خاندان اور ایک لڑکی پر کیا بیت گئی کسی کے کان پر جوں نہ رینگی۔"

"اُرے شوکت۔" ننھے بھائی ایک دم چونک پڑے۔ "نعیم بہت سر کھجا رہا ہے۔ دیکھو اگر ایک بھی جوں پڑ گئی تو ہم اس کا سر منڈوا دیں گے۔" ننھے بھائی نے ایکدم پٹڑی بدل لی۔

"ارے واہ بے کار ہیں سر منڈا دیں گے۔ منڈ کر تو دیکھے۔"

"زیادہ گڑبڑ کرو گی تو ہم اپنا بھی سر منڈا دیں گے۔"

"ہوش میں رہنا، خواہ مخواہ منڈا دیں گے۔"

"تو اس کے سر میں ابھی کنگھی کرو۔"

"اب اس وقت نہ جانے کنگھی کہاں پڑی ہو گی۔ کل ڈھونڈ دوں گی۔"

"ابھی ڈھونڈو ورنہ ہم ابھی سر منڈاتے ہیں۔"

"بہن تم ڈھونڈ دو۔ میرا تو سر چکرا رہا ہے۔"

"چاہا کہہ دوں میرا خود ننھے بھائی نے جو چکر پھیریاں دی ہیں ان سے سر چکرا رہا ہے۔" ننھے بھائی سے الجھنا بے کار ہے۔ ایسے چھوٹے چھوٹے معصوم بے معنی جواب دیتے کہ کہیں کی بات کہیں لے جانے میں ماہر، گھنٹوں بے معنی

بحث کر لیجیے۔ جلی کٹی سنا بیٹھے، جو نوٹس لیں۔ ننھے بھائی سے کبھی کوئی نہیں جیت سکتا وہ کسی بات کا جواب سنجیدگی سے نہیں دیتے تھے۔ عجیب مٹی کے بنے ہوئے۔ مگر جودھپور جا کر میں نے بڑا ہنگامہ مچانے کی کوشش کی اور تو اور ایک دفعہ بڑے ماموں سے پوچھ لیا۔

"بڑے ماموں آپ حشمت آپا سے شادی کرنا چاہتے تھے۔"

بڑے ماموں نے مجھے غور سے دیکھا جیسے میرے سر پر سینگ نکل آئے ہوں۔ اماں سناٹے میں رہ گئیں۔

"ایسے بھی دل آگیا ہو گا۔" شمیم نے بڑی سنجیدگی سے لقمہ دیا۔ ماموں نے جیسے سُنا ہی نہیں، اس گھی کے پیسے کا ذکر چھیڑ دیا۔ جو وہ سوائی مادھوپور سے اماں کے کہنے پر منگوا رہے تھے۔

پیسے دوں، اماں بولیں۔

ذرا سوچیے آپ کوئی شاندار بھاشن تیار کر کے سبھا میں جائیں اور سامعین کبڈی کھیلنے لگیں تو آپ کے دل پر کیا گزرے گی۔

"نہیں آپا بعد میں لے لیں گے۔"

"کیوں بڑے ماموں دل آگیا تھا نا؟" شمیم نے بات بڑھانے کی کوشش کی وہ قطعی بات کو مضحکہ خیز رنگ دینے کی کوشش پر تلا ہوا تھا۔

"کھانا تو اچھا ہوتا، مائی بھان کا۔" ماموں نے بڑی خوش مزاجی سے پوچھا۔

"ہاں۔"

"اور گاجر کا حلوہ، ناشتہ پر کھایا ہو گا۔"

"مزے دار تھا مگر خانم صاحب کی زندگی ....."

"یہ تم نہیں گاجر کا حلوا بول رہا ہے۔" ماموں نے نہایت خوش مزاجی سے

کہا اور ابا کی مزاج پرسی کے لئے باغیچہ کی طرف مُڑ گئے۔

"یہ بھی کوئی طریقہ ہے بڑوں سے بات کرنے کا؟" اماں بڑبڑائیں۔

"مگر خانم صاحب کی زندگی ......"!

"اسے بس کچھ پرواہ نہ کرو۔ بی۔ اسے کیا پاس کر لیا کہ دھونس جمانے لگیں۔"

"لیکن میں ......"

"اے دلہن، ہانڈی جل کے خاک ہو گئی" اماں نے ایک دم پٹڑی بدلی۔

"مگر آپ نے بڑے ماموں کا ساتھ دیا۔"

"ہاں دیا۔"

"کیوں؟ جبکہ ......"

"ہماری مرضی، کیا تمہاری دھونس ہے؟ بیگم جب کما کے کھلانے لگو تب جوتیاں مارنا۔"

"اُفوہ مگر۔"

"تم نے میری کبھی سُنی، جو دل میں آیا کیا۔"

"میں نے ....."

"دوپہر ہمارے پُھلکے کیوں لینے بیٹھ گئیں۔ حواسوں میں رہو، آئندہ کبھی ظفر کے منہ لگیں تو اچھا نہ ہوگا ..... اے دُلہن، گوشت گل گیا ہو تو گھیاں ڈال دو۔"

"لعنت ہے۔ بھئی یہ اُلّو کی پٹھی گھیاں روز پک جاتی ہیں۔" شمیم روہانسے ہو گئے۔

"ارے واہ یار، اردی گوشت اس پر گرم مصالحہ چھڑکا ہوا اور نیمبو، کیا کہنے" مجیب بولے۔ بڑی آپا کے بڑے بیٹے بھانجے جوجو میرے چھوٹے بھائی سے چند ماہ چھوٹے تھے۔

"یار تو نرا ایچڑ ہے۔ گھیا کھا کر اور چیکو ہو جائے گا اور جوّو کی جان کو لاگو ہو جائے گا۔

جمّو یعنی جمیلہ چھوٹے ماموں فرحت حسین کی چھوٹی بیٹی تھیں۔ جمیلہ سے کافی عرصہ سے لگاؤ تھا جو خطرناک عشق کی طرف بڑھ رہا تھا، ممانی جان اس چکر کے سخت خلاف تھیں۔

میرا دل خواہ مخواہ بیٹھا جا رہا ہے۔ کیسے بے حس ہیں ہم لوگ خانم صاحب کے میرے دل میں اٹھ رہی تھیں کسی کو ان سے دلچسپی نہیں تھی۔

عظیم بھائی کا خط آیا تھا کہ جاورہ فوراً آ جاؤ۔ وہ ریاست جاورہ میں چیف جج ہو گئے تھے اور بڑے زور شور سے بلا رہے تھے۔ یوں ویسے بھی ہمیشہ چھٹیاں ان کے ہاں گزارا کرتی تھی۔

میں نے اپنا مختصر سا سامان سمیٹا اور جاورہ پہنچ گئی۔ میں نے تار دے دیا تھا۔ اسٹیشن پر پانچوں بچے مع دُلہن بھابی کے اور جاورے میں امّاں کے میکہ کے رشتہ دار موجود تھے۔ مجھے بغیر برقع کے دیکھ کر سٹپٹا گئے۔ چچا سرفراز تو مُڑ کر ایک دم بھاگ کھڑے ہوئے۔

عظیم بھائی خاندان سے بچھڑ کر بڑے اکیلے ہو گئے تھے۔ انہوں نے ننھے بھائی کو بلانے کی انتھک کوشش کے بعد انہیں ریاست کے ریونیو سکریٹری کے عہدے پر چپکا ہی دیا۔ نواب صاحب ان کی بہت مانتے تھے۔ اور بس ننھے بھائی دو چار دن میں آنے ہی والے تھے۔

منے بھائی کی صحت بہت اچھی ہو رہی تھی۔ رات میں دو چار بار ہی کھانستے تھے ایک وسیع بنگلہ ملا ہوا تھا۔ کافی بڑا باغ تھا۔ دلہن بھابی بہت خوش تھیں۔ میری بڑی خاطر کرتی تھیں۔ بچے بھی مجھ سے ہمیشہ چپٹنے کے عادی تھے۔ ان کے چھ بچے تھے۔ نمبر دو بیٹی مدحت کو انہوں نے بڑی بہن کو گود دے دیا تھا۔ باجی کے جیٹھ کی بیٹی تھیں وہی انہیں بیاہ کر لائی تھیں۔ باجی کے اولاد نہیں تھی۔ انہوں نے ابّا کے اچانک چلے جانے کے بعد مجھے سنبھالا تھا۔

جاورہ میں میری آمد کی دھوم مچ گئی ۔بی۔ اے اور وہ بھی مسلمان لڑکی، یہی معجزہ تھا وہاں تو دو چار ہی گریجویٹ تھے اور ان میں اکثریت ہندوؤں کی تھی ۔حرت ہیڈ ماسٹر بی۔اے بی۔ ٹی تھے۔

نواب صاحب میری آمد سے بہت خوش تھے اور بڑی تیزی سے مجھے جاورہ میں کھپانے کے جتن ہونے لگے۔

شام کے چار بجے ہوں گے یا شاید ساڑھے چار کہ بڑے زور سے گھنٹی بجی نوکر نے دروازہ کھولا اور ہیبت زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔

"کون ہے ؟"

"پولیس !" محلے میں کہیں چوری ہو تو نوکر ہی ٹٹولے جاتے ہیں۔

"پولیس ؟" شاہد ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔

"جی ہاں !" نوکر تھر تھر کانپ رہا تھا۔ "مگر صاحب میں نے کچھ نہیں کیا۔ قسم سے صاحب"

"کیا قصہ ہے ؟" شاہد نے دروازے کے پاس جا کر پوچھا۔

"سمن ہے"

"سمن ؟ مگر ...... خیر لائیے"

"سوری آپ کو نہیں دے سکتے"

"مگر ..... کیسا سمن ..... اور کس کا سمن ؟"

"عصمت چغتائی کے نام ! انہیں بلائیے" نوکر کی جان میں جان آئی۔

"مگر یہ تو بتائیے ....."

"آپ ان کو بلائیے ۔لاہور سے سمن آیا ہے"

میں سیما اپنی دو مہینہ کی بچی کا دودھ بنا کر بوتل کو ٹھنڈا کر رہی تھی "لاہور سے سمن ؟" میں نے بوتل ٹھنڈے پانی میں ہلاتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں بھئی ۔لاہور سے آیا ہے" شاہد جھنجھلا گئے۔

میں ہاتھ میں بوتل لئے ننگے پیر باہر نکل آئی۔

"ارے بھئی کیسا سمن ہے ؟"

"پڑھ لیجئے" پولیس انسپکٹر نے رکھائی سے کہا۔

اور سمن کی سرخی پڑھ کر میری ہنسی چھوٹ گئی۔ لکھا تھا۔

ارے یہ بادشاہ سلامت کو مجھ سے کیا شکایت ہو گئی جو مقدمہ ٹھونک دیا ؟

"ہنسیے نہ لیجئے" انسپکڑ صاحب سختی سے بولے "پڑھ کر دستخط کر دیجئے"

میں نے سمن آگے پڑھا بڑی مشکل سے سمجھ میں آیا میری کہانی "لحاف" پر فحاشی کے الزام میں سرکار نے مقدمہ چلا دیا ہے اور مجھے جنوری میں لاہور ہائی کورٹ میں حاضر ہونا ہے ۔دوسری صورت یعنی میری غیر حاضری پر سخت کارروائی کی جائے گی۔

"بھئی میں نہیں لیتی سمن" میں نے کاغذ واپس کرتے ہوئے کہا اور دودھ کی بوتل ہلانے لگی "مہربانی کر کے واپس لے جائیے"

"آپ کو لینا پڑے گا"

"کیوں ؟" میں حسب عادت بحث کرنے لگی۔

"ارے بھئی کیا قصہ ہے ؟" محسن عبد اللہ نے جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے پوچھا۔ وہ گردیں اڑاتے ہوئے نہ جانے کہاں سے خاک چھان کر آ رہے تھے۔

"دیکھو یہ لوگ مجھے زبردستی سمن دے رہے ہیں ۔میں کیوں لوں ؟" محسن نے وکالت پڑھی تھی اوّل نمبر پاس ہوئے تھے۔

"ہوں" انہوں نے سمن پڑھ کر کہا۔ "کون سی کہانی ہے؟"

"بھئی ہے ایک کمبخت کہانی جان کی مصیبت ہو گئی ہے۔"

"سمن تمہیں لینا پڑے گا۔"

"کیوں؟"

"پھر وہی حجت" شاہد بھڑک اٹھے۔

میں ہرگز نہیں لوں گا

"نہیں لو گی تو ...... تمہیں گرفتار کرا لیا جائے گا۔" محسن غرائے۔

"کر لیجئے گرفتار مگر میں سمن نہیں لوں گی۔"

"جیل میں بند کر دی جاؤ گی۔"

"جیل میں؟ ارے مجھے جیل دیکھنے کا بہت شوق ہے کتنی دفعہ یوسف سے کہہ چکی ہوں، مجھے جیل لے چلو مگر ہنستا ہے کمبخت اور ٹال جاتا ہے۔ انسپکٹر صاحب مجھے جیل لے چلئے۔ آپ ہتھکڑیاں لائے ہیں؟" میں نے بڑے پیار سے پوچھا۔

انسپکٹر صاحب کا پارہ چڑھ گیا۔ غصہ ضبط کر کے بولے۔

"مذاق مت کیجئے، دستخط کیجئے۔"

اور پھر شاہد اور محسن پھٹ پڑے ہیں بالکل مذاق کے موڈ میں ہنس ہنس کر بکے چلی جا رہی تھی۔ ابا میاں جب سانبھر میں جج تھے تو کچہری بالکل گھر کے مردانے حصہ میں لگتی تھی۔ ہم لوگ کھڑکی سے چور ڈاکوؤں کو ہتھکڑیوں میں جکڑا ہوا دیکھا کرتے تھے ایک دفعہ بڑے خطرناک ڈاکو پکڑے گئے۔ ان کے ساتھ ایک بڑی خوبصورت طرحدار نوجوان عورت بھی تھی باقاعدہ برجس اور کوٹ پہنے، شکرے جیسی آنکھیں، چیتے جیسی کمر اور لمبے سیاہ بال۔ میرے اوپر اس کا بہت رعب پڑا تھا۔

شاہد اور محسن نے بوکھلا دیا۔ میں نے بوتل انسپکٹر صاحب کو پکڑائی چاہی تاکہ دستخط کر سکوں۔ مگر وہ ایسے بدکے جیسے میں نے ان کی طرف پستول کی نال

بڑھا دی ہو۔ جلدی سے محسن نے بوتل مجھ سے چھین لی۔ اور میں نے دستخط کر دیئے۔

"آپ تھانہ چل کر ضمانت دیجئے۔ پانچ سو کی ضمانت۔"

"میرے پاس اس وقت تو پانچ سو نہیں۔"

"آپ کو نہیں، کسی اور صاحب کو آپ کی ضمانت دینی پڑے گی۔"

میں کسی کو پھنسانا نہیں چاہتی۔ اگر میں نہیں گئی تو ضمانت ضبط ہو جائے گی۔" میں نے اپنی معلومات کا رعب ڈالا۔ "آپ مجھے گرفتار کر لیجئے۔"

اب کے انسپکٹر صاحب کو غصہ نہیں آیا۔ انہوں نے مسکرا کر شاہد کی طرف دیکھا جو صوفے پر سر پکڑے بیٹھے تھے اور مجھ سے بڑی نرمی سے کہا۔

"چلئے بھی۔ ذرا سی دیر کی بات ہے۔"

"مگر ضمانت!" میں نے نرم ہو کر کہا۔ اپنے احمقانہ مذاق پر شرمندہ ہو گئی۔

"میں دوں گا" محسن بولے۔

"مگر میری بچی بھوکی ہے۔ اس کی آیا بالکل نئی ہے اور چھوٹی سی لڑکی ہے۔"

"آپ بچی کو دودھ پلا دیجئے۔" انسپکٹر صاحب بولے۔

"تو آئیے اندر بیٹھئے۔" محسن نے پولیس والوں کو بٹھایا۔ انسپکٹر صاحب شاہد کے فین نکلے اور ایسی میٹھی میٹھی باتیں کیں کہ ان کا موڈ بھی ٹھیک ہونے لگا۔

میں شاہد اور محسن پولیس اسٹیشن ماہم گئے۔

خانہ پری کر کے میں نے پوچھا۔

"قیدی کہاں ہیں؟"

"دیکھیں گی۔"

"ضرور۔"

ایک جنگلے کے پیچھے چھوٹی سی جگہ میں دس پندرہ آدمی آڑے ترچھے لیٹے تھے۔

یہ ملزم ہیں قیدی نہیں۔ انہیں کل کورٹ میں پیش کیا جائے گا" انسپکٹر صاحب بولے۔

"ان کا جرم؟"

"دنگا، فساد۔ پاکٹ مارنا۔ وارڈ پی کے دنگا کرنا"

"انہیں کیا سزا ملے گی؟"

"جرمانہ یا چند دن کی قید" مجھے بڑا افسوس ہوا کہ اتنے چھٹ پٹے ملزم دیکھنے کو ملے۔ دو چار قاتل اور ڈاکو ہوتے تو ایک بات بھی تھی۔

"آپ مجھے کہاں رکھتے؟"

عورتوں کا انتظام یہاں نہیں۔ انہیں ادھر گرانٹ روڈ یا مٹنگا لے جاتے ہیں"

واپس آکر شاہد اور محسن مجھ سے خوب لڑے۔ اور شاہد تو ساری رات لڑتے رہے۔ طلاق تک کی نوبت آگئی۔ محسن کو تو میں نے یہ کہہ کر چپ کر دیا کہ اگر زیادہ جان کھاؤ گے، تو انڈر گراؤنڈ ہو جاؤں گی۔ پانچ سو کا جھٹکا رہ جائے گا۔ مگر شاہد کسی طرح مقدمہ بازی کی ذلت اور بدنامی کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے والدین اور بڑے بھائی سنیں گے تو کیا سوچیں گے۔

پھر جب اخباروں میں خبر نکلی تو میرے سسر جی کا بڑا درد بھرا خط آیا "عصمت کو سمجھاؤ۔ کچھ اللہ رسول کی باتیں لکھیں کہ عاقبت درست ہو۔ مقدمہ اور وہ بھی فحاشی پر، ہم لوگ بہت پریشان ہیں۔ اللہ رحم کرے"

منٹو کے فون سے معلوم ہوا، ان پر بھی مقدمہ چلا ہے۔ اسی کورٹ میں اسی روز ان کی بھی پیشی ہے۔ پھر صفیہ اور منٹو دوڑے آئے۔ منٹو نہایت ہشاش بشاش جیسے کسی نے وکٹوریہ کراس دے دیا ہو۔ میں دل میں بڑی نادم تھی۔ بظاہر بہادری جتا رہی تھی۔ مگر منٹو سے مل کر شاہد سے بھی ڈھارس بندھ گئی۔ اور مجھے بھی بڑی تسلی

ہوئی۔ دل میں تو دھکڑ پکڑ ہو رہی تھی۔ مگر منٹو نے وہ شہہ دی کہ میرا بھی ڈر نکل گیا۔

"ارے چپ کرو منٹو صاحب" صفیہ نروس ہونے لگی۔

اور پھر مغلظات سے بھرے خطوں کا تانتا لگ گیا۔ ایسی انوکھی پیچ دار بھاری بھرکم گالیاں کہ مردہ کے سامنے بک دی جائیں تو اٹھ کر بھاگ جائے مجھے ہی نہیں میرے پورے خاندان کو، شاہد کو اور میری دو مہینے کی بچی کو کہ اس کی پیدائش کی خبر کہیں چھپ گئی تھی۔

مجھے چھپکلی کیچوا چھپکلی اور گرگٹ سے بڑا ڈر لگتا ہے۔ بہت سے لوگ بڑی بہادری سے باتیں بنا لیتے ہیں، لیکن مری ہوئی چوہیا سے ڈرتے ہیں۔ مجھے اپنی ڈاک سے ڈر لگتا تھا جیسے لفافوں میں سانپ بچھو اور اجگر بند ہوں۔ ڈرتے ڈرتے خط کھولتی، اگر سانپ بچھو دکھائی پڑتے تو وہ لفظ پڑھ کر خط جلا دیتی۔ گر شاہد کے ہاتھ خط پڑ جاتا تو پھر طلاق کی نوبت آجاتی۔

ان خطوں کے علاوہ اخباروں میں جو مضمون نکل رہے تھے۔ محفلوں میں جو بحثیں ہوتیں، انہیں مجھ جیسی سخت جان ہی جھیل سکتی تھی۔ میں نے کبھی کسی کی بات کا جواب نہ دیا۔ کبھی اپنی غلطی کو ماننے سے انکار نہیں کیا۔ ہاں مجھ سے غلطی ہو گئی تھی۔ مجھے اپنے جرم کا اعتراف تھا۔ صرف منٹو ایک ایسا انسان تھا۔ جو میرے اس بزدلانہ رویہ پر بھڑک اٹھتا تھا۔ میں خود اپنے خلاف تھی۔ اور وہ میری حمایت کرتا تھا۔ میرے اور شاہد کے جتنے بھی دوست تھے۔ اسے کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ ٹھیک سے یاد نہیں مگر شاید عباس نے تو لحاف کا انگریزی میں ترجمہ بھی کہیں چھپوایا تھا۔ ترقی پسندوں نے نہ مجھے پھٹکارا۔ نہ میری تعریف کی۔ اور مجھے اس رویہ سے بڑا اطمینان ہوتا تھا۔

جب میں نے یہ کہانی لکھی تو میں اپنے بھائی کے ساتھ رہتی تھی۔ رات کو میں

یہ ملزم ہیں قیدی نہیں - انہیں کل کورٹ میں پیش کیا جائے گا۔" انسپکٹر صاحب بولے۔

"ان کا جرم؟"

"دنگا، فساد - پاکٹ مارنا - وردی کے دنگا کرنا۔"

"انہیں کیا سزا ملے گی؟"

"جرمانہ یا چند دن کی قید۔" مجھے بڑا افسوس ہوا کہ اتنے چھٹ بھیے ملزم دیکھنے کو ملے - دو چار قاتل اور ڈاکو ہوتے تو ایک بات بھی تھی۔

"آپ مجھے کہاں رکھتے؟"

عورتوں کا انتظام یہاں نہیں - انہیں ادھر گرانٹ روڈ یا مٹنگا لے جاتے ہیں۔"

واپس آکر شاہد اور محسن مجھ سے خوب لڑے - اور شاہد تو ساری رات لڑتے رہے - طلاق تک کی نوبت آگئی - محسن کو تو میں نے یہ کہہ کر چپ کر دیا کہ اگر زیادہ جان کھاؤ گے، تو انڈر گراؤنڈ ہو جاؤں گی - پانچ سو کا جھٹکا رہ بیٹھ جائے گا - مگر شاہد کسی طرح مقدمہ بازی کی ذلت اور بدنامی کو برداشت نہیں کر سکتے تھے - ان کے والدین اور بڑے بھائی سنیں گے تو کیا سوچیں گے۔

پھر جب اخباروں میں خبر نکلی تو میرے سسر جی کا بڑا درد بھرا خط آیا۔" کو سمجھاؤ - کچھ اللہ رسول کی باتیں لکھیں کہ عاقبت درست ہو - مقدمہ اور وہ بھی فحاشی پر ہم لوگ بہت پریشان ہیں - اللہ رحم کرے۔"

منٹو کے فون سے معلوم ہوا، ان پر بھی مقدمہ چلا ہے - اسی کورٹ میں اسی روز ان کی بھی پیشی ہے - پھر صفیہ اور منٹو وارڈ سے آئے - منٹو نہایت ہشاش بشاش، جیسے کسی نے وکٹوریہ کراس دے دیا ہو - میں دل میں بڑی نادم تھی - بظاہر بہادری جتا رہی تھی - مگر منٹو سے مل کر شاہد سے بھی ڈھارس بندھ گئی - اور مجھے بھی بڑی تسلی ہوئی - دل میں تو دھکڑ پکڑ ہو رہی تھی - مگر منٹو نے وہ شہہ دی کہ میرا بھی ڈر نکل گیا۔

"ارے چپ کرو منٹو صاحب" صفیہ نروس ہونے لگی۔

اور پھر مغلظات سے بھرے خطوں کا تانتا لگ گیا - ایسی انوکھی پیچ دار بھاری بھرکم گالیاں کہ مردہ کے سامنے بک دی جائیں تو اُٹھ کر بھاگ جائے مجھے ہی نہیں میرے پورے خاندان کو، شاہد کو اور بے چاری دو مہینے کی بچی کو کہ اس کی پیدائش کی خبر کہیں چھپ گئی تھی۔

مجھے پھسلنی کیچڑ، چھپکلی اور گرگٹ سے بڑا ڈر لگتا ہے - بہت سے لوگ بڑی بہادری سے باتیں بنا لیتے ہیں، لیکن مری ہوئی چوہیا سے ڈرتے ہیں - مجھے اپنی ڈاک سے ڈر لگتا تھا جیسے لفافوں میں سانپ بچھو اور اجگر بند ہوں. ڈرتے ڈرتے خط کھولتی، اگر سانپ بچھو دکھائی پڑتے تو وہ لفظ پڑھ کر خط جلا دیتی - مگر شاہد کے ہاتھ خط پڑ جاتا تو پھر طلاق کی نوبت آجاتی۔

ان خطوں کے علاوہ اخباروں میں جو مضمون نکل رہے تھے - محفلوں میں جو بحثیں ہوتیں، انہیں مجھ جیسی سخت جان ہی جھیل سکتی تھی - میں نے کبھی کسی کی بات کا جواب نہ دیا - کبھی اپنی غلطی کو ماننے سے انکار نہیں کیا - ہاں مجھ سے غلطی ہو گئی تھی - مجھے اپنے جرم کا اعتراف تھا - صرف منٹو ایک ایسا انسان تھا - جو میرے اس بزدلانہ رویہ پر بھڑک اٹھتا تھا - میں خود اپنے خلاف تھی - اور وہ میری حمایت کرتا تھا - میرے اور شاہد کے جتنے بھی دوست تھے - اسے کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے - ٹھیک سے یاد نہیں مگر شاید عباس نے تو لحاف کا انگریزی میں ترجمہ بھی کہیں چھپوایا تھا - ترقی پسندوں نے نہ مجھے پھٹکارا - نہ میری تعریف کی - اور مجھے اس رویہ سے بڑا اطمینان ہوتا تھا۔

جب میں نے یہ کہانی لکھی تو میں اپنے بھائی کے ساتھ رہتی تھی - رات کو میں

نے کہانی لکھی، صبح میں نے اپنے بھاوج کو سنائی، انہوں نے یہ نہیں کہا کہ یہ گندی کہانی ہے مگر پہچان گئیں کہ کس کی کہانی ہے۔ پھر میں نے اپنی خالہ زاد بہن کو جو چودہ برس کی تھی کو کہانی پڑھ کر سنائی۔ وہ کہنے لگی کیا لکھا ہے ہماری تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے کہانی "ادب لطیف" کو بھیجی۔ انہوں نے کچھ نہ کہا فوراً چھاپ دی اور شاہد احمد دہلوی میری کہانیوں کا مجموعہ چھاپ رہے تھے انہوں نے کتابی صورت میں چھاپ دی۔ یہ کہانی ۱۹۴۲ء میں چھپی تھی۔ اور میری اور شاہد کی دوستی شادی کے ارادے تک پہنچ چکی تھی۔ شاہد نے کہانی پڑھ کر ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ اور ہماری جنگ بھی ہوئی تھی۔ مگر اس وقت لحاف پر جو حملے ہو رہے تھے، وہ بمبئی تک نہیں پہنچے تھے۔ میرے پاس صرف "ساقی" اور "ادبِ لطیف" آتے تھے۔ شاہد زیادہ بدظن نہیں ہوئے تھے۔ اور ہماری شادی ہوگئی تھی۔

۱۹۴۴ء میں دسمبر کے مہینے میں سمن ملا کہ ہمیں جنوری میں کورٹ میں حاضر ہونا ہے سب کہہ رہے تھے جیل ویل نہیں بس جرمانہ ہو جائے گا۔ اور ہم بڑے جوش سے لاہور کے لئے گرم کپڑے بنوانے لگے۔

سیما بہت چھوٹی اور کمزور تھی اور بڑی اونچی آواز سے روتی تھی۔ چائلڈ اسپیشلسٹ کو دکھایا تو اس نے کہا بالکل تندرست ہے یونہی غل مچاتی ہے۔ اسے لاہور کی سردی میں لے جانا ٹھیک نہ تھا۔ ایک دم اتنی سردی نہ جھیل سکے گی۔ تو ہم نے بچی کو علی گڑھ سلطانہ جعفری کی اماں کے پاس چھوڑا اور لاہور روانہ ہو گئے۔ دہلی سے شاہد احمد دہلوی اور وہ کاتب جنہوں نے کتاب لکھی تھی ساتھ ہو گئے تھے۔ کیونکہ بادشاہ سلامت نے انہیں بھی ملزم قرار دیا تھا۔ یہ مقدمہ "ادب لطیف" پر نہیں بلکہ اس کتاب پر چلایا تھا جو شاہد احمد دہلوی نے چھاپی تھی۔

ہمیں سلطانہ لینے آگئی اور ان دنوں لاہور ریڈیو اسٹیشن پر کام کرتی تھی اور

لقمان صاحب کے ہاں رہتی تھی۔ ان کی بڑی شاندار کوٹھی تھی۔ بیوی بچے میکے گئے ہوئے تھے اس لیئے بس اپنا ہی راج تھا۔

منٹو بھی پہنچ گئے تھے۔ اور پہنچتے ہی ہماری خوب دعوتیں ہوئیں۔ زیادہ تر تو منٹو کے دوست تھے مگر مجھے بھی عجوبہ جانور سمجھ کر دیکھنے آجاتے تھے۔ ہماری ایک دن پیشی ہوئی۔ کچھ بھی نہ ہوا۔ بس جج نے نام پوچھا اور یہ کہ میں نے یہ کہانی لکھی ہے یا نہیں۔ میں نے اقبال جرم کیا کہ لکھی ہے۔ بس!

بڑی ناامیدی ہوئی، سارے وقت کچھ ہمارے وکیل صاحب بولتے رہے۔ ہم چونکہ آپس میں کھسر پھسر کر رہے تھے کچھ پلے نہیں پڑا۔ اس کے بعد دوسری پیشی پڑ گئی اور ہم آزاد ہو کر گلچھرے اڑانے لگے۔ میں منٹو شاہد تانگے میں بیٹھ کر خوب شاپنگ کرتے پھرے۔ کشمیری دوشالے اور جوتے خریدے۔ جوتوں کی دکان پر منٹو کے نازک سفید پیر دیکھ کر مجھے بڑا رشک آیا۔ اپنے بھدے پیر کو دیکھ کر مور کی طرح ماتم کو جی چاہا۔

"مجھے اپنے پیروں سے گھن آتی ہے"۔ منٹو نے کہا۔

"کیوں؟ اتنے تو خوبصورت ہیں!" میں نے بحث کی۔

"میرے پیر بالکل زنانے ہیں"

"مگر زنانیوں سے تو اتنی دلچسپی ہے آپ کو!"

"آپ تو الٹی بحث کرتی ہیں۔ میں عورت سے مرد کی حیثیت سے پیار کرتا ہوں اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ خود زنانہ بن جاؤں"

ہٹائیے بھی زنانے اور مردانے کی بحث کو، انسانوں کی بات کیجیئے پتہ ہے نازک پیروں والے مرد بڑے حساس اور ذہین ہوتے ہیں۔ میرے بھائی عظیم بیگ چغتائی کے پیر بھی بڑے خوبصورت ہوا کرتے تھے۔ مگر۔۔۔

اور مجھے اپنے بھائی کے مرنے سے پہلے سوجن سے گھناؤنے ہو جانے والے

پیر یاد آ گئے۔ اور آسیب اور آلوچے کے پھولوں سے نوخیز دُلہن کی طرح آراستہ لاہور جو دسپور کا وہ چٹیل ریتلا قبرستان بن گیا جہاں میرا ابّاجی منوں مٹی کے نیچے سوتا ہے۔ جس کی تازہ قبر پہ کانٹے لگا دیئے گئے تھے تاکہ بجّو نہ کھود ڈالیں۔ وہ کانٹے میری رگوں میں تیر گئے اور میں نے توس کی نرم شال کاؤنٹر پر ڈال دی۔

لاہور کتنا خوبصورت تھا۔ آج بھی ویسا ہی شاداب قہقہے لگاتا ہوا باہیں پھیلا کر آنے والوں کو سمیٹ لینے والا۔ ٹوٹ کر چاہنے والے بے تکلف زندہ دلوں کا شہر "پنجاب کا دل"۔

خوب شہر میں گھومے، جیبوں میں چلغوزے بھرے سڑکوں پہ کھاتے، باتوں میں عزق چلے جا رہے تھے۔ گلی کھڑے تلی ہوئی مچھلی پر ہاتھ صاف کر رہے ہیں بھوک کتنی لگتی ہے۔ کھاتے جاؤ چلتے جاؤ سب ہضم۔ ایک ہوٹل میں گھس گئے ہیم برگر اور ہوٹ ڈاگ دیکھ کر منہ میں پانی بھر آیا۔

ہیم برگر میں ہیم یعنی سُور کا گوشت ہوتا ہے ہوٹ ڈاگ کھا سکتے ہیں" شاہد نے رائے دی۔ اور ہم نے شریف مسلمانوں کی طرح دھرم کا پالن کرتے ہوئے ڈٹ کے ہوٹ ڈاگ کھائے اور تندھاری انار کا رس پیا۔

بعد میں معلوم ہوا یہ گوری قوم بڑی چالباز ہے۔ ہیم برگر میں میٹ ہوتا ہے۔ اور ہوٹ ڈاگ میں سور کی سوسیج! حالانکہ ہوٹ ڈاگ کھائے دو دن بیت چکے تھے مگر شاہد کا یہ سنتے ہی جی متلانے لگا۔ پھر ایک مولوی صاحب نے فتویٰ دیا۔ کہ بھول چوک میں کھا جاؤ تو معافی ہے تب کہیں جا کے شاہد کی متلی رُکی۔

مگر شام کو جب فلٹو اور شاہد خوب پی گئے تو پھر دونوں کی یہی رائے ہوئی کہ ہیم برگر قطعی بے ضرر ہیں۔ ہوٹ ڈاگ کھانے ہی میں خیریت ہے۔ بحث خطرناک صورت اختیار کرنے لگی فیصلہ ہوا کہ احتیاطاً ان دونوں سے پرہیز کیا جائے کہ ان کی جنم پتری کا کوئی

بھروسہ نہیں۔ کون حرام ہے کون حلال۔ اس لئے چکن تکے کھائے جائیں۔ انارکلی میں چکر لگائے، شالیمار میں گھومے، نور جہاں کا مقبرہ دیکھا اور پھر دعوتیں اور مشاعرے اور ہو حق۔

تب میرے دل سے بے ساختہ شہنشاہ برطانیہ کے حق میں دعائیہ کلمے نکلنے لگے کہ انہوں نے ہم پر مقدمہ چلا کر لاہور میں عیش کرنے کا سنہرا موقع دیا۔ ہم دوسری پیشی کا بڑی بے قراری سے انتظار کرنے لگے۔ چاہے پھانسی بھی ہو تو کوئی پروا نہیں اگر لاہور میں ہوئی تو یقیناً شہادت کا رتبہ پائیں گے۔ اور لاہور والے بڑی دھوم سے ہمارے جنازے اٹھائیں گے۔

دوسری پیشی نومبر کے خوشگوار موسم میں پڑی۔ یعنی ۱۹۴۶ء میں شاہد اپنی فلم میں الجھے ہوئے تھے۔ سیما کی آیا بہت ہوشیار تھی اور اب سیما خوب موٹی تازی اور تندرست تھی۔ اس لئے میں نے اسے بمبئی میں چھوڑا اور خود ہوائی جہاز سے دہلی اور وہاں سے شاہد احمد دہلوی اور ان کے کاتب کے ساتھ ریل میں گئی۔ کاتب صاحب سے بڑی شرمندگی ہوئی تھی۔ وہ بے چارے مفت میں گھسیٹ لئے گئے۔ بڑے خاموش مسکین سے تھے ہمیشہ آنکھیں جھکی۔ چہرے پر اکتاہٹ۔ انہیں دیکھ کر احساس جرم ایک وَرم اُبھر آتا تھا۔ میری کتاب کی کتابت میں پھنس گئے۔ میں نے ان سے پوچھا

"آپ کی کیا رائے ہے؟ کیا ہم مقدمہ ہار جائیں گے"

"میں کچھ کہہ نہیں سکتا، میں نے کہانی نہیں پڑھی"

"مگر کاتب صاحب آپ نے کتابت کی ہے"

"میں الفاظ جدا جدا دیکھتا ہوں اور لکھ دیتا ہوں۔ ان کے معنی پہ غور نہیں کرتا"

"کمال ہے! اور چھپنے کے بعد بھی نہیں پڑھتے"

"پڑھتا ہوں کہیں غلطی تو نہیں رہ گئی"

"الگ الگ الفاظ؟"

"جی ہاں!" انہوں نے ندامت سے سر جھکا لیا۔ تھوڑی دیر بعد بولے۔

"ایک بات کہوں، برا تو نہیں مانیں گی؟"

"نہیں۔"

"آپ کی زبان کے یہاں املا کی بہت غلطیاں ہوتی ہیں۔"

"ہاں وہ تو ہوتی ہیں، اصل میں س، ش اور ص میں گڑبڑا جاتی ہوں۔ ظ کے ض۔ ز۔ ذ میں بھی بہت کنفیوژن ہوتا ہے۔ یہی حال ہ، ح اور ھ کا ہے۔"

"آپ نے تختیاں نہیں لکھیں؟"

"بہت لکھیں اور مستقل انہیں غلطیوں پر بہت مار کھائی مگر۔۔۔"

دراصل جیسے میں الفاظ پر دھیان دیتا ہوں، معنی کی طرف توجہ نہیں دیتا، اسی طرح آپ اپنی بات کہنے میں ایسی تا دلی ہوتی ہیں کہ حروف پر توجہ نہیں دیتیں اتنے، اللہ کا تبوں کو جیتا رکھے وہ میری آبرو رکھ لیں گے۔" میں نے سوچا اور ٹال دیا۔

شاہد صاحب کے ساتھ ہم بھی ایم اسلم صاحب کے یہاں ٹھہر گئی۔ سلام دعا بھی ٹھیک سے نہیں ہوئی تھی کہ انہوں نے مجھے جھڑنا شروع کیا۔ میری عریاں نگاری پر برسنے لگے۔ مجھ پر بھی بھوت سوار ہو گیا۔ شاہد صاحب نے بہت روکا، مگر میں الجھ پڑی۔

"اور آپ نے جو گناہ کی راتوں" میں اتنے گندے گندے جملے لکھے ہیں، باقاعدہ سیکس ایکٹ کی تفصیل بتائی ہے۔ صرف چٹخارے کے لیے۔"

"میری اور بات ہے۔ میں مرد ہوں۔"

"تو اس میں میرا کیا قصور!"

"کیا مطلب؟" وہ غصہ سے سرخ ہو گئے۔

مطلب یہ کہ آپ کو خدا نے مرد بنایا اس میں میرا کوئی دخل نہیں اور مجھے عورت

بنایا اس میں آپ کا کوئی دخل نہیں۔ مجھ سے آپ جو چاہتے ہیں وہ سب لکھنے کا حق آپ نے نہیں مانگا نہ میں آزادی سے لکھنے کا حق آپ سے مانگنے کی ضرورت سمجھتی ہوں۔"

"آپ ایک شریف مسلمان خاندان کی تعلیم یافتہ لڑکی ہیں۔"

"اور آپ بھی تعلیم یافتہ ہیں اور شریف مسلمان خاندان سے ہیں۔"

"آپ مردوں کی برابری کرنا چاہتی ہیں؟"

ہرگز نہیں، کلاس میں زیادہ سے زیادہ نمبر پانے کی کوشش کرتی تھی اور اکثر لڑکوں سے زیادہ نمبر لے جاتی تھی۔

میں جانتی تھی کہ میں اپنی خاندانی کج بحثی پر اتر آئی ہوں۔ مگر اسلم صاحب کا چہرہ تمتما اٹھا اور مجھے ڈر ہوا کہ یا تو وہ میرے تھپڑ مار دیں گے یا ان کے دماغ کی شہ رگ پھٹ جائے گی۔ شاہد صاحب کی روح فنا ہو رہی تھی۔ وہ بس رونے ہی والے تھے۔ میں نے بڑی نرم آواز میں انکساری سے کہا۔

"اصل میں اسلم صاحب مجھے کبھی کسی نے نہیں بتایا کہ "لحاف" والے موضوع پر لکھنا گناہ ہے۔ نہ میں نے کسی کتاب میں پڑھا کہ اس ۔۔۔۔۔ مرض ۔۔۔ یا لت کے بارے میں نہیں لکھنا چاہیئے۔ شاید میرا دماغ عبدالرحمٰن چغتائی کا برش نہیں ایک سستا سا کیمرہ ہے۔ جو کچھ دیکھتا ہے۔ کھٹ سے بٹن دب جاتا ہے اور میرا قلم میرے ہاتھ میں بے بس ہوتا ہے۔ میرا دماغ اسے ورغلا دیتا ہے۔ دماغ اور قلم کے قضیے میں دخل انداز نہیں ہو پاتی۔"

"آپ کو مذہبی تعلیم نہیں ملی؟"

"ارے اسلم صاحب میں نے بہشتی زیور پڑھا اس میں ایسی کھلی کھلی باتیں لکھی

ہیں۔" میں نے بڑی معصوم صورت بنا کر کہا۔ اسلم صاحب کچھ پریشان سے ہو گئے
میں نے کہا۔

جب بچپن میں میں نے وہ باتیں پڑھیں تو میرے دل کو دھکا سا لگا۔ وہ باتیں گندی لگیں۔ پھر میں نے بی۔ اے کے بعد پڑھا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ باتیں گندی نہیں بڑی سمجھ بوجھ کی باتیں ہیں جو ہر ذی ہوش انسان کو معلوم ہونی چاہئیں۔ ویسے لوگ چاہیں تو نفسیات اور ڈاکٹروں کے کورس میں جو کتابیں ہیں انہیں بھی گندا کہہ دیں۔"

رفتہ رفتہ ختم ہو کر باتیں نرم لہجہ میں ہونے لگیں۔ اسلم صاحب کافی ٹھنڈے ہو گئے اتنے میں ناشتہ آگیا۔ اور ہم چار افراد کے لئے اتنا لمبا چوڑا دسترخوان سجا کہ بآسانی پندرہ آدمی ناشتہ کر سکتے تھے۔ تین چار قسم کے انڈے، سادہ، تلے ہوئے خاگینہ، اُبلے ہوئے، شامی کباب اور قیمہ، پراٹھے اور پوریاں بھی اور توس بھی، سفید اور پیلا مکھن، دہی اور دودھ، شہد اور خشک تر میوے۔ انڈے کا حلوا، گاجر کا حلوا، اور حلوا سوہن۔

"یا اللہ کیا قتل کرنے کا ارادہ ہے۔"

"میں نے بہت جلایا تھا اس لئے ان کی تحریروں کی تعریف شروع کر دی۔ میں نے ان کی "نرگس" اور "گناہ کی راتیں" پڑھی تھیں۔ بس ان ہی کو خوب آسمان پر چڑھایا۔ آخر میں وہ کچھ قائل سے ہو گئے کہ بعض وقت عریانی صاف گوئی کا کام کرتی ہے اور سبق دیتی ہے۔ پھر انہوں نے خود اپنی ایک ایک کتاب کی خوبیاں گنانی شروع کیں۔ اور موڈ بہت خوشگوار ہو گیا۔ بڑی نرمی سے بولے۔

"تم جج کے سامنے معافی مانگ لو۔"

"کیوں؟ ہمارے وکیل صاحب تو کہتے ہیں۔ ہم مقدمہ جیت جائیں گے۔"

"نہیں وہ سالا بکتا ہے، تم اور منٹو اگر معافی مانگ لو تو یہ مقدمہ ختم ہو سکتا ہے۔

پانچ منٹ کی بات ہے۔"

"یہاں کے معزز لوگوں نے سرکار پر زور ڈال کر ہم پر یہ مقدمہ چلوایا ہے۔"

"بکواس!" اسلم صاحب بولے۔ مگر آنکھ نہ ملا سکے۔

"تو پھر کیا سرکار نے یا شاہ برطانیہ نے یہ کہانیاں پڑھیں جو انہیں مقدمہ چلانے کی سوجھی۔"

"اسلم صاحب یہ تو سچ ہے کہ کچھ ادیبوں نقادوں۔ اور شرفا نے گورنمنٹ کی توجہ اس طرف مبذول کرائی کہ یہ کتابیں مخرب اخلاق ہیں انہیں ضبط کر لیا جائے۔"
شاہد صاحب دھیرے سے بولے۔

"اگر مخرب اخلاق تحریروں پہ پابندی لگائی جائے تو کیا ان کو سر پہ رکھا جائے۔"
اسلم صاحب بھیٹ پڑے۔ شاہد صاحب کچھ نادم سے ہو گئے۔

"تب تو ہم سزا کے ہی مستحق ہیں۔" میں نے کہا۔

"پھر وہی کٹ حجتی۔"

"نہیں اسلم صاحب یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ جرم کیا۔ شریف انسان گمراہ ہوئے اور معافی مانگ کے صاف نکل گئے۔ میں نے اگرچہ جرم کیا ہے اور وہ ثابت ہو جاتا ہے تو صرف سزا ہی میرے ضمیر کو سکون دے سکتی ہے۔" میں نے طنز سے نہیں سچے دل سے کہا۔

"ہٹ دھرمی نہ کرو۔ معافی مانگ لو۔"

"سزا مل گئی تو کیا ہو گا۔ جرمانہ؟"

"ساتھ میں بدنامی ہو گی۔"

"ارے بدنامی تو ہو چکی۔ اب کیا کسر باقی رہ گئی ہے۔ یہ مقدمہ تو کچھ بھی نہیں۔ جرمانہ کتنا ہو گا؟" میں نے پوچھا۔

"ارے یہی کوئی دو تین سو" شاہد صاحب بولے۔

"بس؟"

"پانچ سو بھی ہو سکتا ہے" اسلم صاحب نے ڈرایا۔

"پا۔۔۔۔۔س؟"

"بہت روپیہ آگیا ہے؟" اسلم صاحب چڑھ گئے۔

"آپ کی دعا ہے۔ اور اگر نہ بھی ہوتا تو کیا آپ مجھے جیل جانے سے بچاتے کے لئے پانچ سو نہ دے دیں گے۔ آپ کا شمار تو لاہور کے رئیسوں میں ہے"

"زبان بہت چلتی ہے"

میری اماں کو بھی یہی شکایت تھی۔ کہتی تھیں۔ بس جیب چلتو رو ڈکھیتو۔ بات ہنسی میں ٹل گئی۔ مگر تھوڑی دیر بعد پھر وہی کہ معافی مانگ لو۔

جی چاہا اپنا اور ان کا سر پھوڑ لوں۔ مگر دم گھونٹے بیٹھے رہی۔

پھر ایک دم بات بدل کر بولے۔

"تم نے دوزخی کیوں لکھا"

میرے دماغ میں ایک دھماکہ سا ہوا۔

"تم کیسی بہن ہو کر اپنے سگے بھائی کو تم نے دوزخی لکھا"

"وہ دوزخی تھے یا جنتی۔ میرا جو جی چاہا میں نے لکھا آپ کون ہوتے ہیں"

"وہ میرا دوست تھا"

"میرا بھائی تھا"

"لعنت ہے ایسی بہن پر"

میں نے آج تک کسی کو نہیں بتایا کہ میں نے دوزخی لکھا تھا تو میرے اوپر کیا بیتی تھی میں خود کس دوزخ کے شعلوں سے گزر رہی تھی۔ میرا کیا کچھ جل کر راکھ ہوا تھا۔ رات

کے دو بجے تھے جب میں نے یہ مضمون ختم کیا۔ کیسی ہیبت ناک رات تھی۔ سمندر گھر کی سیڑھیوں تک چڑھ آیا تھا۔ جب تک احاطے کی دیوار نہیں بنی تھی مجھ پر عجیب دہشت سی طاری ہو گئی۔ جو کچھ میں نے لکھا تھا وہ میرے چاروں طرف سینما کی ریل کی طرح چل رہا تھا۔ میں نے لیمپ بجھایا تو دم گھٹنے لگا۔ جلدی سے پھر جلا دیا۔ اندھیرے سے ڈر لگ رہا ہے۔ مجھے وہ قبر یاد آ رہی تھی جسے دیکھ کر آنے کے بعد میں مہینوں اکیلے کمرے میں نہیں سو پائی تھی۔ اکیلے پلنگ پر مجھے دہشت ہوتی تھی۔ میں اپنے ساتھ اپنی چھوٹی سی خالہ زاد بہن کو سلانے لگی تھی۔ جودھپور سے مجھے دہشت ہونے لگی تھی اسی لیے میں بمبئی بھاگ آئی تھی۔ دس ستونوں میں سے ایک ڈھیہ گیا تھا۔ اس خلا کو کون ناپ سکتا تھا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا کمرے میں جا کے اپنا بکس بند کیا اور سلطانہ کو فون کیا کہ فوراً آؤ اور مجھے زبردستی لے جاؤ۔ اگر اسلم صاحب روکیں تو بڑا امان کر خوب بگڑنا۔

سلطانہ نے پوچھا "کیا بات ہے میں پانچ بجے چھٹی ہوتے ہی پہنچوں گی"

"تب تک تو ایک آدھ خون ہو جائے گا۔ تم فوراً آؤ"

سلطانہ فوراً آ گئی۔ مگر اسلم صاحب نے کہہ دیا کہ میں نہیں جا سکتی۔ سلطانہ ضد کرتی جاتی تھی اور اس ڈرامے پر ہنس ہنس کے بے حال ہوئی جا رہی تھی میں سلطانہ کے ساتھ بھاگی۔

پیشی کے دن ہم کورٹ میں حاضر ہوئے۔ اور وہ گواہ پیش ہوئے جنہیں یہ ثابت کرنا تھا کہ منٹو کی "بو" اور میرا "لحاف" فحش ہیں۔ میرے وکیل نے سمجھا دیا کہ جب تک مجھ سے براہِ راست سوال نہ کیا جائے میں منہ نہ کھولوں۔ وکیل خود جو مناسب سمجھے گا کہے گا۔

پہلے "بو" کا نمبر آیا۔

"یہ کہاں فحش ہے؟" منٹو کے وکیل نے پوچھا۔

"جی ہاں" گواہ بولا۔

کس لفظ سے آپ کو معلوم ہوا کہ فحش ہے"

گواہ ، "لفظ چھاتی"

وکیل ، "مائی لورڈ لفظ چھاتی فحش نہیں ہے"

جج ، "درست"

وکیل ، "لفظ چھاتی فحش نہیں"

گواہ ، "نہیں۔ مگر یہاں مصنف نے عورت کے سینے کو چھاتی کہا ہے"

منٹو ایک دم سے کھڑا ہو گیا اور بولا۔

عورت کے سینے کو چھاتی نہ کہوں تو کیا "مونگ پھلی" کہوں؟"

کورٹ میں قہقہہ پڑا منٹو بھی ہنسنے لگا۔

"اگر ملزم نے پھر اس قسم کا چھچھورا مذاق کیا تو کن ٹمپٹ آف کورٹ کے جرم میں باہر نکال دیا جائے گا یا معقول سزا دی جائے گی۔" منٹو کو اس کے وکیل نے چپکے چپکے سمجھایا اور وہ سمجھ گیا۔ بحث چلتی رہی۔ اور گھوم پھر کے گواہوں کو بس ایک چھاتی ملتا تھا۔ جو فحش ثابت نہ ہو پاتا تھا۔

"لفظ چھاتی فحش ہے۔ گھٹنا یا کہنی کیوں فحش نہیں؟" میں نے منٹو سے پوچھا۔

"بکواس!" منٹو پھر بھڑک اٹھا۔ بحث چلتی رہی۔ ہم لوگ اٹھ کر برآمدے ڈگر ڈگر کرتی بینچوں پر جا بیٹھے۔ احمد ندیم قاسمی ایک ٹوکرا مالٹے لائے تھے۔ انہوں نے نفاست سے مالٹے کھانے کی ترکیب بتائی۔ مالٹے کو آم کی طرح پلپلا کر چھوٹا سا سوراخ کر لو اور مزے سے چوسو۔ ٹوکرا بھر مالٹے ہم بیٹھے بیٹھے چوس گئے۔

مالٹوں سے پیٹ بھرنے کے بجائے اور شدت سے بھوک جاگ اٹھی۔ لنچ بریک میں کسی ہوٹل پر دھاوا بول دیا۔ سیما کی پیدائش کے سلسلے میں میں بہت بیمار رہی تھی۔ ساری چربی چھٹ گئی تھی۔ مرغن کھانوں کا پرہیز نہیں رہا تھا، مرغی اتنی قوی ہیکل تھی کہ بالکل گدھ یا چیل کے ٹکڑے لگ رہے تھے۔ موٹی موٹی کالی مرچ چھڑک کر گرم گرم کلچوں کے ساتھ اور پانی کی جگہ قندھاری انار کا رس۔ بے اختیار جی سے مقدمہ چلانے والوں کے لئے دعا نکل رہی تھی۔

شام کو لقمان نے چند ادیبوں اور شاعروں کی دعوت کی تھی۔ وہاں پہلی بار میری مسز حجاب امتیاز علی سے ملاقات ہوئی۔ بے حد میک اپ، آنکھوں میں دھڑلوں کاجل کچھ اداس، کچھ روٹھی سی۔ عموماً بات کے جواب میں خلاء میں گھورنے لگتیں۔

"فراڈ ہے" منٹو نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں اور پھیلا کر میرے کان میں کہا۔

"نہیں، وہ اس فضا میں کھوئی ہوئی ہے، جو اس کے قلم سے خوابناک دھوئیں کی طرح نکلی ہے اور اس کے گرد ایک ست رنگا خول تعمیر کر دیتی ہے"

حجاب امتیاز علی خلاء میں گھورتی رہیں اور میں امتیاز علی کو ڈھونڈ کر ان سے باتیں کرنے لگی۔ کس قدر فاصلہ تھا۔ میاں بیوی کے مزاج میں امتیاز صاحب نہایت باتونی قہقہہ باز اور کھلے دل کے مالک تھے۔ محفل لالہ زار بنی ہوئی تھی۔ ایسا لگا برسوں کی ملاقات ہے۔ ان کی باتیں ان کی تحریروں سے بھی زیادہ پُر بہار تھیں۔ حال ہی میں جب پاکستان گئی تو لاہور میں مسز حجاب امتیاز علی سے پھر ملاقات ہوئی۔ ہلکا سا میک اپ، پہلے سے بہت کمسن اور کھلی ہوئی۔ بڑی بے تکلف اور باتونی، جیسے دوسرا ہی جنم لے لیا ہو۔

مجھے آرغنوں دیکھنے کا بڑا شوق تھا جس کا حجاب کے افسانوں میں بے حد ذکر ہوتا ہے۔ میں نے کبھی آرغنوں نہیں دیکھا تھا۔ حجاب کے یہاں گئی تو میں نے ان سے کہا "کیا آپ کے پاس واقعی آرغنوں ہے؟"

"ہاں، دیکھیں گی؟"

"ضرور وہ لفظ جسے آپ کے افسانوں میں پڑھ کر ہی نشہ طاری ہوجاتا تھا۔ آنکھوں میں بے بات آنسو چھلک اٹھتے تھے۔ میں نے انہیں یہ بھی بتایا کہ کسی زمانے میں آپ کی نقل میں میں نے بھی نثری شاعری کی تھی جو میں نے بعد میں جلادی۔"

آرغنوں دیکھ کر میرے سارے جوش اور رومانس پر اوس پڑ گئی۔ ارے یہ تو وہی بچکانہ سا پیانو کا بچہ ہے جو فلمی گانوں کی ریکارڈنگ میں ڈی میلو بجایا کرتا ہے اور ریکارڈسٹ اسے اکثر ڈانٹا کرتا ہے کبھی کھسوانا اور بیک گراؤنڈ موسیقی میں جب ہیروئن بہت گرماتی ہے تو اسی کے سُر اس کے دماغی ٹھبونچیاں کو نغمہ کے روپ میں پیش کرتے ہیں۔ آرگن! کتنا بھونڈا نام ہے اور غین کی شمولیت سے کتنا نازک گنگناتا ہوا آسا وری کا سُر بن جاتا ہے!

کورٹ میں بڑی بھیڑ تھی۔ کئی اصحاب ہمیں رائے دے چکے تھے کہ ہم معافی مانگ لیں۔ وہ جرمانہ ہماری طرف سے ادا کرنے کو تیار تھے۔ مقدمہ کچھ ٹھنڈا پڑتا جارہا تھا لحاف کو فحش ثابت کرنے والے گواہ ہمارے وکیل کی جرح سے کچھ بوکھلا سے رہے تھے۔ کہانی میں کوئی لفظ قابل گرفت نہیں مل رہا تھا۔ بڑے سوچ بچار کے بعد ایک صاحب نے فرمایا کہ یہ جملہ ۔۔۔" عاشق جمع کر رہی تھیں فحش ہے۔"

"کونسا لفظ فحش ہے جمع یا عاشق؟" وکیل نے پوچھا۔

"لفظ عاشق" اگواہ نے ذرا تکلف سے کہا۔

"مائی لارڈ لفظ عاشق بڑے بڑے شعراء نے بڑی فراوانی سے استعمال کیا ہے اور نعتوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ اس لفظ کو اللہ والوں نے بڑا مقدس مقام دیا ہے۔"

"مگر لڑکیوں کا عاشق جمع کرنا بڑی معیوب بات ہے۔" گواہ نے فرمایا۔

"کیوں؟"

"اس لئے۔ کیونکہ ۔۔۔۔ یہ شریف لڑکیوں کے لئے معیوب بات ہے۔"

"جو لڑکیاں شریف نہیں ان کے لئے معیوب نہیں؟"

"آ ۔۔۔۔ نہیں۔"

"میری موکل نے ان لڑکیوں کا ذکر کیا ہے جو شریف نہیں ہوں گی۔ کیوں صاحب بقول آپ کے غیر شریف لڑکیاں عاشق جمع کرتی ہیں۔"

"جی ہاں۔"

ان کا ذکر کرنا فحاشی نہیں مگر ایک شریف خاندان کی تعلیم یافتہ عورت کا ان کے بارے میں لکھنا قابل ملامت ہے۔" گواہ صاحب زور سے گرجے۔

"تو شوق سے ملامت فرمائیے مگر قانون کی گرفت کے قابل نہیں۔"

معاملہ بالکل پُھس پھسا ہوگیا۔

"اگر آپ لوگ معافی مانگ لیں تو ہم آپ کا سارا خرچہ بھی دیں گے اور ۔۔۔۔"

ایک صاحب نہ جانے کون تھے چپکے سے میرے پاس آکر بولے۔"

"کیوں منٹو صاحب معافی مانگ لیں جو روپے ملیں گے مزے سے چیزیں خریدیں گے۔" میں نے منٹو سے پوچھا۔

"بکواس" منٹو نے اپنی مورپنکھی آنکھیں پھیلا کر کہا۔

"مجھے افسوس ہے یہ سرپھرا منٹو راضی نہیں۔"

"مگر آپ۔ اگر آپ ہی ۔۔۔"

"نہیں، آپ نہیں جانتے یہ شخص بڑا فتین ہے۔ بمبئی میں میرا رہنا دوبھر کر دے گا۔ اس کے غصہ سے وہ سزا بدرجہا بہتر ہوگی جو مجھے ملنے والی ہے۔"

وہ صاحب اداس ہو گئے کیونکہ ہمیں سزا نہیں ملی۔ جج صاحب نے مجھے کورٹ کے پیچھے ایک کمرے میں طلب کیا اور بڑے تپاک سے بولے۔

"میں نے آپ کی اکثر کہانیاں پڑھی ہیں اور وہ فحش نہیں۔ اور نہ لحاف فحش ہے مگر

منٹو کی تحریروں میں بڑی غلاظت بھری ہوتی ہے۔"

"دُنیا میں بھی غلاظت بھری ہے۔" میں منحنی آواز میں بولی۔

"تو کیا ضروری ہے کہ اسے اچھالا جائے۔"

"اچھالنے سے وہ نظر آجاتی ہے اور صفائی کی طرف دھیان جا سکتا ہے۔"

جج صاحب ہنس دیئے۔

نہ مقدمہ چلنے سے پریشانی ہوئی تھی نہ جیتنے کی خوشی ہوئی۔ بلکہ غم ہی ہوا کہ اب پھر لاہور کی سیر خدا جانے کب نصیب ہوگی۔

لاہور کتنا سلونا لفظ ہے۔ لاہوری نمک! جیسے نگینے۔ گلابی اور سفید۔ جی چاہتا ہے کہ تراش کر چندن ہار میں جڑ لوں اور کسی مٹیار کی ہنس جیسی سفید گردن کے گرد ڈال دوں۔ "نمی نمی تاریاں دی لو"۔ سریندر کور کے گلے میں لاہوری نمک کے نگینے پگھل کر سُر بن گئے ہیں۔ ساتھ میں اس کے میاں سوڈی کی آواز میں اطلس و دیبا کی سرسراہٹ عجیب رس گھول دیتی ہے۔ لاہور کو دیکھ کر سریندر اور سوڈی کے سُر دل میں جاگ کر ایک پُرسکون سی ہل چل مچا دیتے ہیں آپ ہی آپ جی بھر آتا ہے۔ انجانے غیر مرئی محبوب کی یاد ہوک بن کر اٹھتی ہے۔ لاہور کی ہوا میں نور گھلا ہوا ہے۔ خاموش گھنگرو گونجتے ہیں اور مسز حجاب امتیاز علی کے افسانوں کی نارنگی کی کلیاں مہکنے لگتی ہیں۔ اور عمر کا وہ زمانہ یاد آجاتا ہے جب ان کے رس میں ڈوبے شفق آلود افسانوں میں کھو جاتے تھے۔ پھر جانے کیا ہوا؟

چارلس ڈکنس کو پڑھا، ڈیوڈ کوپر فیلڈ، اولیور ٹوسٹ، ٹونو بنگے!
اور گورکی کی "ماں" نے آسمان سے اٹھا کر دھرتی پر پٹخ دیا۔
چیخوف، ایمیل زولا، گوگول، ٹولسٹائی، دوستووسکی موپساں۔

خوابوں کے سارے قلعے اڑاڑا دھم!

اور میں پھسل کر اٹس ہوس کے بنگلے میں آن گری جہاں ہم علی گڑھ میں لال ڈگی کے کنارے

رہتے تھے یہ بنگلے کچی اینٹوں کے تھے اور کیل ٹھونکو تو بھُر بھُر کر کے کچی مٹی بہنے لگتی تھی چھپر میں کبوتروں کے گھونسلوں سے بیٹ ٹپکا کرتی تھی اور چمگادڑیں لٹکی تھیں۔ اور کمروں کے فرش کچے تھے آندھی چلتی تو گھر میں بگولے ناچنے لگتے، نہ بجلی تھی نہ نل بہشتی سر پر لال جھاڑن ڈال کر پانی بھرنے آتا تھا۔ بان کے پلنگوں پر دری اور میلی کھدر کی چادریں اور چیکٹ، تکیے۔ اماں نے بارہ گز کا فرشی پاجامہ چھوڑ کر پانچ گز کی دھوتی پہننی شروع کر دی تھی۔

ایک زمانہ تھا جب گھر میں بیس نوکر تھے۔ جو غریب بھوکا ننگا آتا اماں اسے پناہ دے دیتیں۔ پھر پنشن کے بعد ابا میاں نے کفایت کی قینچی چلائی اور صرف علی بخش اس کی بیوی شیخانی بوا جو کھانا پکاتی تھیں اور کوچوان اور اس کی بیوی رہ گئے۔ کیونکہ اب بھی دو گھوڑے اور ایک بھینس تھی۔

شاید مسز امتیاز علی کی شاعرانہ فضا سے مجھے جلن پیدا ہو گئی۔ اپنے خاندان میں رومانی فضا کچھ ویسے بھی پھل پھول نہیں سکتی تھی۔ اور میں نے بڑے سوچ بچار کے بعد اپنی پہلی کہانی "بچپن" لکھی۔ گھر میں صرف تہذیب نسواں آتا تھا۔ میں نے وہ کہانی بھیج دی کہانی واپس آگئی اور ساتھ میں امتیاز علی تاج کے والد اور تہذیب نسواں کے ایڈیٹر ممتاز علی صاحب کا ڈانٹ پھٹکار بھرا خط۔ اس کہانی میں میں نے اپنے اور مسز حجاب امتیاز علی کے بچپن کا موازنہ کیا تھا۔ قابل اعتراض بات یہ تھی کہ مجھے قرآن شریف قرأت سے پڑھانے پر مولوی صاحب کی مار پڑتی تھی اور حلق سے عین صاف نہیں نکلتا تھا کوشش کرنے پر قے آجاتی تھی۔ انہوں نے لکھا کہ میں نے قرأت کا مذاق اڑا کر اپنی لا مذہبیت اور گناہ کاری کا ثبوت دیا تھا۔

یہ مضمون بعد میں جب میری کہانیاں چھپنے لگیں تو ساقی میں چھپا اور بہت پسند کیا گیا۔ مجھے عظیم بھائی کے رومانٹک چھیڑ چھاڑ سے بھری کہانیوں سے بھی چڑ آنے لگی۔

وہ چھوٹی تھیں ان میں ان کی زندگی کے کرب کا کوئی شائبہ نہ تھا۔ وہ دوسرے بھائیوں کی شوخی شرارت اور زندہ دلی کو اپنا بنا کر لکھتے تھے۔

میری یہ حالت تھی کہ کھسانی بلی کھمبا کھسوٹے۔ سچ بولنے پر عموماً میری مٹی پلید کی جاتی تھی۔ لیکن جب بات ابا میاں تک جاتی تو وہ فیصلہ میرے حق میں کرتے بڑی آپا جو انیس برس کی عمر میں بیوہ ہو گئی تھیں کڑوا نیم بن گئی تھی۔ علی گڑھ کے اونچے طبقے سے خاص طور پر خواجہ فیملی سے بے انتہا مرعوب تھیں اور خواجہ فیملی کی بیگموں سے میری ملحہ بھر نہ پٹتی میں سرپھری زبان دراز منہ پھٹ بدتمیز تھی۔ مجھ پر پردہ لاگو ہو چکا تھا مگر زبان تھی تلوار کسی کے بس میں نہ تھی۔

میرے اردگرد ایک دھوکہ رچا ہوا نظر آتا تھا۔ بظاہر شرمیلی اور باعزت بیٹیاں چھپ کر غسل خانوں اور اندھیرے کونوں میں رشتہ کے نوجوانوں سے چھین جھپٹ اور چوما چاٹی کرتی تھیں۔ اور بڑی شریف کہلاتی تھیں۔ مجھ جیسے بے تکے بیل سے کون لڑکا دلچسپی لیتا۔ میں نے اتنا کچھ پڑھا تھا کہ اگر بحث چھڑ جاتی تو میں ان نوجوانوں کو دھو ڈالتی جو کتاب کی صورت سے کانپتے تھے اور صرف مرد ہونے کے ناطے خود کو اونچا گردانتے تھے۔

پھر میں نے چوری چھپے انگارے پڑھی۔ رشیدہ آپا ہی مجھے ایک ایسی ہستی نظر آئیں جنہوں نے مجھ میں خود اعتمادی پیدا کی۔ میں نے انہیں اپنا گرو مان لیا۔ علی گڑھ کی چھوٹی زہر آلود فضا میں وہ بڑی بدنام تھیں۔ میری صاف گوئی کو انہوں نے سراہا اور پھر میں نے ان کی بتائی ہوئی کتابیں چاٹ ڈالیں۔

پھر میں نے لکھنا شروع کیا اور میرا ڈراما "فسادی" ساقی میں چھپا۔ اس کے بعد اور کہانیاں لکھیں اور کوئی کہانی رد نہیں ہوئی۔ ایک دم مجھ پر اعتراض ہونے لگے لیکن رسالوں سے میری کہانیوں کی مانگ بڑھنے لگی۔ میں نے اعتراضات کی کوئی پروا نہ کی۔

مگر جب میں نے "لحاف" لکھا تو بم پھٹ پڑا۔ ادبی اکھاڑے میں میرے پرزے اڑے کچھ لوگوں نے میری حمایت میں بھی قلم اٹھایا۔

اس دن سے مجھے فحش نگار کا لقب دے دیا گیا۔ لحاف سے پہلے اور لحاف کے بعد میں نے جو کچھ بھی لکھا کسی نے اس پر غور نہ کیا۔ میں جنسیات پر لکھنے والی فحش نگار ہی مانی گئی۔ یہ تو ابھی چند سال سے نوجوان طبقے نے مجھے بتایا کہ میں فحش نگار نہیں حقیقت نگار ہوں۔

میں خوش قسمت ہوں کہ جیتے جی مجھے سمجھنے والے پیدا ہو گئے۔ منٹو کو تو پاگل بنا دیا گیا۔ ترقی پسندوں نے بھی اس کا ساتھ نہ دیا۔ مجھے ترقی پسندوں نے ٹھکرایا نہیں اور نہ ہی سر پر چڑھایا۔ منٹو خاک میں مل گیا کیونکہ پاکستان میں وہ کنگال تھا۔ میں بہت آسودہ حال تھی۔ فلموں سے ہماری بہت اچھی آمدنی تھی اور ادبی موت یا زندگی کی پروا نہ تھی۔ اور ویسے میں ترقی پسندوں کی خود بھی چھپی ہوئی مٹھی بڑے زور شور سے انقلاب لا رہی تھی۔

لحاف کا لیبل اب بھی میری ہستی پر چپکا ہوا ہے اور جسے لوگ شہرت کہتے ہیں وہ بدنامی کی صورت میں اس افسانہ پر اتنی ملی کہ اُلٹی آنے لگی "لحاف" میری چڑ بن گیا تھا میں کچھ بھی لکھوں لحاف کی تہوں میں دب جاتا تھا۔

جب میں نے "ٹیڑھی لکیر" لکھی اور شاہد احمد دہلوی کو بھیجی تو انہوں نے محمد حسن عسکری کو پڑھنے کو دی انہوں نے مجھے رائے دی کہ میں اپنی ناول کی ہیروئن کو لحاف زدہ بنا دوں مارے غصہ کے میرا خون کھول اٹھا میں نے وہ ناول واپس منگوا لیا حالانکہ کتابت شروع ہو گئی تھی یہ ناول میں نے لاہور کے نذیر احمد کو دے دی۔ جب لاہور ہندوستان کا ایک شہر تھا۔

لحاف نے مجھے بڑے جوتے کھلوائے اس کہانی پر میری اور شاہد کی اتنی لڑائیاں

ہوئیں کہ زندگی جنگ کا میدان بن گئی۔

مگر مجھے لحاف کی بہت بڑی قیمت ملی۔ساری کوفت مٹ گئی۔

بہت دن بعد علی گڑھ گئی، وہ بیگم جن پر میں نے کہانی لکھی تھی ان کے خیال سے رونگٹے کھڑے ہونے لگے۔ لوگوں نے انہیں بتا دیا تھا کہ لحاف ان پر لکھی گئی ہے ایک دعوت میں ان سے سامنا ہوگیا۔ میرے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔ انہوں نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور پھول کی طرح کھل اٹھیں بھیڑ چیرتی ہوئی لپکیں اور مجھے گلے لگا لیا۔ مجھے ایک طرف لے گئیں اور بولیں۔

"پتہ ہے میں نے طلاق دے کر دوسری شادی کر لی ہے۔ ماشاءاللہ میرا چاند سا بیٹا ہے۔"

اور میرا جی چاہا کسی سے لپٹ کر زور زور سے رو دوں۔ آنسو روکے نہ رکے مگر میں قہقہے لگا رہی تھی۔ انہوں نے میری بڑی شاندار دعوت کی۔ میں مالا مال ہوگئی۔ ان کا پھول سا بچہ دیکھ کر مجھے ایسا لگا وہ میرا بھی کوئی ہے۔ میرے دماغ کا ٹکڑا، میرے ذہن کی جیتی جاگتی اولاد۔ میرے قلم کا بچہ!

اور میں نے جان لیا کہ چٹان میں بھی پھول کھل سکتے ہیں۔ خون جگر سے سینچنے کی شرط ہے! چلتے چلتے بس ایک بات اور۔ ایک صاحب سے میں نے پوچھا

"لحاف مخرب اخلاق ہے؟"

"قطعی!" وہ صاحب بولے۔

"وہ کیوں؟" میں نے پوچھا۔

اس کہانی کو پڑھ کر جنسی ہیجان پیدا ہوتا ہے۔"

"اہے ہے، کیا لحاف اوڑھنے کو جی چاہتا ہے؟"

"نہیں، دراصل بیگم بہت سیکسی ہے۔ ظالم بلا کی حسین ہے رنگ و بو میں تر البور سانچے میں ڈھلا جسم، گرم گرم ہونٹ، نشیلی آنکھیں، بس ایک دہکتی ہوئی شعلہ بداماں چھلکتا جام ہے۔"

"تو پھر؟"

"شیطان ورغلاتا ہے۔"

"کیا کہتا ہے شیطان؟"

"کہ...... کہ اس کے ساتھ ......"

"شیطان بڑا عقلمند ہے۔ یہی تو میں چاہتی تھی کہ کوئی مائی کا لال اسے ربو چڑیل کے جنگل سے آزاد کر کے اپنے دھڑکتے ہوئے سینے سے لگا کر اس بدنصیب حسینہ کی جنم جنم کی پیاس بجھا دے۔ پیاسی چڑیا کو پانی پلانا بہت بڑا ثواب ہے۔"

"بیگم کا پتہ کیا ہے؟" وہ صاحب مسکرائے:

آپ بڑی دیر سے پیدا ہوئے۔ وہ تو اب اللہ کے فضل سے دادی بن گئی ہیں برسوں ہوئے ایک شہزادہ انہیں کالے دیو کے جادوئی محل سے آزاد کر کے زندگی کے پُر بہار چمن میں لے اڑا۔"

دور کسی فلیٹ میں نیرہ نور فیض کی نظم گا رہی تھی۔

"ان بیاہتاؤں کے نام
جن کے بدن۔
بے محبت ریاکار سیجوں پہ سج سج کے اکتا گئے ہیں۔

اور میں سوچنے لگی، کہاں ہے بھارت کی وہ مہان ناری۔

وہ تقدس کی دیوی سیتا جس کے کنول جیسے نازک پیروں نے آگ کے شعلوں

کو ٹھنڈا کر دیا۔

اور میرا بائی جس نے بڑھ کر خدا کے گلے میں باہنیں ڈالدیں۔

وہ ستی ساوتری جو یم دوت سے اپنے ستیاوان کی جیون جیوتی چھین لائی

اور رضیہ سلطانہ جس نے بڑے بڑے شہنشاہوں کو ٹھکرا کر ایک حبشی غلام کو اپنا ایمان بنا لیا۔

"کیا وہ آج لحاف میں دبکی پڑی ہے۔

یا فورس روڈ پر خاک و خون سے ہولی کھیل رہی ہے۔

ننھے بھائی نے ہمیشہ آزاد بھیڑیے کی سی زندگی گزاری تھی بے حد آوارہ خود سر اور آرام طلب تھے منّے بھائی کے سوا سب کو دھمکانا رعب جمانا اور ٹھکائی بھی کرنا۔ منّے بھائی ہمیشہ کے بیمار تھے۔ وہ انہیں بالکل اپاہج اور لاچار سمجھ کر ان پر رحم بھی کھاتے تھے اور بے حد محبت بھی کرتے تھے جبکہ منّے بھائی کو ان کی آزادروی اچھی صحت اور جامہ زیبی پر رشک آتا تھا۔ منّے بھائی پر کوئی کپڑا نہ سجتا اور ننھے بھائی کا جسم اتنا سڈول قد اونچا کہ بنیان اور نیکر ہی میں بانکے لگتے تھے اور اپنی سوکھی نسوں دار ٹانگیں کھولتے ہوئے منّے بھائی کو خوف آتا تھا۔

اتنا سب کو معلوم تھا کہ ایک کے پاس اگر حسین جسم ہے تو دوسرے کے پاس بے حد تیز رفتار اور زندہ دماغ منّے بھائی جب بھی ننھے بھائی کو گھوڑے پر سرپٹ دوڑتے بازیں پھلانگتے تو ان کا منہ، ذرا سا ہو جاتا تھا اور وہ ننھے بھائی کو نیچا دکھانے کی ہر ممکن کوشش کر ڈالتے۔ مگر وہ ساتھ ساتھ انہیں سب بھائی بہنوں سے زیادہ چاہتے بھی تھے جب دمہ کا دورہ پڑتا یا درد گردہ سے مچھلی کی طرح تڑپتے تو ماں باپ کے بجائے ہمیشہ ننھے بھائی کو پکارتے۔

ننھے بھائی کبھی ان کی اس حرکت کا بُرا نہیں مانتے۔ ایسی عجیب تضادل

سے مسکرا کر دیکھتے کہ منّے بھائی پانی ہو جاتے جیسے کہہ رہے ہوں۔

"تم ادھورے انسان ہو، قابلِ رحم ہو"

"عجیب محبّت اور نفرت کا کھیل تھا۔

ننھے بھائی تگڑے بھی تھے خوش مزاج بھی تھے۔ ان سے لوگ ڈرتے بھی تھے اور پسند بھی کرتے تھے۔ ایک ماں کے دو بیٹے قطعی کسی بات میں نہیں ملتے تھے۔ صورت ناک نقشہ عادت سب الگ۔ منے بھائی کو دکھ تھا کہ لوگ ان پر رحم کھاتے ہیں۔ ان کی فکر کرتے ہیں اور ننھے بھائی سے مرعوب ہیں جب انہوں نے باوجود بیماری کے بڑی آسانی سے بی اے کر لیا تو ایک دن قریب قریب اسی آسانی سے سیکنڈ ڈویژن میں ننھے بھائی نے ایف اے بھی پاس کر لیا۔ اور مزہ یہ ہے کہ انہیں کسی نے پڑھتے نہیں پکڑا نہ جانے کہاں جا کر پڑھتے تھے۔

بچپن میں کوئی پوچھتا کس سے شادی کرے گی تو میں فوراً کہتی ننھے بھائی سے اور جب نو دس برس کی شوکت آپا نے اعلان کیا کہ وہ ننھے بھائی سے شادی کریں گی، تو میں نے انہیں خوب کھسوٹا اور ننھے بھائی سے شکایت کر دی۔ انہوں نے شوکت آپا کی چٹیا پلنگ کے پائے سے باندھ دی اور بولے۔

"بتا، اب کرے گی شادی؟" شوکت آپا نے فوراً توبہ کی اور جان بخشی ہوئی ان کی۔ یہ بات سب کے ذہن سے اتر گئی مگر شوکت آپا نہیں بھولیں۔

اور ایک دن انہوں نے خاندان کے سب سے زیادہ سجیلے اور وجیہہ نوجوان کو پا ہی لیا۔ کبھی دل میں شبہ لرز اٹھتا ہے شوکت آپا کو ننھے بھائی سے نہیں غیر ارادی طور پر ان کی شخصیت اور رعب سے عشق تھا۔ وہ "ولی عہد" سے شادی کر کے پورے خاندان میں ایک مقام حاصل کرنا چاہتی تھیں۔ بڑے پیارے پیارے خواب دیکھا کرتی تھیں ایک دن کہنے لگیں۔

ننھے میاں وکالت کر کے لندن جائیں گے۔ بڑا عہدہ پائیں گے اور انہیں سر کا خطاب ملے گا۔ اور ہم لیڈی نسیم کہلائیں گے"۔

غریب کا سارے گھر نے مذاق بنایا کر رودیں۔ ننھے بھائی نے خود انہیں بہت چڑایا اور جب وہ انہیں لیڈی نسیم کہہ کر پکارتے تو شوکت آپا دھاروں دھار رو دیتیں۔

شوکت آپا نے بڑے ذہنی دکھ جھیلے تھے۔ ماں کے مرنے کے بعد وہ رُل گئی تھیں۔ ماموں جودھپور میں یار دوستوں کے جھگڑے میں دو چھوٹے بچوں یعنی جگنو اور شوکت آپا کی دیکھ بھال نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے وہ اپنی پھوپھی یعنی ہماری اماں کے ہاں رہتی تھیں، اماں کو اپنے ہی بچوں سے لاڈ کرنے کی فرصت نہ تھی۔ صورت سے اکتائی تھیں وہ کسی کے بچے کو خاک پیار دیتیں۔ جگنو نے عجیب طبیعت پائی تھی۔ چھوٹی سی عمر سے ہی نہایت سنجیدہ اور سیدھے تھے۔ خود کبھی شرارت نہیں کرتے تھے، اور نہ کبھی کسی کی شکایت کرتے تھے۔ گھر میں وہی ایک بچے تھے جن پر نہ کبھی ڈانٹ پڑتی نہ مار۔ ماں کو موت نے باپ کو حالات نے چھین لیا تو وہ عمر سے پہلے ہی بوڑھے ہو گئے، مجھ جیسی بد لڑکی کو بھائی چھیڑتے مارتے ستاتے، جگنو نے کبھی نہ مارا نہ ستایا۔ سارا گھر انہیں پیار کرتا تھا۔ نوکر جو ہم بچوں کی حرکتوں سے نالاں تھے جگنو پر سب مہربان تھے۔ نہایت خاموش طبع ہونے کے باوجود ذہن اور کھیل کود میں اپنی عمر سے زیادہ تیز تھے کبھی کوئی بچپنے کی بات ہی نہیں کرتے تھے۔

شوکت آپا اپنی نانی اماں یعنی ہماری خاندانی دشمن بچھو پھوپھی پر جان چھڑکتی تھیں۔ یہ ایک قسم کی غداری سمجھی جاتی تھی۔ جگنو کبھی ان کا نام بھی نہ لیتے تھے۔ نہ بُرا نہ اچھا۔ بس خاموشی اختیار کر لیتے۔ معصوم شوکت آپا خدا جانے ان کے ننھے سے ذہن پر کیا بیتتی ہو گی۔ وہ ضد کر کے نانی کے پاس جاتیں۔ اچھے موڈ میں ہوتیں تو لاڈ

کرتیں، اور ایک دم یاد آجاتا کہ یہ اسی ناہنجار ظفر حسین کی بیٹی ہے۔ جس نے ان کی لاڈلی مسرت جہاں کو تکلیف دے دے کر مارا تو ان پر بے پناہ غصہ سوار ہو جاتا اور وہ شوکت آپا کو واپس پھوپھی کے ہاں پھنکوا دیتیں۔

تب انہیں سب چھیڑتے طعنے دیتے۔

انسان کن کن طریقوں سے دوسرے انسان کا خون بہاتا ہے۔ بزرگوں کے جھگڑوں میں معصوم بچوں پر کیا کچھ گزرتی ہے۔ نفرتوں کے بیچ میں پلنے والا بچہ دل و دماغ پر کیسے کیسے زخم سہتا ہے۔ یہ زخم ہمیشہ کسی نہ کسی ٹھیس پر رسنے لگتے ہیں۔

نفرت کا ایک طوفان سمیٹے شوکت آپا جوان ہوئیں اور اپنی دانست میں انہوں نے رستم زماں کی پناہ لی اور اپنی سلطنت کی بنیادیں مستحکم کرنا شروع کر دیں۔ کاش! اللہ تعالیٰ نے تھوڑی سی بڑے بھائی جگنو کی بردباری سوچ سمجھ اور صبر بھی انہیں دیا ہوتا کسی رشتے والے کے ٹکڑوں پر رہنا اور جواب میں عزت اور محبت مانگنا۔ دھونس جما کر مانگنا کسی طرح بھی ممکن نہیں جگنو تو نوکروں تک میں ہر دلعزیز تھا۔ کبھی کسی پر حکم نہیں چلاتے اور ان سے بڑے تمیز سے باتیں کرتے۔ نوکر شوقیہ ان کا کام کرنے پر مصر رہتے سب پیسوں کی ضد کرتے جگنو بے تعلق کسی کام میں خاموش جٹے رہتے۔ اماں دیکھتیں تو ان کا جی بھر آتا۔

"ارے تو نے نہیں مانگے پیسے جگنو"

" اماں ابھی ہیں ہمارے پاس پیسے "جگنو، پھوپھی کو اماں کہتے تھے۔

اور اماں انہیں ڈانٹ کر پیسے دیتیں۔ پھل، مٹھائی کتنا بھی جی للچائے کبھی جھپٹا مار کر نہیں چھینی۔ اسی لئے اماں سب سے پہلے جگنو کا حصہ نکالتیں اور شوکت آپا کو ہمیشہ بھول جاتیں۔

شوکت آپا کی آئیڈیل بچھو پھوپھی تھیں۔ جنہیں خود میں نے بہت دیر میں پایا

انہیں بے ماں کی بچی پر پیار آتا تو کلیجے سے لگاتیں، پھر پرانے زخم تازہ ہونے لگتے تو دھتکار دیتیں۔

عورت ہمیشہ ننھے بھائی کی کمزوری رہی تھی۔ بہت ہی کمسنی میں وہ اس کے وجود سے واقف ہو گئے تھے۔ اور پھر شوکت آپا تو خیر کل سولہ سترہ کا سن، بالکل لٹو ہو گئے۔ صبح اٹھتے ہی ناشتہ کمرے ہی میں منگا لیتے۔ سیدھے کالج جاتے وہاں سے سیدھے کمرے میں چٹخنی چڑھ جاتی۔ رات کا کھانا بھی کمرے میں منگا لیتے، پھر چٹخنی چڑھ جاتی۔

وہ بھائی جو ہم سب کے ساتھ زیادہ وقت گزارتے تھے، بالکل ہی غائب ہو گئے گھر میں آتے ہی ہلچل مچا دیتے اسے چھیڑنے اُسے ستانا، بچوں کو اچھالنا، گدگدانا، ابا سے شکار کے بارے میں مباحثہ، پھر اماں کے پہلو سے لگ کر بیٹھ جاتے مگر شادی کے بعد وہ شوکت آپا کے ہو کر رہ گئے۔

سارا گھر ننھے بھائی اور شوکت آپا سے دل ہی دل میں کھینچنے لگا گو منہ سے کسی نے کچھ نہ کہا۔

اُدھر منے بھائی اور دُلہن بھابی پرانے بیاہے تھے۔ تین بچوں کے والدین اتنی پٹخنیاں نہیں چڑھتی تھیں اور ننھے بھائی کو مشغول پا کر ان لوگوں نے زیادہ وقت مجمع کے ساتھ گزارنا شروع کر دیا۔ منے بھائی بڑی جابکدستی سے ننھے بھائی کی غیر حاضری پر تاسف کرتے۔ دُلہن بھابی بھی زیادہ وقت اماں کے پاس گزارنے لگیں۔

ہم سب کی عادت تھی کہ جیسے ہی ننھے بھائی گھر میں داخل ہوتے سب انہیں گھیر لیتے۔ کچھ نہ کچھ ان کی جیبوں سے نکل ہی آتا۔ خاص طور پر اگر کالج میں کوئی پارٹی ہوتی تو جیبیں سوکھے میوے ٹوفیوں سے بھری ہوتیں۔ ہم ان پر ٹوٹ پڑتے اور لوٹ کر رکھ دیتے۔

اب شوکت آپا ٹافیوں کے کاغذ دکھا کر کہہ دیتیں "یہ سب ختم ہو گئیں" ویسے بھی دُلہن بھابی غیر ہوتے ہوئے بہت قریب لگتی تھیں، سب کے ساتھ تاش چپکی کھیلتیں۔ شوکت آپا کو ان کھیلوں سے دلچسپی ہی نہیں تھی۔ مجبوراً ننھے بھائی نے بھی کھیلنا چھوڑ دیا۔ آج سمجھ میں آتا ہے کہ بہو سے ساس نندیں کیوں جلنے لگتی ہیں۔
شکر خدا کا کہ ہمیں نہ بھائیوں کی کمی تھی نہ بھاوج بھتیجیوں کی۔ بس ایک دم ایسا رویہ اختیار کر لیا جیسے ننھے بھائی اور شوکت آپا گھر میں رہتے ہی نہیں۔
ایک اور واقعہ ہوا جس سے بڑی دل میں تلخی پیدا ہوئی۔ کل خط میرے نام آیا وہ ننھے بھائی نے کھول لیا۔ کیونکہ میرے نام کوئی خط ہی نہیں آیا کرتا تھا۔ وہ انہوں نے شوکت آپا کو دے دیا۔ شوکت آپا نے مجھے بلا کر بڑی کڑوی کسیلی باتیں کہیں کہ میں لڑکے گھیرتی ہوں۔ مجھ پر خون سوار ہو گیا۔ اور انہیں مارتے مارتے چھوڑا۔
منے بھائی مجھے روز رات کو پڑھاتے تھے۔ انہوں نے مجھے جھنجلایا ہوا دیکھ کر پوچھا تو میں نے بتا دیا۔

"کون ہے وہ لڑکا؟" انہوں نے پوچھا۔

"مجھے کیا معلوم ——— ؟"

"خیر تمہارا کوئی قصور نہیں، تم کیوں رنجیدہ ہوتی ہو۔"

ایک دن ہم چبوترے پر بیٹھے تھے کہ ننھے بھائی کمرے سے نکلے "اے وسیم جسیم، شمیم چی چنو، جتو بیر، غور سے سنو" اتنے میں شوکت آپا بھی آ گئیں۔ ہم سب غور سے سننے لگے۔

"دیکھو! آج سے تم سب شوکت کا نام نہیں لو گے۔ بھابی جان کہو گی" "کیوں شوکت اب تو خوش ہو؟"

تھوڑی دیر تک تو ہم سب ان کا منہ تکتے رہے۔ پھر ایک دم پبلک نے

صدائے احتجاج بلند کی اور چاروں طرف سے بغاوت کا اعلان ہونے لگا۔

ابا میاں کھانے کے چبوترے کے قریب ہی پلنگ پر گاؤ تکیہ کے سہارے بیٹھے پھل کھا رہے تھے۔ وہ شام کو صرف پھل اور خشک میوہ ہی کھایا کرتے تھے۔ اماں انہیں نارنگی کی پھانکوں کے چھلکے اتار کر دیتی جا رہی تھیں۔ چمکتی ہوئی آنکھوں سے وہ یہ گھریلو ڈراما دیکھ رہے تھے۔ ان کی سفید بڑی بڑی قیصر کٹ مونچھوں میں مسکراہٹ آنکھ مچولی کھیل رہی تھی۔ غل کی آواز سن کر منے بھائی بھی سالن کی پلیٹ اور روٹی پکڑے آن پہنچے۔ دلہن بھابی کندھے سے بچو کو لگائے ساتھ تھیں، ان کے پیچھے ان کا نوکر چھوکرا سینی میں باقی کھانا لئے چلا آ رہا تھا۔ جیسے تلوار کی جھنکار سن کر قبیلے کے سورما زرہ بکتر سنبھال کر میدان میں کود پڑتے ہیں۔

معاملے کی تفصیل سن کر منے بھائی نے کہا۔

"قاعدے سے ہمیں اور ہماری بیوی کو بھی شوکت کو بھابی جان کہنا چاہیئے۔"

"ہم ہرگز بھابی جان نہیں کہیں گے"۔ جنتا یک زبان ہو کر چیخی۔

"کبھی جو کہہ جائیں"

"تم کیا کر لوگے ہمارا"

"لو لو شوکت ہم کیا کریں ان پاجیوں کا؟ یہ تو نہیں مانتے"۔ ننھے بھائی اپنی پرانی معصومیت سے بولے۔

"میں کیا جانوں"۔ شوکت آپا کی حالت غیر تھی۔ پاؤں بھاری تھا۔ وہ اُلٹی کرنے بھاگیں۔

"چڑیل کتنا اترائی ہے"! نسیم بڑبڑائے۔

"مگر ننھے بھائی، مسمی شوکت، یعنی درحقیقت رشتہ کی رو سے ان کا

مطالبہ قطعی جائز ہے، کیوں سرکار"

"دلیل پیش کی جائے"۔ ابا نے مجسٹریٹی شان سے کہا۔

"مائی لارڈ مسماۃ شوکت، بڑے بیٹے کی بیاہتا ہے۔ مستقبل کی پٹ رانی، ولی عہد کی زوجہ، انہیں واجب آداب وصول کرنے کا پورا پورا حق حاصل ہے"

پھر وہ ہم سے بولے۔

"تم سب ہماری بیوی کو دلہن بھابی کہتے ہو۔ پھر بے چاری شوکت یعنی بھابی جان کے ساتھ یہ ناانصافی کیوں؟"

منے بھائی ہمیشہ آگ پر تیل چھڑکنے کی تاک میں رہتے تھے۔ جب کوئی چٹکیا ہوتا تو ایسے ایسے جملے تراشتے واقعات کو گھما پھرا کر ایسا الجھاتے کہ سب اس کی لپیٹ میں آ جاتے۔ خوب جملے چھٹتے، سنتاپیاں چھوٹتیں، بچوں کی زبان پر دھار رکھ جاتی اور ہم سب کا چلوؤں خون بڑھنے لگتا۔

"اب شوکت قے کر کے واپس آئیں تو رائے دیں گی کہ کیا کیا جائے"

"ہاں تو تو بڑا جورو کا غلام ہے کہ شوکت کے اشاروں پر ناچتا ہے!"

"بے شک ہم نہایت تابعدار جورو کے غلام ہیں، سرکار خود جورو کے غلام ہیں"

"اے ہوش میں آ...... کلمو ہے"

"ارے یقین نہ آئے تو پھوپھی سے پوچھ لو"

"ہر صلح پسند انسان جورو کا غلام ہے"۔ منے بھائی نے کہا۔

"آئے ہائے بڑے جورو کے غلام ہیں، ذرا سا کھانا بگڑ جائے پوری تپلی دری میں لوٹ دیں"۔ دلہن بھابی بولیں۔

"بے چارے جورو کے غلام ہی تو تپلی موری میں لوٹتے ہیں۔ جورو کو نہیں

لوٹ پاتے۔"

"ارے شوکت اب آبھی چکو کتی تقے کروگی۔"

"اچھا ننھے بیوی کا نام کیوں لیتے ہیں؟"

"پھر کیا کہیں؟" ننھے بھائی بولے۔

"آپا یا منے بھائی کی طرح بیوی یا بیگم کہیں۔" جلتا نے ڈیمانڈ کی۔

"ہم تو انہیں کبھی خانم بھی کہتے ہیں۔" منے بھائی بولے۔

یہ جھول ہے، ہم شوکت کو بیوی یا بیگم کہہ کر پکاریں اور اماں وارد ہو جائیں یا تمہاری بیوی دوڑی چلی آئے تو بڑی بے جا بات ہو جائے گی۔"

"سخت گھپلا ہے! مسماۃ شوکت عرف بھابی جان کا مطالبہ جائز ہے۔ اور پبلک کو ماننا ہی پڑے گا۔"

"ایسی کی تیسی شوکت کی، ہم قطعی اس چڑیل کو بھابی جان نہیں کہیں گے۔" شمیم بھڑک اٹھے۔ انہوں نے بچپن میں شوکت آپا کو بہت پیٹا تھا۔

"کہہ تو سکتے ہیں مگر......" چبو بولے۔

"مگر......"

"پیسے دو ——؟"

"کم سے کم دو روپیہ مہینہ۔"

"دماغ خراب ہوا ہے، دو روپیہ مہینہ میری جُوتی دیتی ہے۔" شوکت آپا بگڑ اٹھیں۔

"دو فی کس۔" چنوار گئے۔

شوکت آپا بگڑ اٹھیں۔ کل تیس روپیہ تو دونوں کو جیب خرچ ملتے تھے۔ اس میں سے......اُف حساب لگانے کے خیال سے ہی چکر آنے لگے۔ "واہ واہ میں تو کوڑی بھی نہیں دینے کی!" "خوگیر کی بھرتی، اور فی کس دو روپیہ اندھیر ہے کہ نہیں۔"

"بھئی دو، دو روپیہ دو تو ہم خود تمہیں بھابی جان کہنے کو تیار ہیں۔" ننھے بھائی لجاجت سے بولے۔

"سب پیسے تم دبا لیتی ہو۔"

"کیوں سرکار آپ کی کیا رائے ہے؟" منے بھائی نے پوچھا۔

"ہم اس معاملے میں دخل نہیں دینا چاہتے۔"

"لیکن چھوٹے چھوٹے بچے شوکت کا نام لیں، یہ بدتمیزی ہے۔ ننھے بھائی ان کی ٹھکائی کر سکتے ہیں۔" منے بھائی چورن میں نوشادر ملانے کے قائل تھے۔

ہمیں قطعی کوئی انکار نہ ہوگا۔ ہم ٹھکائی کے لئے تیار ہیں۔" ننھے بھائی آستین چڑھانے لگے۔

جلتا خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔

"سرکار تو کچھ نہ کہیں گے؟" منے بھائی دھیرے سے بولے۔

"نہیں! ہم بچوں کے بیچ میں بولنے کے قطعی قائل نہیں۔ بشرطیکہ مارنے کی وجہ معقول ہو۔"

اب بڑی مصیبت آئی۔ ننھے بھائی تگڑے تھے۔ کوئی بہانا بنا کر ٹھوک سکتے تھے۔ اور ان ننھے شریر بچوں کے لئے بہانہ تلاش کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ بہانے ہر وقت موجود رہتے تھے۔

فوراً ایک خفیہ میٹنگ کال کی گئی جس میں جگنو بھی شامل تھے۔ وہ شوکت کے سگے بھائی تھے مگر وہ پارٹی بازی میں یقین نہیں رکھتے تھے، اور بڑے سوچ بچار کے بعد انہوں نے ہی یہ ترکیب بتائی کہ "شوکت کا بائیکاٹ کر دو۔ وہ اس طرح کہ چاہے جان پر بن جائے ان کا نام ہی نہ لو۔"

جگنو گاندھیائی اصول کے پیروکار تھے ویسے بھی سب ان سے کچھ دبتے

تھے، جنو شمیم اور محبیب کو ہوم ورک میں مدد دیتے تھے۔ جسیم بھائی سے سب بے حد یارانہ تھا۔ مجھے جغرافیہ پڑھاتے تھے۔ اگر وہ شوکت آپا کی حمایت کرتے تو مشکل پڑ جاتی ہم ان سے بدظن ہو جاتے۔ اور شوکت آپا کو وہ بہت چاہتے تھے۔

میں جناب ہو گئی شروع ستیہ گرہ۔ اِدھر ہم اتنے اُدھر وہ ننھے بھائی کے کالج جانے کے بعد تن تنہا رہ جاتیں۔ انہوں نے دُلہن بھابی کے ساتھ مل کر محاذ بنانا چاہا مگر وہ کامیاب نہ ہو سکا، دلہن بھابی تاش کی چسپی کی شوقین اور شوکت آپا کو دُنیا کے تمام کھیلوں سے نفرت۔

شوکت آپا کا دم گھٹنے لگا۔ ہم اُن سے قطعی بات نہ کرتے وہ کچھ پوچھتیں تو بالکل ایسے بنے رہتے جیسے سُنا ہی نہیں۔ خود کھُسر پھُسر کر کے قہقہے لگاتے۔ ننھے بھائی اول تو کچھ نوٹس نہ لیتے اور پھر ان کا بائیکاٹ کر دیا۔ انہیں آتا دیکھ کر سب نہایت ضروری کام سے تتر بتر ہو جاتے اور ان سے بہت دور جا کر بات بے بات قہقہے لگاتے۔ منے بھائی فوراً ہمارے محاذ میں شریک ہو جاتے اور گروہ بن کر تاش کھیلے جانے لگتے۔ ننھے بھائی کو تاشوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ جگنو اتنے پڑھاکو تھے کہ شوکت آپا بلاتیں تو چلے جاتے۔ سوائے شکایتوں کے ان کے پاس دوسرا کوئی موضوع نہ تھا۔ وہ غیر جانب دار بنے خاموش سنتے رہتے پھر پڑھائی میں لگ جاتے اس تنازعے سے جان بچانے کے لئے وہ اپنے دوست کے ہاں پڑھنے چلے جاتے۔

میری اماں کے بیٹے کہلانے کے اصلی حق دار جگنو تھے۔ پھوپھی بھتیجے کے کردار میں بڑی مماثلت پائی جاتی تھی۔ ان کے تعلقات اپنی نانی ہماری بجھو پھوپھی سے بھی بڑے پُر تکلف تھے۔ وہ ہمارے بھائیوں اور ابا میاں کے ساتھ عید بقرعید جاتے، پھوپھی بادشاہی انہیں بڑی تلخ باتیں کہتیں۔ پھوپھی کے ٹکڑوں پہ پلنے کے

طعنے دیتیں مگر وہ بیچارے دکھی ہونے کے ہولے ہولے مسکراتے کہ پھوپھی کا خون کھول اٹھتا۔ جیسے میری اماں پھوپھی کی گالیاں کو سنے سن کر مسکرائی رہتی تھیں۔ لوگ پوچھتے انہیں بُرا نہیں لگتا۔

"اے واہ مجھے کاہے کو بُرا لگے۔ وہ بزرگ ہیں انہیں حق ہے جو چاہیں کہیں" اماں بھولی صورت بنا کر کہتیں۔

ہمارے دونوں ماموں ابا میاں کی بے انتہا عزت کرتے تھے۔ بہن سے زیادہ ان سے عقیدت تھی۔ ابا کو اُن سے کوئی شکایت نہ تھی کہ انہوں نے ان کی اکلوتی لاڈلی بہن بادشاہی خانم کی بیٹی کے خون سے ہاتھ رنگے۔ وہ کسی معاملے میں ٹانگ اڑانے کے قائل نہ تھے۔ حالانکہ پھوپھی اماں کا خیال تھا وہ جورو کے غلام ہیں، اور اُلو کا گوشت کھلا دیا گیا ہے۔

جگنو ہم سب کو بہت پسند تھے۔ مگر جب ان سے میری شادی کا ذکر چلا اور شوکت آپا کی زبانی مجھے بزرگوں کی رائے کا پتہ چلا تو میں ایک دم لگا ہیں تڑانے لگی —

"جانتی ہو جگنو سے تمہاری شادی کے منصوبے بن رہے ہیں۔ مگر میں ہرگز یہ شادی نہیں ہونے دوں گی۔ خدا نہ کرے جو تم جیسی خود سر زبان دراز سے میرے بھائی کی قسمت پھوٹے۔"

"ہونہہ! اس گدھے سے میں کب شادی کرنا چاہتی ہوں۔ لعنت ہے تبر بجو، مجھے گھن آتی ہے کمبخت سے۔" میں نے اپنی حمایت میں وہ کچھ کہہ ڈالا جو میں قطعی نہیں سوچتی تھی۔ جگنو مجھے بے حد پسند تھے۔ شادی کا تو خیال بھی نہیں آیا تھا۔ مگر صرف جگنو سے نہ میں نے کبھی زبان چلائی نہ بد تمیزی کی خاصہ رُعب تھا، حالانکہ وہ چند سال ہی بڑے تھے۔ مگر مجھے اچھی طرح پڑھاتے تھے۔

جب مجھے معلوم بھی نہ تھا کہ میرے سگے بھائی نہیں، جب میں سوچتی تھی سب لڑکے بھائی ہی ہوتے ہیں، دوسرے کسی رشتہ کا گمان بھی نہ تھا۔ جگنو بھوتوں، پریوں کی بڑی دلچسپ کہانیاں بڑے ڈرامائی انداز سے سنایا کرتے تھے۔ مجھے کبھی نہیں چھیڑا نہ کبھی میری گڑیا چھپری۔ اللہ میاں کے بارے میں انہوں نے پہلی بار مجھے معلومات پہنچائی۔ انہوں نے بڑی تیزی سے سب سے پہلے قرآن شریف پڑھ لیا تھا۔ انہیں وسیم بھائی بہت ستاتے اور مارتے تھے۔ مگر میں نے ان سے کبھی شکایت نہیں سُنی۔ مذاق میں اڑا دیتے تھے کہ راستے میں سارے وقت دھکے دیتے چلتے ہیں۔

مجھے جگنو ہمیشہ بہت پیارے تھے۔ اگر ان سے میری شادی ہو جاتی تو میں ایک نہایت پتی ورتا بن جاتی، مجھے دراز قد مرد پسند تھے اور وہ گھر میں سب سے اُونچے نکلتے تھے۔ آج میں اپنی کہانیوں کے ہیرو کو پرکھتی ہوں تو انہیں بالکل "جگنو" پاتی ہوں جگنو کے دل کا حال میں وثوق سے نہیں بتا سکتی ہوں مگر میں نے ہمیشہ انہیں اپنا روحانی محبوب مانا۔ اُف اگر جگنو نے یہ الفاظ پڑھ لئے تو کیا ردِ عمل ہوگا!

مگر اب میں اور وہ دونوں ردِ عمل کے دائرے سے خارج ہو چکے ہیں۔ وہ ایک نہایت کامیاب ڈاکٹر بہترین شوہر اچھے باپ اور اب تو ماشاءاللہ نانا اور دادا بھی بن گئے ہیں۔ اگر میری شادی ان سے ہو جاتی تو وہ مجھے مٹی کا تودہ بنا دیتے اور ساری بیمابیت ختم ہو جاتی۔ میری سمجھ بوجھ پر ایک بھاری سا تالا بن کر جم جاتے اُس دن سے میرے اور جگنو کے درمیان ایک دیوار سی حائل ہو گئی۔

[illegible] کے شوکت آپا کی زچگی ہوئی۔ بیٹا پیدا ہوا۔ نہایت تندرست اور پیارا۔ مگر ہم لوگ اس پر ایسے ٹوٹ کر نہیں گرے جیسے منے بھائی کے بیٹے زعیم عرف بجّو پر قربان ہو گئے تھے۔ ابا بھی بڑے خوش تھے۔ دو پوتیوں کے بعد پہلا پوتا

پیدا ہوا تھا۔ نعیم پہلا نہ تھا۔ پہلے اسے ہم نے پیار کرنے کی کوشش کی مگر شوکت آپا نے پابندیاں لگائیں سو رہا ہے۔ جگایا تو ہلکان ہو جائے گا۔ ہم نے منے بھائی کے بچے کو گڑیوں کی طرح استعمال کیا تھا۔ اسکول سے آتے ہی چاہے سوتا ہو یا جاگتا اٹھا لیتے تھے۔ دلہن بھابی کچھ نہیں کہتی تھیں، اگر وہ چڑچڑا پن کر رونے لگتا تو ماں کی گود میں ڈال کر کوئی دلچسپی تلاش کر لیتے۔ دُلہن بھابی چڑھ جاتیں تو دودھ کے بچے کو ہی لگا دیتیں ہمیں کچھ نہ کہتیں۔

اب یہ حال ہو گیا کہ ہم نعیم کو ترسانے کے لئے زعیم سے کھیلتے پیار کرتے رُلاتے ستاتے وہ اس کا عادی ہو چکا تھا۔ نعیم گھس کر آتا تو اسے بے توجہی سے الگ کر دیتے۔ اُف یہ نند دیور بھی بڑے کمینے ہوتے ہیں جو کہ ہم تھے۔

ننھے بھائی سب ہی بچوں کو پیار کرتے تھے۔ منے بھائی کے بچے بیمار باپ سے دور رہتے اور ان سے چمٹتے وہ انہیں اچھالتے، ہتھیلی پر کھڑا کرتے۔ زعیم باپ کی طرح سوکھا مارا تھا، ہلکا پھلکا، تیز طرار بے انتہا چلبلا، نعیم بے حد موٹا اور ذرا ہلکا تھا۔ شوکت آپا کو جلانے کے لئے ہم اس کے ساتھ رکھائی سے پیش آتے ہاں میں نے اور نیر نے شوکت آپا کے نرمی اور پیار سے کہنے پر انہیں مفت ہی شوکت آپا کہنا شروع کر دیا تھا۔ پھر ہماری دیکھا دیکھی مجیب، نیر اور جگنو بھی کہنے لگے، شمیم شوکت ہی کہتے اور چُنو بات ہی نہیں کرتے ان کی سبیتہ گرہ جاری تھی۔

پھر ایک دم ابا میاں سانبھر میں جج کی حیثیت سے مقرر ہو گئے۔ گھر درہم برہم ہو گیا۔ ابا اماں کے بغیر ایک پل نہیں رہ سکتے تھے۔ جسیم، شمیم، مجیب اور حبیب کو ننھے بھائی اور شوکت آپا کی تحویل میں چھوڑنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ ابا میاں سب کا خرچ ننھے بھائی کو بھیج دیتے تھے۔ ابا میاں کے ساتھ ہی منے بھائی بھی جودھپور چلے گئے۔

جسیم بھائی بڑے تند مزاج تھے، شمیم اور چھنو حد درجے کے بدذات مجیب دوسرے جگنو تھے اور حبیب دوسرا چھنو، نہایت شریر اور خود سر۔ جگنو ایف ایس سی کے بعد بمبئی میں ڈاکٹری پڑھنے چلے گئے۔ میں اور بنّو اماں کے ساتھ سانبھر چلے گئے۔ ہماری پڑھائی پر کسی نے توجہ نہ دی۔

لڑکے ننھے بھائی اور شوکت آپا کے بس کے نہیں تھے۔ دونوں کا ناک میں دم کر ڈالا۔ انہوں نے بھی مورچہ قائم کر کے کھانے کھانے کی مار دی۔ ابا کے پاس دونوں پارٹیوں کی شکائتیں جاتیں۔ مگر کوئی علاج نظر نہ آتا۔ نہ جانے شکائتیں کس حد تک صحیح تھیں۔

جسیم بھائی بی۔ ایس۔ سی کر کے آگرہ یونیورسٹی میں ایم۔ ایس۔ سی کرنے چلے گئے۔ چھنو کو ٹائیفائڈ نے ایسا دبوچا کہ اُسے جودھپور علاج کے لئے بھیجنا پڑا کیونکہ سانبھر میں کوئی اچھا انتظام نہ تھا۔ آپا نے مجیب کو ممانی جان کے ہاں رکھ دیا اور حبیب کو بریلی۔ سارا انتظام تتر بتر ہو گیا۔ ننھے بھائی کے گھر کا خرچ جو ابا بھیجتے تھے بڑی تنگی سے پورا پڑتا تھا۔

قلم بے دم ہوا جاتا ہے جب علی گڑھ چھوڑنے کا سماں یاد آتا تھا۔ اسکولوں کی چھٹیاں تھیں۔ میری تعلیم کے سب دروازے ایک دم بند ہو گئے۔

میں نے بہت خوشامد کی کہ بورڈنگ میں داخل کرا دی جاؤں مگر بے حد سختی سے ڈانٹ دیا گیا۔ بورڈنگ میں لڑکیاں آوارہ ہو جاتی ہیں۔ کسی نے میری ایک نہ سُنی۔ بنّو ساتھ جا رہی تھی مگر اسکول کھلنے پر آپا اسے سانبھر سے بلا لیں گی۔

اُف سانبھر کتنی بھیانک جگہ تھی! ہم ریل سے اترے تو پلیٹ فارم ہی غائب، مگر بیل گاڑیاں کھڑی تھیں۔ کہنے کو رتھیں تھیں بے حد پھیند نے گھنٹیاں جڑی تھیں۔ مگر چاروں طرف سے ایسی چادریں لپیٹی گئی کہ دم گھٹنے لگا۔ رتھ کے دونوں طرف

داڑھیاں چڑھائے لمبے تڑنگے راجپوت تلواریں سونتے اونچے اونچے گھوڑوں پر سوار ساتھ چل رہے تھے۔ سُرخ انگارہ ڈاکوؤں جیسی آنکھیں، اگر ذرا سی بھی پردہ سرک جاتا تو فوراً جکڑ دیتے۔

باقاعدہ جلوس نکل رہا تھا۔ کچی سڑکوں پر جھٹکے کھاتے خدا خدا کر کے محل کا پھاٹک نظر آیا۔ لمبا چوڑا احاطہ جس کے ایک طرف جیل، قیدی سلاخوں کے پیچھے مارواڑی میں تبصرہ کر رہے تھے۔ رتھیں ایک دروازے سے لگائی گئیں، چاروں طرف چاندنیوں کا حصار کھینچا گیا۔ اونٹ والوں کو جو احاطے کی دیوار کے قریب سے گزر رہے تھے بے پردگی کے خوف سے روک دیا گیا۔

کمبخت محل ایک بوسیدہ تین منزلہ کھنڈر تھا۔ ابا میاں پہلے سے پہنچ گئے تھے۔ نیچے کی منزل میں نوکر اور باورچی خانہ تھا اس کے اوپر زنان خانہ جس میں ہم ٹھونس دیئے گئے۔ ایک لمبا سا برآمدہ اور دو کمرے چھوٹا سا گھٹا ہوا صحن اور ایک دالان در دالان۔ اس کے اوپر ابا میاں کے تین کمرے ایک برآمدہ مختصر سی چھت اور ایک کوٹھری تھی۔ ابا کے کمرے ایک لمبی چوڑی چھت پر کھلتے تھے۔ لیکن اس کے دوسرے سرے پر کچہری کے کمرے تھے۔ دن بھر اس چھت کے دروازے بند رہتے۔ اور چھت پر سپاہیوں اور مجرموں کا جمگھٹا رہتا۔ دن بھر ہتھکڑیاں، بیڑیاں بجاتے قیدی اترا چڑھا کرتے۔

علی گڑھ کے کچے پھونس کے بنگلے بڑے بڑے کشادہ کمرے اور لق و دق صحن پاس ہی لال ڈگی جس میں عموماً بھینسیں نہایا کرتی تھیں۔ مگر تھا تو پانی اور گھنے گھنے درخت، سانبھر کے مقابلہ میں بہشت بریں معلوم ہوتا تھا۔ چاروں طرف لہلہاتے کھیت املی کا چتنادری درخت، جس میں کونپلیں لگتیں اور ہم جُٹ جاتے کونپلوں کے بعد پھول کھاتے، پھر چھوٹی چھوٹی ٹگیاں ٹونگتے پھر کچی گدر۔ اور پکی املی

کنویں کے پاس ایک جامن کا پیڑ جس میں جھولا ڈال کے میں اور نیرّ اتنا جھولتے تھے کہ رات ہو جاتی اور ڈانٹ پڑتی۔

ہائے علی گڑھ۔ پیارا دلارا علی گڑھ! علی گڑھ چھوڑتے وقت ہم بہت روئے۔ سانبھر کے پُرانے گھر جس کی دیواروں سے ہر وقت چونے کی پپڑیاں جھڑتیں۔ فرش پتھر کے تھے۔ مگر ہم لوگوں سے پہلے جو لوگ رہتے تھے۔ بڑے ہی سخت مذہبی تھے۔ گوبر کی تہیں لگی تھیں، دیواروں پر بھی ہر طرف دیوی دیوتاؤں کی گیرو میں انگلیاں ڈبو کر تصویریں بنائی گئی تھیں۔ مردانہ بہت صاف ستھرا تھا، لپکا چکنا فرش اور ہموار دیواریں۔ زنان خانہ میں بیسیوں بھونڈے طاق اور بے حد ناہموار گڈھوں دار دیواریں تھیں۔ دروازے پرانے بھاری اور بڑی بڑی کیلیں ٹھکی تھیں کہ کھولو تو جیل کے دروازوں کی طرح چنگھاڑتے۔

اماں نے فرش کھرچوا کے دھلوایا تو نیچے بارش کا سا سماں بندھ گیا نوکر چلانے لگے۔ فرش چھلنی ہو رہا تھا۔ بھیگے ہوئے گوبر کی سڑاند نے اور حواس گم کر دیئے۔ خیر جب سوکھ گیا تو کھرچا گیا۔ پھر بھی ایسا معلوم ہوتا تھا بھینسوں کے باڑے میں بیٹھے ہیں۔

میں نے اور نیرّ نے ایک کمرے پر قبضہ کر لیا۔ جس میں ایک کھڑکی پیچھے گلی میں کھلتی تھی۔ لوگ بڑی سخت چھوت چھات کے قائل تھے۔ مرد تو ابا میاں سے ضرورتاً ملنے آتے تھے مگر عورتیں کبھی نہیں آئیں۔ ہاں بڑھئی، سلاوٹ، لوہار۔ اور رنگریزوں کی عورتیں کبھی آ جاتیں تو وہ نہایت اکھڑ مارواڑی بولی بولتیں کہ کچھ پلّے نہ پڑتا۔

کیا تنہائی تھی۔ اماں نے تو برآمدے میں چوکا بچھوا کے اس پر چاندنی تکیہ لگایا اور بیٹھ کر چھالیہ کترنے لگیں۔

پاس ہی ایک چولہا بنوا لیا۔ کچھ نہ کچھ پکتا رہتا۔ علی گڑھ میں تنگی دیکھ کر پرانے باورچی ولی محمد چلے گئے تھے۔ انہیں بلوا لیا گیا تھا۔ علی بخش نوکروں کے داروغہ نے کبھی ساتھ نہ چھوڑا، اس کے علاوہ اماں کے پہنچتے ہی لوگ بچے لے کر آنے لگے دس بارہ برس کے ہوش لونڈے، آنہ مہینہ کھانا کپڑا، چار رکھ لئے گئے۔ دو مفت ہی صرف کھانے کپڑے پر رہ پڑے کسی مصرف کے نہیں تھے خوب لڑتے اور آنا کھا جاتے کہ آئے دن ہیضے کی نوبت آ جاتی۔

ابا نے فوراً مرغیاں اور چار کتے پال لئے مگر بچوں کی ایسی عادت ہو چکی تھی کہ ان نوکر بچوں کی بھی مرغیوں جیسی دیکھ بھال کرتے۔ سب ہی کے دانت کان اور آنکھیں خراب تھیں۔ بڑی پابندی سے اُن کے منہ، کھلوا کر دیکھے جاتے اور پرمینگنٹ پوٹاشیم سے کلیاں کروائی جاتیں۔ دانت منجھوائے جاتے آنکھیں بورک پاؤڈر ڈال کر دھوئی جاتیں۔ پھوڑیوں پر مرہم لگتے۔

کمبختوں کے میل کی پپڑیاں جمی تھیں پتھر کے ٹکڑے سے منجھوائے گئے تو گھاؤ پڑ گئے۔

نیچے کافی کوٹھریاں تھیں بڑے ابا آگرے سے آئے تو نیچے نوکروں والے حصّہ میں ایک طرف رہنے لگے۔ کیونکہ وہ بغیر موری اور غسل خانہ کے گزر نہیں کر سکتے تھے۔

کیا وحشت ہوتی تھی۔ میں اور نیرّ باقاعدہ پروگرام بنا کر خوب روتے۔ اُسے تو چند ماہ ہی گزارنے تھے پھر آپا آ کر اسے لے جائیں گی۔ مگر میرا کیا ہو گا مجھے تو کوئی بھی نہیں لے جائے گا۔

سب سے بڑی محرومی کتابوں کی تھی۔ نیرّ کے پاس آٹھویں کا اور میرے پاس نویں دسویں کا کورس تھا۔ نہ جانے کس اُمید پہ کورس سینے سے لگائے بیٹھی

تھی۔ تہذیب نسواں آتا تھا۔ اس میں مس حجاب اسماعیل کے جو نئی نئی حجاب امتیاز علی بنی تھیں رومانی افسانے ہم دونوں سر جوڑ کر پڑھا کرتے اور پر لگا کر نارنگی کی کلیوں کی مہک ارغنوں کی مدہوش کن موسیقی شمعی انگلیوں اور آسمانی آب رواں کے پیراہنوں کی دنیا میں کھو جاتے۔ نیر تو واقعی کھو جاتی، میں بڑی بد مذاق تھی بس جل کر کوئلہ ہو جاتی نمک کی جھیلوں کی سڑاند، چونا جھڑتی دیواریں، ٹپکتی چھتیں، بھاری کیلیں جڑے پھاٹک اور بند راہیں۔ موت کے داخلے کی بھی راہیں بند۔

تب میری سمجھ میں آیا عورتیں ستی کیوں ہو جاتی تھیں۔ اسٹیشن سے آتے ہوئے مرگھٹ کے پاس سے گزرتے وقت وہ پھاٹک دیکھا تھا جس پر لال رنگ کے ہاتھوں کے نشان تھے۔ چتا پر چڑھنے سے پہلے پتی کی لاش پر چلنے والی عورتیں سرخ رنگ میں ہاتھ ڈبو کر پھاٹک پر چھاپ لگا دیتی تھیں۔ کتنے ہاتھ تھے؟ بعض تو اتنے ننھے ننھے تھے کہ شاید دودھ پیتی بچیوں کے ہوں گے جو اپنے شوہروں کی چتا پر بھسم ہو گئیں۔

وہ ہاتھ اب بھی یاد آجاتے ہیں تو دماغ کی رگوں کو کھرچنے لگتے ہیں۔

مگر جتنا جتنا یہ فضا مجھے کچلتی کوئی فولادی اسپرنگ سا میرے ذہن میں اچھلتا۔ میں واہموں سے بر سر پیکار ہو جاتی۔ مرے پہ سو درے سامان کی کوٹھری میں ایک صندوق کھولا تو پتہ چلا کہ آپا کی جاں فشانی سے جمع کی ہوئی کتابیں ہیں۔ بے حد بوسیدہ اور سیلن کی وجہ سے چپکی ہوئی تہذیب نسواں کی پرانی جلدیں۔ سہیلی عصمت اور مخزن کے پرچے مولوی نذیر احمد دہلوی اور علامہ راشد الخیری کی تصنیفات میں اور نیر دیوانوں کی طرح ان پر ٹوٹ پڑے۔

نیر جلدی سو جاتی میں پڑھتی رہتی، یہاں تک کہ لالٹین کا تیل ختم ہو جاتا۔ تب میں چھت پر جا کر چاندنی میں پڑھتی، راجپوتانہ کا چاند بے انتہا روشن ہوتا ہے

فضا میں نمی کی دھند نہیں ہوتی۔ میری آنکھیں پہلے ہی بہت کمزور تھیں اور بھی خراب ہونے لگیں۔

میں نے ہوکے میں جلدی جلدی سب پڑھ کر ختم کر دیا اور پھر خالی ہاتھ رہ گئی عورت کی مٹی پلید ہوتی ہے پڑھ کر میرے اوپر الٹا اثر ہوا۔ مجھے سماج سے زیادہ خود پر غصہ آتا کہیں مجھ میں ہی کسر رہ گئی ہے۔ مجھے اپنے والدین پر غصہ نہیں رحم آیا۔ وہ اتنے محدود دائرے میں قید ہیں، وہ مجھ سے نفرت نہیں کرتے، میری اماں کو میری شادی کی فکر ہے۔ یہاں اڑدھاڑ میں بر کیسے جڑے گا؟ اپنی بساط بھر وہ مجھے اتنا ہی چاہتی ہیں جتنا انہوں نے اپنی دوسری اولاد کو چاہا۔ وہ اپنی بیٹیوں سے بھی اتنی ہی محبت کرتی ہیں جتنی بیٹوں سے انہیں بیٹوں کی کمائی کھانے کا خیال بھی نہیں آتا، ابا ہی ان کا سہارا ہیں، بیٹیوں کو کیسا ہی کھول جہیز دیا۔ آپا کے بچے بیٹوں کی اولاد سے زیادہ ہی پیارے ہیں۔ اپنی دانست میں مجھے بورڈنگ کی گندی فضا سے بچا رہے ہیں۔ ذہنی طور پر وہ بچے ہیں، میں ان سے زیادہ بوڑھی ہوں۔

انہیں دنوں چھوٹا ٹیفائیڈ کے متواتر حملوں کی وجہ سے علی گڑھ سے ابا کے کہنے پر جودھپور چلا گیا۔ وہاں اس کا علاج ہونے لگا۔ شمیم کا جو دل گھبرایا اور وہ امتحان کو لات مار کر بھاگ آئے۔ امتحان کی فیس ہی نہیں بھری۔ سارا الزام شوکت آپا اور ننھے بھائی پر رکھ دیا۔ ننھے بھائی نے آکر پول کھولا۔ شمیم فیس لے جاتا تھا اور داخل نہیں کرتا تھا۔

کیا قیامت ہے شمیم پڑھنا نہیں چاہتا، اور میرے پڑھنے پر پابندی! شمیم غلطی کر کے اپنی زندگی برباد کرنے کا حق رکھتا ہے۔ میں زندگی سدھارنے کی حقدار نہیں۔ کون منصف ہے اس دنیا کا؟ کون میری زندگی کا معمار ہے؟ اگر والدین ہیں تو پھر خدا نے مجھے دماغ کیوں دیا۔ میں اس کا کیا کروں گی۔

بڑے ابا مجھے اور نیر کو انگریزی پڑھاتے تھے۔ مگر ساتھ ساتھ بے حد اپنے شعر سننے پر مجبور کرتے تھے۔ ویسے شاعری سے کوئی لگاؤ نہیں تھا اور نفرت ہو گئی۔ مگر پڑھنا تھا اس لئے شعر سننے پڑتے تھے۔

نیر چلی گئی اور میری دماغی صحت ڈگمگانے لگی۔ کتابیں بھی ختم ہو گئی تھیں، جب ہوک اٹھتی تو ابا میاں کی قانون کی کتابیں پڑھنے لگتیں۔ خاک پلّے نہ پڑتیں۔ ڈکشنری دیکھ دیکھ کر پاگل ہو جاتی۔ اس عمر میں خودکشی بہت آسان لگتی ہے۔ اور میں نے بھی خودکشی کے پلان بنائے۔ رات رات بھر سوچا کرتی، چھت پر سے کود جاؤں تیسری منزل سے سر کے بل! چپکے سے جا کر نمک کی جھیل میں چھلانگ لگا دوں، چند گھنٹوں میں گھل کر آٹا ہو جاؤں گی۔

مگر چند گھنٹے! اُف، نمک میرے گوشت کو ہولے ہولے چبائے گا۔ پہلے کھال اترے گی، پھر گوشت کی تہیں۔ کبھی رات کو ایک کروٹ سوتے سوتے بازدش ہو جاتا تو ایسا لگتا نمک کی جھیل میں ڈوب رہی ہوں، ابھر رہی ہوں۔ چیخ مار کر میں جاگ اٹھتی۔

پھر ایک دن میں نے اماں کو کہتے سُنا۔

"اے ہے میں کوئی ناداں ہوں، تین بیٹیاں دو بیٹے بیاہے ہیں۔ جودھپور میں سب کچھ ملتا ہے۔ ویسے میں نے یہاں کے بزاز سے کہلوایا ہے، اس نے کہا جیسا مال حکم ہو دم بھر میں حاضر ہو جائے گا۔ بڑے بڑے سیٹھ رہتے ہیں سانبھر میں سیروں سونے کا زیور ہے ایک ایک کے پاس اور جے پور کا جڑاؤ کام ....."

نمک تیزاب بن کر میرے دماغ کو کھانے لگا۔ اماں نے انجان بن کر ایک خط مجھے دیا کہ ابا میاں کی میز پر رکھ آؤں۔ اس خط میں میرا پیغام تھا اور لڑکے

کی تصویر چھوٹی چھوٹی مونچھوں والا ایک خوبصورت نوجوان گھٹنوں پہ ہاتھ رکھے کیمرے کے لینس کو گھور رہا تھا۔

میں نے منے بھائی کو اسی وقت خط لکھا کہ میں شادی نہیں کروں گی۔ آپ رکوائیے جواب آیا۔ لڑکا میرے دوست کا چھوٹا بھائی ہے۔ ڈپٹی کلکٹر ہے۔ مراد آباد کے لوگ ہیں بڑا خاندان ہے۔ تمہیں بچپن میں دیکھ چکے ہیں۔ پیغام میرے ذریعہ سے آیا ہے۔ تم چاہو گی تو پرائیویٹ امتحان بھی دے لینا۔

ہمت ٹوٹنے کے بجائے خون سوار ہو گیا۔

پھر میں نے ترپ کا اِکّا مارا۔ میں نے جگنو کو لکھا خدا کی قسم تم سے شادی کے لئے زبردستی نہیں کروں گی۔ میری شادی صرف تم رکوا سکتے ہو۔ ماموں کو لکھو کہ تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو۔ فوراً سانبھر پہنچ کر شادی رکوائیں۔ اگر تم نے میری مدد نہ کی تو افسوس ہوگا تمہیں!

اور میں خودکشی کے پروگرام بنانے لگی۔ موت سے ڈر بھی، پر زندگی سے تو گھگی بندھ رہی تھی۔ پڑھنے کے شوق سے زیادہ میرے دل میں شادی کی ہیبت تھی، بچپن سے میرے کان میں ڈالا گیا تھا کہ میں کسی گُن کی مالک نہیں جس کے گھر جاؤں گی گھروا کر دوں گی۔ منہ پھٹ زبان دراز دو دن میں خصم طلاق دے کر میکے پھنکوا دے گا۔

احساس کمتری میری رگ رگ میں سما چکا تھا۔ نہ صورت نہ شکل، مجھ پر کون احمق جان دے گا؟ جو چیز میرے نصیب میں نہیں اس کے لئے ترسنے کی بجائے کیوں نہ اسے خود ہی ٹھکرا دوں۔ شادی ہی نہیں کروں تو کون احمق مجھے طلاق دے گا۔ میں پڑھ لکھ کر خود مختار بن جاؤں گی، میاں کے ٹھکرانے کے بعد بھاوجوں کے بچے پال کر زندگی نہیں گزاروں گی۔

چند دن کے اندر بڑے ماموں سانبھر پہنچ گئے، اماں اور ابا سے باتیں ہوئیں

مجھے معلوم تھا جگنو سونے کا لڈو ہے۔ سارے خاندان کے بیٹیوں والے اس پہ دانت لگائے بیٹھے ہیں۔ میرے ترپ کے اکے کو کوئی نہیں کاٹ سکتا۔ تاہم نہیں سکتی کہ اتنی آسانی سے میں اتنے بڑے معاملے سے صاف نکل آتی۔ میری ہمت کتنی بڑھ گئی۔ میں نے طے کر لیا کہ آج سے اپنی ناؤ کی ملاح میں خود ہوں سارا خاندان مگن، اور میں نے کسی کو نہ دکھ دیا نہ بے عزتی کا سوال اٹھا آج تک سوائے میرے اور جگنو کے کسی کو نہیں معلوم کہ میں نے کیا چال چلی تھی۔

ترپ کا اکہ تو چپک گیا، مگر اب مجھے جوکر کی ضرورت پڑنے والی تھی۔ مجھے پڑھنے کے لئے علی گڑھ جانا تھا، لوہے کے چنے تو اب چبانے کا وقت آ رہا تھا۔

اور میرے دانتوں میں کھجلی ہو رہی تھی!

اماں میرے مستقبل سے مطمئن ہو کر بہت مہربان ہو گئی تھیں۔ انہوں نے کچھ موٹے نقلی ریشم کی گلابی فیروزی ساڑھیاں خریدی تھیں ان کے ساٹن کی کالر دار مردانہ وضع کی قمیضیں بنوائی تھیں۔ دو چار بنارسی تھان خرید لئے تھے اب اور خرید و فروخت بند کر دی تھی۔ آٹھ تولے کے کڑے پہونچیاں جھمکے بھی بنوا لئے تھے۔ مجھے سادہ شلوار قمیض اور دوپٹے چاہئیں تھے۔ چادریں تکیہ کے غلاف تولیے اور پلنگ پوش، سال بھر کے لئے کپڑوں کی ضرورت تھی۔ لٹھے کے تھان گھر میں رہتے ہی تھے، میں نے آٹھ شلواریں بنائیں۔ اماں سے کہا صرف تین بنائی ہیں۔ انہیں پتہ بھی نہ چلا۔ تین چار لٹھے ہی کی قمیضیں بنا لیں۔ ابھی دوپٹے چاہیئے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اماں سے کہے بغیر سامان کیسے تیار کر سکوں گی۔ اس وقت ایک لال ٹین اور لوٹا بھی لے جانا پڑتا تھا۔ میں نے ثابت دوپٹے چھپا دیئے اور پھٹے دوپٹے اور پھاڑ کر پہننے لگی۔ مگر انہوں نے کچھ نوٹس نہ لیا۔ کون تھا دیکھنے والا پورا بستر بھی لے جانا تھا۔

رات رات بھر میں بورڈنگ کے خواب دیکھتی۔ ایسی لگن تو دلایت جانے کی بھی نہیں لگی تھی۔ عجیب بے کسی کا احساس تھا کہ دم گھوٹے دے رہا تھا۔ وہ شادی جس پر اماں مطمئن بیٹھی تھیں نہیں ہونے والی تھی کہ میں نے جگنو کو قسم دی تھی۔ میں تو کسی بادشاہ سے بھی شادی کے موڈ میں نہیں تھی۔ اسکول کھلنے کا وقت آ رہا تھا میں نے ایڈمیشن فارم بھی نہیں منگائے تھے۔

پھر ایک دن میں نے ٹوٹے پھوٹے ہتھیار سنبھالے اور میدان میں اتر گئی۔

اتوار کا دن تھا۔ ابا میاں ناشتہ کر کے اخبار پڑھ رہے تھے۔ اماں چوکے پر بیٹھی چھالیہ کتر رہی تھیں۔ میں نے آنکھ کھول کر یہی منظر دیکھا تھا۔ پرانا دم گھوٹ ماحول میری ہمت پست کئے دے رہا تھا عجب اکیلے پن کا احساس دم گھوٹ رہا تھا۔ اتنے بڑے کنبے کے باوجود میں اپنے محاذ پر تنہا تھی، کسی طرف سے کمک آنے کی امید نہ تھی، کئی دن سے میں عجیب ڈراؤنے خواب دیکھ رہی تھی، میں مری پڑی ہوں اور سارا گھر ماتم کناں ہے۔ میں بین سن رہی ہوں وہی لاکھول عورتوں کے بین جو نہ جانے کیسے رو رہی ہیں۔

پھر میری آنکھ کھل جاتی ہے، تیل ختم ہو جانے پر لالٹین بھڑک کر بجھ جاتی۔ میں پسینہ پسینہ سوکھی سوکھی آنکھوں سے مختصر سے صحن میں سے جھانکتا ہوا آسمان دیکھتی۔ تارے مدھم ہوتے جاتے، دور کہیں مدقوق مؤذن کی آواز مجھے بجائے سکون بخشنے کے دہلا دیتی۔

ایک اور دن گزر گیا۔

اور میری منزل ایک قدم آگے کے بجائے پیچھے ہی ہٹ گئی۔

اس دن میں نے بمبے کے پاس بیٹھ کر وضو کیا۔ اور فجر کی نماز پڑھی تھی۔ بلے لفظ دعائیں مانگیں تھی۔ خدا کو میرے دل کا حال معلوم تھا بلکہ اس وقت ایسا محسوس ہوا۔ خدا میرے دل میں اتر آیا ہے۔ عجیب ہلچل سی بے آواز بے مقصد میرے وجود کو مسمار کئے دے رہی ہے۔ مگر جتنی ٹوٹتی ہوں اتنی ہی دیواریں سنگین ہوتی جا رہی ہیں۔ ناامیدی میں کبھی کوئی انجانی سی طاقت نہ جانے کہاں سے ابھر کر ہاتھ تھام لیتی ہے۔

اور وہی انجانی طاقت مجھے مقتل کی جانب گھسیٹے لئے جا رہی تھی۔

میں تھوڑی دیر مونڈھے پہ بیٹھی رہی۔ اماں چھالیہ میں سے سڑا ہوا حصہ کتر کر

بڑے تاسف سے دیکھ رہی تھیں اباکی نظریں اخبار پہ گھوم رہی تھیں۔ میں باری باری دونوں کو نگاہوں کی ترازو میں تول رہی تھی۔ شاید میری نگاہوں کی چبھن نے ابا میاں کو میری طرف دیکھنے پر مجبور کیا۔

تھوڑی دیر بڑی بڑی غلافی آنکھیں خاموش میری آنکھوں سے الجھی رہیں۔ میں نے پلک نہیں جھپکائی۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ ابا میاں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا مذاق نہ تھا۔ کہتے ہیں اکثر مجرم ان کی ایک نظر سے پانی ہو جاتے تھے۔ اور جھوٹ کی ساری کہانیاں ورق ورق ہو جاتی تھیں۔

"میں پڑھنے کے لئے علی گڑھ جانا چاہتی ہوں۔" میں نے کہہ ہی دیا۔ اور میری آواز میں کوئی لرزش نہ تھی۔

"پڑھتی تو ہو اپنے بڑے ابا سے۔"

"میں میٹرک کا امتحان دینا چاہتی ہوں۔"

"کس کام آئے گا۔ دو سال رہ گئے ہیں جگنو کے ..... پھر ..... بیکار۔"

"میں میٹرک کرنا چاہتی ہوں۔"

"مگر ذرا سوچو کیا فائدہ ہے، اس سے تو بہتر ہے تم کھانا پکانا اور سلائی وغیرہ سیکھو، تمہاری تینوں بہنیں کتنی سلیقہ مند ہیں، اور تم....."

"مجھے سلیقہ سے دلچسپی نہیں، میں پڑھنا چاہتی ہوں۔" "نہیں ..... بے کار .....؟" ابا نے کہا۔

"تو میں چلی جاؤں گی۔"

"کہاں چلی جاؤ گی۔؟" ابا میاں نے اخبار رکھ دیا۔

"اسکول — !"

"اسکول —؟ کون سے اسکول؟"

"کسی بھی اسکول میں ——!"

"نہیں ہم تمہیں اسکول وغیرہ نہیں بھیجیں گے۔ کل سے تم شلغم کی ترکیب سیکھو اور حبشی حلوا سوہن ——"

"بیگم اس دفعہ حلوہ سوہن گول کر گئیں۔"

"اسے گرمیوں میں موا حبشی حلوہ سوہن کیا بنے گا —— ہاں گاجریں ——"

"مجھے شلغم سے قے آتی ہے۔ میٹھے چاولوں میں گوشت۔ اور حبشی حلوہ سوہن بھی پسند نہیں۔ میں اسکول جانا چاہتی ہوں، صرف ایک ہفتہ رہ گیا ہے علی گڑھ ——"

"ہم تمہیں علی گڑھ نہیں بھیج سکتے۔ شوکت بڑی لاپرواہ ہیں۔ اور تم نہایت خود سر ہو۔ اس کا کہنا نہیں مانو گی۔ کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو خاندان کی بدنامی ہوگی ——"

"تو میں خود چلی جاؤں گی۔" میرے اوپر بھوت سوار ہو گیا۔

ان کی شعلہ بار آنکھیں پوری طرح کھل گئیں میں بھسم نہ ہوئی مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا تاج محل کی مشرقی برجی سے لٹکی ہوئی ہوں رسی کمزور ہے۔ میری ہتھیلیاں خون خون ہو رہی ہیں، کوئی دم میں رسی چھوٹ جائے گی اور سنگِ مرمر کے بے رحم فرش کی طرف میرا جسم لپکے گا۔ اور میں پاش پاش ہو جاؤں گی۔

"کہاں چلی جاؤ گی۔"

"کہیں بھی ——!"

"بس یوں ہی چل دو گی۔"

"ہاں گھر سے نکل کر تانگہ لوں گی، وہاں سے اسٹیشن جا کر کسی بھی ڈبہ میں بیٹھ جاؤں گی۔"

"پھر ——؟"

"نہیں ادھر ہوا بھی چل رہی ہے۔ شوکت جاگ جائیں گی۔"

ہم دونوں نیم کے نیچے سوکھے پتے جمع کر کے بیٹھ گئیں نیرؔ بولی۔

"میری مانو تو بہن بورڈنگ چلی چلو۔"

"کیوں ——؟"

"ارے بھئی کیا بتاؤں۔ شوکت آپا سے میری تو نہیں بنی، اور تم تو بہت ہی خر دماغ ہو۔ تمہاری تو ایک منٹ نہیں بنے گی۔ دوسرے نعیم پڑھنے نہیں دیتا۔ چڑھا بیٹھتا ہے اور کیا زور کا گھونسہ لگاتا ہے کہ بھئی میرا تو دم جانے لگتا ہے۔"

"مجھے نہیں مارے گا، میں اس کی وہ ٹھکائی کروں گی کہ یاد ہی کرے گا۔"

"اری بہنیا انگلی لگا کے تو دیکھو، چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔"

"تم بھسنڈی ہو میں تو کسی سے دبنے والی نہیں۔"

"یہی تو ڈر ہے۔ پر بہن تم یہاں پڑھنے آئی ہو یا مہابھارت رچانے آئی ہو۔"

"اور میں فکر میں پڑ گئی۔ نیرؔ نے شکر ہے کہ مٹھائی نہیں کھائی۔ شوکت آپا نے اٹھ کر فوراً ڈبہ کھولا اور ناریل کا ٹکڑا غائب دیکھ کر بہت بگڑیں۔

"بہت بھوکی تھی نیرؔ، تم نے میرے لئے بھی پتیلی میں کچھ نہ چھوڑا۔ دال بھی نہ ملی۔ نہ روٹی۔"

"دال ہمارے یہاں پکتی ہی نہیں اور ذرا سا قیمہ تھا۔ نعیم رد کھا رد کھا کھا گیا۔ روٹی مجھے دھیان ہی نہ رہا باسی تو تھی میں نے کتے کو ڈال دی مگر کھوپرہ کیوں شوکت آپا اور نعیم نے کھانا کب کھایا؟ شاید جب میں ادھر کوٹھڑی میں پرانا سامان ٹٹول رہی تھی اور پھر بستر کھولا۔ میلے کپڑے نکالے۔ ایک پلنگ پیچھے کی طرف بالکل ثابت مل گیا۔ تپّی بان سے بنا ہوا۔ میں نے وہ گھسیٹ کر برآمدے میں غسل خانہ سے نکلنے کا راستہ چھوڑ کر بچھایا اور لیٹ گئی نیرؔ کے انتظار میں کھانا کھاؤ گی؟"

شوکت آپا نے پکارا۔ "میرے لئے پتیلی میں چھوڑ دو، بعد میں کھالوں گی"

مگر شوکت آپا بھول گئیں۔ میں تو بنا کھائے بھی رہ سکتی تھی۔ مگر نیرّ دھان پان سی ناک پکڑ دتو دم نکلے۔

ہم نے چپکے چپکے ڈبے ٹٹولے۔ ایک ڈبے میں تھوڑا سا ناریل ملا۔ نیرّ پھکنے لگی۔ دودھ کی پتیلی کھولی معمولی سی ملائی جمی تھی۔ نیرّ نے چپکے انگلی سے ملائی کو چھوا۔

"شوکت آپا جان لیں گی"

"کھا بھی لو۔ تم بھوکی ہو"

"ہاں کئی بار بلا چکی ہیں کہ اتوار کو آؤ، گھر کے کھانے کو ترس گئی ہو گی"

"مگر اس وقت شاید کھانا کم تھا، تم بورڈنگ کیوں چلی گئیں"

"نہ پوچھو بہن پھر بتاؤں گی"

"نہیں ابھی بتاؤ"

"چلو ادھر نیم کے نیچے بیٹھیں گے"

"گرمی ہو گی"

"برآمدہ بہت لمبا ہے۔ ٹٹی لگوالوں گی"

"غسل خانہ گھر جائے گا، کوئی آئے جائے گا تو تم ناک بھوں چڑھاؤ گی —"

"نہیں چڑھاؤں گی، اور چڑھاؤں گی بھی تو تمہیں کیا اثر پڑے گا۔ نیرّ کہاں سوتی ہے؟"

"نیرّ کہاں، وہ تو بورڈنگ چلی گئی"

"بورڈنگ —؟"

"ہاں بھئی یہاں انہیں تکلیف ہوتی تھی۔ نعیم غل مچاتا تھا۔ کہو بھلا ہم اپنے

بچے کا گلا گھونٹ دیں"

میں نے سامان نہیں کھولا فوراً مہترانی کو بھیجا کہ کل اتوار ہے نیرّ سے کہنا میں آئی ہوئی ہوں۔

بارہ بجے نیرّ آگئی۔ ہم جیسے صدیوں کے بچھڑے لپٹ گئے۔

"بہنو بھوک کے مارے دم نکلا جا رہا تھا"

"کھانا نہیں کھایا —؟

"کہاں کھایا۔ لگا ہی نہیں تھا پھر آنے کی اجازت لینی تھی۔ اجازت لے کے سیدھی بھاگی۔ کچھ ہے کھانے کو؟"

بہت ڈھونڈھا کچھ نہ ملا۔ گندی پتیلیاں اور رکابیاں لڑھک رہی تھیں۔

منہ کھولا اور وہ غور سے ایک ایک دانت دیکھتے رہے۔

"پان مت کھانا۔ اور نیم کی مسواک ضرور کرتی رہنا۔ اور ہمیشہ ٹھنڈے پانی سے نہانا"

"اسے ہے جاڑوں میں بھی؟" اماں بولیں۔

"جاڑوں میں بھی تازہ پانی سے روز نہانا۔ اور کھیلوں میں برابر حصہ لینا۔ بہت موٹی ہو رہی ہو"

اور میں دل ہی دل میں سوچ رہی تھی یہ کیا ماجرا ہے۔ نافرمانی پہ تو والدین عاق کر دیتے ہیں۔ بیٹیوں کا تو گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ یہاں پہلی بار اماں ابا کا پیار مل رہا ہے۔

میں علی گڑھ پہنچی تو شوکت آپا سو رہی تھیں۔ جاگیں تو بولیں۔

"ہمارے یہاں تو پلنگ نہیں، کہاں سوؤ گی"

"کھٹیا منگا لوں گی۔ اور کوٹھڑی میں کئی پلنگ کھڑے ہیں۔

"ان کی بان گل گئی ہے"

"نئی لگ جائے گی۔"

"ہمارے پاس تو دو ہی کمرے ہیں۔ ہماری گزر ہی مشکل سے ہوتی ہے دو کمرے ہم نے کرایہ پر اٹھا دیئے ہیں۔"

"برآمدہ میں تو جگہ ہے۔"

"وہاں باورچی خانہ ہے۔"

کرتی تھیں۔ اور سینیلا مّیا کو بھوگ لگواتی تھیں۔ مگر عیسائی مذہب کچھ انگریز حاکموں کا مذہب سمجھا جاتا تھا۔ اور اس طرف رغبت ظاہر کرنا ذلیل سمجھا جاتا تھا۔ وجہ مجھے نہیں معلوم تھی کہ کیوں؟

بیوقوف ایسی الٹی سیدھی باتیں سوچنا بھی نہیں چاہئیں۔ ہمیں نہیں معلوم تھا تمہیں پڑھنے کا اتنا شوق ہے۔ تم ننھے اور شوکت کے ساتھ رہ سکتی ہو۔" پھر انہوں نے مجھے ایک کتاب دی۔

"یہ پاس بک ہے۔ اپنے دستخط سے تم پوسٹ آفس سے روپیہ نکلوا سکتی ہو۔ اس میں چھ ہزار روپے ہیں۔ اسے تم جہیز سمجھو یا اپنا حق، ہم تمہاری ذمہ داری سے دست بردار ہوتے ہیں۔"

کتاب لے کر میں سکتہ میں رہ گئی۔

"اس کے علاوہ آگرہ کا ایک مکان ہم نے تمہارے نام کر دیا ہے۔ چاہو اسے بیچو یا کرائے پر اٹھاؤ، تم جانو۔"

انہوں نے مجھے مکان کے کاغذات تھما دیئے۔

ایک دم میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جیسے ناؤ میں بٹھا کر پتوار ہاتھ میں دے کر مانجھی مجھے اکیلا چھوڑ گیا۔

"ارے بیوقوف روتی کیوں ہو، فوراً داخلے کا فارم منگاؤ اور تیاری کرو۔ ہاں بیوی کو بنانے کی ضرورت نہیں، کپڑوں اور کرائے کے لئے یہ پچاس روپیہ رکھو۔

مشرقی مینار کی رسی میں نے چھوڑ دی اور تیرتی ہوئی سنگ مرمر کے فرش پر کھڑی ہو گئی۔

اماں کو انہوں نے کیا سمجھایا کہ وہ ایک دم ایسی ہو گئیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

دوپٹوں کے لئے پورا تھان منگوایا۔ تین روپیہ کا بیس گز کا چھوٹے عرض کی ململ کا تھان ملتا تھا۔ آٹھ دوپٹے بن گئے۔

اماں نے رنگ منگائے اور مجھے طرح طرح کے دوپٹے رنگنے کی ترکیبیں بتائیں۔

مجھے یاد ہے ایک پچرنگا ساون کے موسم کے لئے ایک زرد بسنت کے لئے، ایک پتنگوں کا۔ اماں نے دوپٹہ پہلے پانی میں بھگوایا پھر نچوڑ کر ذرا ابھرا کیا۔ پھر اسے تہہ کیا۔ بیچ میں کس کے ڈوری بندھوائی اور کلف ملے رنگ میں آدھا گلابی آدھا دھانی رنگوں میں ڈبو دیا۔ ڈوری کھولی تو بے حد خوبصورت پتنگیں بن گئیں جو خوب کلف اور ابرق ڈال کر باقی دو پٹے ہلکے رنگوں میں رنگوائے۔ جب سوکھ گئے تو پاندان کے ڈھکنے سے سخت تکیے پر گھسے لگا کر چنے۔ پھر انہیں مروڑ کر بٹ لیا اور بنڈل بنا لئے۔ چار چادریں اور تکیہ کے غلاف ایک راجستھانی پلنگ پوش۔

پراسپیکٹس اور فارم آ گیا تھا اور میں نے بھر کر بھیج دیا تھا۔

مجھے دسویں کلاس میں داخلہ نہیں مل سکتا نویں میں ملے گا۔ اور میں علی گڑھ روانہ ہو گئی۔ اماں مجھ سے بالکل ناراض نہ تھیں۔ ابا روز شام کو ادھر ادھر کی باتیں کرتے۔

"بیمار تو تم پڑتی نہیں ہو۔ دانت تمہارے بہت صاف ہیں۔ منھ کھولو!" میں نے یہ نئی چال مجھے بے حد پسند آئی اور محاصرہ بے حقیقت معلوم ہونے لگا۔

تیسرے دن ابا نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا۔

"مشن میں جانے کے بارے میں کیا فیصلہ کیا" میں چپ رہی۔

"عیسائی ہو جاؤ گی؟" ابا میاں نے پوچھا۔

"ہاں —!" میں نے بھرے گلے سے کہا۔ جن علیسا ئیوں سے پالا تھا نچلے طبقے کی کالی بھجنگ میمیں تھیں نیچے نیچے اسکرٹ کالی ٹانگیں میلے کرمچ کے بوٹ اور نہایت بھونڈی بکی ہوئی ٹوپیاں۔ حد سے زیادہ بگڑی کرنٹی زبان۔ بچپن سے میں نے صرف اسلام کی رحمتوں کا ذکر سنا تھا۔ اس کے بعد ہندو دھرم سے ایک دیلنگ سا لگاؤ تھا۔ مندروں میں بھجن گھنٹیاں سجے سنورے بھگوان خاص طور پر مور مکٹ سجائے کرشن کنہیا، گیتوں میں ان کی سوخیاں شرارتیں۔ گوپیوں کے سنگ راس رچانا مُرلی کی دلکش دُھن۔

مگر ہندو ہونے کا کیا طریقہ ہے یہ مجھے بالکل بھی نہیں معلوم تھا۔ بچپن میں میں نے اپنی گوئیاں شیلا کے ہاں تہواروں کی دھوم دھام دیکھ کر چاچی سے کہا تھا

"مجھے ہندو بنالو۔"

پہلے تو وہ ہکا بکا رہ گئیں پھر بولیں۔

"دُھت —!" خوب سب نے میرا مذاق بنایا۔

اماں بھی چھپ کر پنڈت جی کو ستیہ نرائن کی کتھا کے لئے روپیہ دیا کرتی تھیں۔ سنتے ہیں بڑا اندھیر مچا تھا۔ ممانی جان خفا ہو کر میکے چلی گئی تھیں۔ باقی تین بچوں کے چیچک نکلی۔ بہت بچپن میں نکلی بس رنگتیں جھلس گئیں۔ زیادہ داغ نہیں پڑے بس اختر ہی کی چکنی اور سفید بچی۔

بڑے ماموں کے بچوں کے ٹیکے ہمارے ہاں لگوا دیئے گئے تھے۔ لیکن جب دوسری شادی سے بچی پیدا ہوئی تو چیچک میں مر گئی۔ دوسری بری طرح چیچک میں داغدار ہو گئی تیسرا لڑکا ہوا وہ بھی چیچک میں مر گیا۔ اس کے بعد اصغر دوسرا بیٹا چیچک سے اس قدر بد صورت ہو گیا تھا کہ بندر لگتا تھا۔ مگر ماموں چیچک کے ٹیکے کے نام سے لرزتے تھے۔

ٹیکوں کی بات تو یہ جودھپور دربار تک پہنچی، بڑی سخت تفتیش ہوئی۔ مگر ابا کے جواب پر معاملہ دب گیا کیونکہ ابا انڈین گورنمنٹ سے منسلک رہ چکے تھے۔ اور انہوں نے اسے اوپر سرکار تک بات پہنچانے کی دھمکی دی اور استعفیٰ بھی داخل کر دیا۔

استعفا منظور نہیں ہوا اور ان کی مصروفیات میں طبی محکمہ کی سرپرستی بھی شامل کر دی گئی جو انہوں نے ترقی کی پرواہ کئے بغیر خوشی سے منظور کر لی۔ سارے عملہ کے بچوں کو پکڑ کر ٹیکے لگوائے خود چپراسیوں، کلرکوں حتیٰ کہ قیدیوں کو بھی نہیں بخشا۔

"سرکار ان میں قتل کے مجرم ہیں انہیں کیا ضرورت ہے ٹیکے کی؟" ایک سمجھدار کلرک نے کہا۔

"اگر اسے چیچک ہوئی تو اوروں کو بھی سمیٹ لے گا۔ اور اگر بچ گیا چیچک سے اور گھناؤنی صورت لے کر اللہ میاں کے دربار میں پہنچا تو بغیر اعمال دیکھے ہی دوزخ میں جھونک دیا جائے گا۔

چیچک کے ٹیکوں کا اتنا ہنگامہ ہوا کہ ابا کا نام ہی "وہ چیچک والا جج" پڑ گیا تھا۔

میں نے خودسری ورثہ میں پائی تھی۔

رات کو بھوک لگی نعمت خانہ میں اماں نے قند میں تالا ڈال دیا تھا۔ پہلے میں نے مصالحہ کے ڈبہ پر ملہ بولا۔ کوفتوں کے لئے بھنے چنے ملے وہ پھانکے تھوڑی سی خشخش چبائی۔ ترکاری کی ٹوکری میں دو مری سوکھی گاجریں، مرجھائی ہوئی گو بھی خاصی لذیذ لگی۔ کچھ پستے بادام اور چھوہارے سمیٹے اور مزے سے دو گلاس پانی چڑھا کر تاروں کی چھاؤں میں دری پر پانی چھڑک کر پڑی رہی۔ میں نے محاصرہ

کا زور دار مقابلہ کیا اور دو دن تک خاموش جنگ جاری رہی۔ مشن جانے کا خواب دھندلا پڑتا جا رہا تھا۔ اسٹیشن بہت دور تھا۔ اور سڑک پر مجھے راستہ پوچھتے دیکھ کر طوفان کھڑا ہو جاتا۔ فوراً دھر لی جاتی۔ میرے منصوبے میں کوئی دم نہ تھا مگر نہ جانے کیوں مجھے غیب سے مدد کی امید تھی۔ پھر جگنو کو لکھوں کہ میری تعلیم پر زور دے اور مجھے پڑھنے بھجواؤ ورنہ مجھے نہ قبولنے کی دھمکی دو۔

آئندہ قضا پیش کر دی جائے گی ورنہ معاملہ کھٹائی میں رہا تو پھر نمازوں کے بہانے کون جانے کسی گرجا میں واسطہ پڑے گا تب دیکھا جائے گا۔

کانگریس کا زور دن بدن بڑھ رہا تھا۔ مگر ریاستوں میں گاندھی جی کا نام بھی گناہ سمجھا جاتا تھا۔ ہم مہاراجہ جودھپور کے رعایا تھے۔ ان کی سخاوت کے بل بوتے پر پل رہے تھے۔ پچھلے نومبر میں راج کنور کی سالگرہ ہر شہر میں بڑی دھوم دھام سے منائی گئی تھی۔ ابّا میاں نے بھی جشن اور چراغاں کا انتظام کیا تھا۔ رات بھر آگرہ سے آئے ہوئے نقالوں اور رنڈیوں کا ناچ ہوتا رہا تھا۔ ہم سب نے کچہری کی چھت سے دیکھا تھا ساری رات جیب بیزری تھی۔

جشن کے بارے میں ابا میاں بہت ناراض تھے۔ ریاست میں اس بلا کی غربت تھی نہ ڈھنگ کا اسپتال تھا نہ اسکول امیر علاج کے لئے جودھپور یا جے پور چلے جاتے یا ڈاکٹر بلو لیتے، غریب یا لوٹ پوٹ کر کھڑے ہو جاتے یا مر جاتے۔ ابا میاں کے محکمہ کا ان باتوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ مگر وہ سنیلا مائی کی پوجا پر بھروسہ نہیں رکھتے تھے۔ اور اسی ٹوٹے پھوٹے ڈاکٹر سے سڑک کے بچوں کو پکڑوا کر ٹیکے لگواتے جس پر بڑا ماتم پڑتا۔ ان کے والدین بڑا واویلا مچاتے مگر ابا میاں کو چیچک کے ٹیکے لگوانے کا جنون تھا۔ ہمارے ماموں چیچک کے ٹیکوں کے قطعی قائل نہیں تھے۔ چھوٹے ماموں کی شادی اماں نے کی۔ ان کی پہلی بیٹی

بھی ہمارے ہاں پیدا ہوئی اور موقع پاتے ہی ابا نے اُس کے ٹیکہ لگوا دیا —— کہا جب تک ہاں نہیں کرو گی چھوڑوں گا نہیں۔"

اماں دھاڑ دھاڑ رونے لگیں۔

" غارت ہو کلموہی" اماں نے جوتی کھینچ کے ماری، جو دانہ کی متلاشی مرغی کے لگی۔ اور نہ جانے کیوں میں ہنسی دبا تی بھاگی۔

مجاہد خونم خون سہی مگر جانبازی سے مورچہ وقتی طور پر چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔ میں نے دو تین گلاس صراحی کا پانی چڑھایا۔ اور اندر کی کوٹھڑی میں دروازے کھڑکیاں بند کر کے بیٹھ رہی۔

پتہ نہیں مجھے اپنی ڈھٹائی پر بجائے شرمندگی کے بڑا سکون مل رہا تھا۔ کتاب اٹھائی۔ علامہ راشد الخیری کی "طلسمات کا سفید بال" جی جل کے کوئلہ ہو گیا اٹھا کر دیوار سے ماردی اور اوندھی ہو گئی۔ رات بھر ٹھیک سے سوئی نہ تھی، فوراً سو گئی۔ اور کوئی خواب نہ آیا۔

شام کو آنکھ کھلی مگر میں سوتی بنی رہی۔ دو ایک بار کوئی دیکھنے بھی آیا۔ شیخانی بوا نے آواز بھی دی مگر میں نے دم سادھ لیا۔ وہ مجھے کھانا کھلانے پر مصر تھیں اور اماں کہہ رہی تھیں، بھوک، بھوک لگے گی کھا لے گی۔ شہزادی صاحبہ کے لئے خوان سجا کے لے جانے کی ضرورت نہیں۔

رات کو گیارہ بجے بھوک سے آنکھ کھلی میں نے فجر کے بعد کوئی نماز نہیں پڑھی تھی۔ جیسے میں اللہ میاں سے شرط باندھ رہی تھی کہ فجر کی نماز قبول ہوئی ہے تو پھر "کسی بھی اسٹیشن پر اتر کر مشن اسکول کا پتہ پوچھتی پہنچ جاؤں گی وہاں عیسائی ہو جاؤں گی۔ وہاں مجھے جتنا چاہوں گی پڑھنے کا موقع ملے گا۔"

تھوڑی دیر سناٹا گونجتا رہا۔ اماں کا سر درد مفلوج ہو گیا۔

"سُن رہی ہو بیگم یہ کیا بک رہی ہے"
خدا غارت کرے کمبخت کو خاندان کے منھ کو کالکھ لگائے گی"

"مگر ٹانگہ تو سانبھر میں ہے ہی نہیں" ابا میاں کی آنکھوں میں شرارت چمک اٹھی "اور ہماری رتھیں اور سرکاری اونٹ تمہیں ہماری اجازت کے بغیر نہیں ملیں گے"

"میں پیدل چلی جاؤں گی" میں نے مشرقی مینار سے لٹکتی ہوئی رسی کو اور مضبوطی سے تھام لیا۔ میری ہتھیلیوں میں سانبھر جھیل کا نمک ہولے ہولے جذب ہو رہا تھا۔

پھر خاموشی طاری ہو گئی۔ اماں نے ساڑھی کے پلو سے آنکھیں پونچھیں۔

"میں ظفر کو کیا منہ دکھاؤں گی"

"ظفر ہی نے اچھے بھلے پیغام میں کھنڈت ڈال دی۔ ورنہ اب تک تو ہم اس کمبخت کے بوجھ سے سبک دوش ہو چکے ہوتے"

"تو بس میرا بھائی ہی گناہ گار ٹھہرا، ارے ان کے بیٹے کے لئے تو ابزادیاں مل رہی ہیں۔ مگر اس نے میری خاطر میرا بوجھ ہلکا کرنا چاہا۔ ارے میرے پیر کپڑے لے کھا گئیں"

"اے شوکت آپا ذرا سے کھوپرے پہ دم دے دیتی ہو، خاک ڈالو"

"واہ واہ کیوں خاک ڈالو۔ ہم سہ پہر کو ضرور کچھ کھاتے ہیں۔ اس کا بھی خیال نہ کیا"

اتنے میں ننھے بھائی آ گئے۔ بیزر چلی گئی۔

"ہاں! بس تانگہ منگا کے جا ہی رہی تھی"

"کہاں جا رہی تھیں —؟"

"بورڈنگ —!"

"نہیں بورڈنگ تم نہیں جاؤ گی"

"میں قطعی جاؤں گی" مجھے ہنسی آئی۔ چاہا کہہ دوں آپ کے والد بزرگوار بھی یہی کہتے تھے۔

"آپ کو کیا، میں بورڈنگ میں رہوں یا کہیں رہوں؟"

"ہمارا نقصان ہو گا"

"کیسا نقصان ہو گا"

"تمہارے کھانے وغیرہ کے روپیہ سے ہمیں سہولت ہو جاتی گی" شوکت آپا بولیں۔

"اچھا تو تم لوگ منافع کماتے ہو ہم لوگوں سے"

"خاک منافع، تمہارے رہنے سے ہمیں تو پریشانی ہی ہو جائے گی"

"اور جو سہولت ہو گی وہ"

"بک بک نہ کرو" ننھے بھائی بولے اور شوکت آپا طنزیہ مسکرائیں۔

"ننھے بھائی! کھانے کا آٹھ روپیہ، دھوبی وغیرہ کا میں خود دوں گی۔ ایسا کیا منافع ہو گا کیونکہ میں کہے دیتی ہوں کہ میں قطعی آٹھ روپیہ سے زیادہ کا کھانا کھاؤں گی۔ نعیم میرے پڑھنے میں مخل ہوا تو ٹھکائی کر دوں گی"

"واہ واہ کیسے کرو گی ٹھکائی —"

"ایسے!" میں نے فوراً نعیم کے دھموکا لگایا وہ ہنس کر مجھ سے کشتی لڑنے لگا۔ اور شوکت آپا نہایت بھُس بھُسی ہیں اگر مجھ پہ بھولے سے ہاتھ اٹھایا تو دھن کے پھینک دوں گی۔ بچپن میں میں نے انہیں بڑی مار دی ہے مگر اب میں بچہ نہیں" ننھے بھائی ہنسنے لگے۔

"شوکت چنی سی کشتی لڑو گی ——؟"

"تمیری جوتی لڑتی ہے۔"

"تو بھئی اس کا بورڈنگ چلے جانا ہی اچھا ہے۔ جتنی ہے یہ تو اگر بگڑ بیٹھی تو تمہاری ہڈی پسلی ایک کر دے گی۔"

"واہ ۔۔۔۔ دیکھیں تو یہ ایک انگلی چھوا کر دیکھیں۔"

"اول تو ہم کالج میں ہوں گے، دوسرے ہم دو پہلوانوں میں چل رہی ہو تو دخل نہیں دیتے۔ تماشا دیکھتے ہیں۔"

ننھے بھائی نے زور سے میری پیٹھ پر تھپکی دی۔ کوئی اور نازنین ہوتی تو دم توڑ دیتی۔ میں ہنستی رہی۔

بورڈنگ جاتے وقت میں نے شوکت آپا کو منا لیا تھا۔ بے حد خوشامد سے ہر ہفتہ آنے کی اجازت مانگی۔ حالانکہ بالکل آنے کا ارادہ نہ تھا۔ خوب گھر کے کھانے کی تعریفیں اور بورڈنگ کے کھانے کو راتب کہا۔ بالکل روانہ ہوتے وقت چپکے سے بولیں۔

"یہ تمہاری اور جگنو کی شادی کا کیا قصہ ہے؟"

"مجھے کیا پتہ؟" میں نے معصومیت سے کہا۔

"بھائی صاحب کی کارستانی لگتی ہے۔" وہ اپنے باپ کو بھائی صاحب کہتی تھیں۔

"یہ شادی ہرگز نہ ہوگی۔ میں نے جگنو کو خط تو لکھا۔"

"پھر ——؟"

"اس نے جواب ہی نہیں دیا۔ مگر قیامت ہو جائے یہ شادی نہیں ہوگی۔"

جی چاہا کہہ دوں غصہ نہ دلاؤ، میں کہیں انتقاماً بدذاتی پر نہ تل جاؤں جگنو مجھے

بہت عزیز ہے۔ میں اس کا برا نہیں چاہتی۔

"ابھی تو مجھے بی اے کرنا ہے؟"

"شادی کے بعد پڑھتی رہو گی؟"

"انشاء اللہ!" میں بھی روانہ ہو گئی۔

مجھے نویں میں داخلہ مل چکا تھا مگر میں نے ضد کی کہ دسویں میں داخلہ لوں گی۔ خاتون آپا ان دنوں پرنسپل بنی تھیں۔ سمجھانے لگیں کہ اسکول کا نتیجہ خراب ہوگا، تم فیل ہو جاؤ گی۔

میں فیل نہیں ہوں گی اور فرض کیجئے ہو گئی تو کیا فرق پڑے گا۔ وہی بات ہو جائے گی ——"

میں نے انہیں سرسری انداز میں بتایا کہ میں کن مشکل راہوں سے گزر کر بورڈنگ میں آئی ہوں۔ سارے خاندان کو ناراض کیا ہے۔ مجھے کامیاب ہونا ہے۔ میں ٹیوشن لوں گی، دن رات پڑھوں گی۔ آپ نے میرے اردو کی پختگی نہیں آزمائی۔ مجھے موقع دیجئے۔ شاید میں آپ کو ناامید نہ کروں۔ میں تعلیم میں بہت پیچھے رہ گئی ہوں۔ نیر کو تو اس کی ماں فخریہ پڑھا رہی ہیں۔ میں سارے خاندان سے لڑ کر آئی ہوں۔

اس وقت رحمت کے فرشتہ کی طرح اعلیٰ بی آ گئیں۔ اعلیٰ بی یعنی بیگم شیخ عبداللہ بانی علی گڑھ گرلز کالج روزانہ بورڈنگ اور اسکول میں چکر لگایا کرتی تھیں۔ انہوں نے بڑے زور شور سے میری حمایت کی اور اپنے مخصوص انداز میں بولیں۔

"اے بی خاتون چولہے میں ڈالو اسکول کے نتیجے کو، بچی محنت کرنے کو کہتی ہے۔ اسے موقع دو۔"

"ورنہ پھر میں پرائیویٹ امتحان دوں گی۔ مگر اس سال میٹرک کا امتحان ضرور دوں گی۔"

"ہاں ہاں بیٹی تو میرے پاس رہنا۔ خاتون اسے امتحان دینے سے تو نہ روک پاؤ گی، داخل کرلو، میں ذمہ لیتی ہوں اس کا۔"

میں داخلہ کے بعد نکل رہی تھی تو وہ خاتون آپا سے کہہ رہی تھیں۔

"غضب خدا کا خاتون، ایک لڑکی کا ارادہ کمزور کرنا چاہتی تھیں۔"

بورڈنگ میں میں اور تیز ایک کمرے میں رہنے لگیں۔

تیز بڑی سلیقے والی تھی میں کمرہ گندہ کرتی اور پڑھنے بھاگ جاتی وہ بڑبڑاتی مگر چندن کر دیتی کمرہ۔ مجھ پر بڑا رعب جماتی، وہ ذہین بھی تھی۔ شوخ بھی اور کلاس میں اول آتی تھی۔ میں ہمیشہ سمجھتی تھی وہ بہت تعلیم حاصل کرے گی، نام پیدا کرے گی، شہرت پائے گی۔ مگر وہ ہمیشہ سے نہایت سلجھی ہوئی دوست نواز اور فرمانبردار تھی۔ اس کی ماں اور دادی نے اس کی منگنی ددھیال میں ایک بہت ہونہار لڑکے سے کر دی تھی اور وہ بہت خوش تھی۔ وہ ایک مثالی مشرقی خاتون بننے کے خواب دیکھتی تھی۔ اچھی بیٹی فرمانبردار بہو بہترین ماں اور سماج کی پرانی قدروں کی شدت سے قائل۔ ہم بچپن سے ساتھ رہے اسے میری کوئی ادا پسند نہ تھی اور مجھے اس کے زندگی کے پروگرام سے کوفت ہوتی تھی۔ مگر ہم دونوں میں بہت گہرا پیار تھا۔ ایک دوسرے کی خوشی سے خوشی ہوتی تھی۔

نہایت نمکین، سبک نقشہ، نازک ہاتھ پیر بے حد جامع زیب ساتھ ساتھ نہایت شوخ باتونی اور اپنی عمر سے زیادہ ہوش مند۔ بچپن سے ہی ہر بات میں وہ مجھ سے بہتر تھی۔ نہایت اچھی سلائی بنائی اور پکوان تیار کرتی تھی۔ اس نے پانچ برس کی عمر میں ایک کوچوان کا کرتا سیا اور ترپائی کی۔ سب حیرت زدہ ہوتے تھے وہ اپنی پتلی پتلی انگلیوں سے نازک کشیدہ کاری کرتی تو اس میں اتنی صفائی ہوتی تھی کہ بڑے بڑوں کو مات کر دیتی۔

اس نے چھ برس کی عمر میں قرآن ختم کر لیا لمبے لمبے سنہری جھلک لئے بال تھے۔

میں اس کا بالکل مخالف عکس تھی۔ ہر وقت میرا اس سے موازنہ کیا جاتا اور میں صفر ثابت ہوتی۔ مگر اپنے کسی رویّہ سے اس نے مجھے حقیر نہ سمجھا۔ مجھ سے بڑی پیاری دوستی تھی۔ بریلی کی سہیلیوں کی صحبت میں اسے وہ باتیں معلوم ہو چکی تھی۔ جن سے میرے فرشتے بھی انجان تھے۔ ہر معاملے میں وہ میری استاد تھی۔ میں ہاتھ پیر مار کر اس سے ایک کلاس آگے ہو گئی تھی مگر وہ مجھے بہت کچھ پڑھا سکتی تھی۔

جب تک تیز میرے کمرے میں نہیں آئی تھی ایک تیسری کلاس کی لڑکی کچھ دن رہی۔ یہ لڑکی نہایت غریب بیمار اور بدصورت تھی۔ بالکل لاوارث تھی بس اس کی آنکھیں اتنی بڑی تھیں کہ صورت بھیانک لگتی تھی۔ دماغی طور پر بہت کمزور تھی۔ گھنٹوں بیٹھ کر ایک جملہ رٹتی اور دم بھر میں بھول جاتی۔ مجھے اتنا گھورتی کہ میں بدحواس ہو جاتی۔ بالکل نوکروں کی طرح میرے کپڑے تہہ کرتی۔ کتابیں سجاتی بغیر مانگے پانی کا گلاس لے آتی۔ اس کے دانت چھدرے اور چھجہ کی طرح آگے کو نکلے نچلے ہونٹ پر دھرے رہتے تھے۔ بات کرتی تو لعاب کے تار دانتوں اور ہونٹ کے درمیان جال سا بننے لگتے اور میرے حلق میں ابکائی امنڈ آتی۔

شام کو میں پڑھتی رہتی۔ اور وہ میرا پلنگ گھسیٹ کر صحن میں بچھاتی، بستر کرتی اور تکیہ پر بیلے کے پھول سجاتی۔

رات کو کبھی میری آنکھ کھل جاتی تو وہ بڑی بڑی بھیانک آنکھیں مجھے بہت قریب سے گھورتی ملتیں۔ انجانے خوف سے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے اور میں چیخ کر نہ جانے کیا بک دیتی اور وہ سہم کر اپنے پلنگ میں دبک جاتی۔ میں جھلا کر اپنا پلنگ اس سے دور کھینچ لے جاتی۔ مگر پھر میری آنکھ کھلتی تو اس کی برف زدہ انگلیاں مجھے اپنے جسم پر رینگتی محسوس ہوتیں۔ سوکھی ماری لڑکی سے مجھے

ایسا خوف آتا کہ جیسے وہ مجھے نگل جائے گی۔ وہ مجھے گھورتی مگر مجھ میں اس سے
آنکھ ملانے کی ہمت نہ ہوتی۔

مجھے اس نفرت اور حقارت کے طوفان سے بڑی دہشت ہوتی جو اس
کے خلاف میرے دل میں موجزن ہو جاتا۔ میں کسی سے اس کا ذکر بھی نہیں کر سکتی
تھی، کیوں؟ یہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ مجھے اس کا ذکر کیوں گھناؤنا لگتا ہے۔

بورڈنگ کی دلچسپیوں نے تھوڑے دن کے لئے مجھے یہ بھلا دیا کہ زندگی
کہ زندگی میں میرا ایک مقصد ہے۔ میٹرک کے امتحان میں کامیابی حاصل کرنا ورنہ
زندگی کے دروازے مجھ پر ہمیشہ کے لئے بند ہو جائیں گے۔

میں ہر گیم میں حصہ لیتی۔ بڑی جلدی وزن کم ہو گیا۔ اور میں جی جان سے کھیلوں
میں غرق ہو گئی۔

تب میری کلاس میٹ عصمت خان نے مجھے گرفت میں لیا۔ ہم دونوں
ہم نام تھیں۔ رول کال کے وقت بڑی گڑبڑ ہوتی خاص طور پر میتھمیٹک کی ٹیچرس
رام چراغ پا ہوتی تھیں۔ وہ سمجھتی تھیں ہم ان پر کوئی ڈاکٹویٹ آزما رہے ہیں۔ غصہ
میں آکر رجسٹر پھینک دیتیں۔ وہ سمجھتی تھیں ہم نے شرارت میں ایک جیسے نام
رکھ لئے ہیں۔ سعادت تین سال سے پڑھ رہی تھی۔ وہ اسے عصمت کہتی تھیں
کیونکہ رجسٹر میں اس کا نام عصمت لکھا۔ پیار کا نام سعادت تھا۔

میں نئی تھی وہ مجھ پر بے حد خفا ہوتی تھیں کہ میں نام پکارنے انہیں ستانے
کے لئے بول پڑتی ہوں۔ اس کے اس برتاؤ پر ہم لوگوں کی بے اختیار ہنسی چھوٹ
جاتی۔ اور وہ جل کر خاک ہو جاتیں اور نزلہ مجھ پر اتارتیں۔۔

کھیل کے میدان میں بھی مجھ سے انہیں سخت شکایات تھیں۔ میں نے جو کھیل
کبھی نہیں کھیلے تھے ان کے اصول جاننے سے پہلے حصہ لینے لگی۔ تندرستی اچھی

تھی کھیل تو فوراً قابو میں آجاتا لیکن بے حد اندھا دھند مچ جاتی۔ وہ سمجھتیں میں جان بوجھ
کر انہیں ستانے کے لئے رول توڑتی ہوں۔ چونکہ میں لڑکوں کی صحبت میں پلی تھی
جانکار لڑکیوں سے کبھی اچھا ہی کھیل ڈالتی تھی۔ اس لئے مجھے ٹیم میں لے لیتی تھیں۔

سعادت کو پتہ تھا کہ میں کئی مضامین میں کمزور ہوں۔ اردو میرا سب سے کمزور
مضمون تھا کیونکہ سانبھر میں تھوڑی بہت کتابیں پڑھنے کے علاوہ میں نے اردو
کے بجائے انگریزی حساب جغرافیہ اور تاریخ پر زیادہ محنت کی تھی۔

شاعری نہ کبھی پڑھی نہ ہمارے گھر میں شاعرانہ ماحول کے پنپنے کا سوال زیادہ
تر تو بڑے ابا کی شاعری چھپی تھی اور شاعری سے اور بھی جی اچاٹ ہوتا تھا۔ اردو پردے
کے پیچھے بیٹھ کر ماسٹر مبارک علی سے پڑھتے تھے۔ انہیں پتہ نہیں چلتا تھا کہ کون لڑکی پڑھ
رہی ہے۔ اس لئے ان کی کلاس میں مشکل مضامین رٹا کرتے۔ زیادہ وقت سعادت
ہی دھیان سے پڑھتی اور سمجھتی تھی۔ کلاس میں میرے علاوہ سعادت، زہرہ بٹ
محمودہ عمر اور مونا پیرس اور شاید سعیدہ عمر الدین کل چھ لڑکیاں تھیں۔

مجھے کھیل کود میں غرق دیکھ کر سعادت نے پکڑا اور مجھے اپنے ساتھ پڑھنے پر
مجبور کیا۔ سعادت مجھے پڑھا کر ہی اپنا سبق یاد کرتی تھی۔

اگر سعادت نہ ہوتی تو شاید میں اتنی محنت نہ کرتی۔ اس نے میرا تیل نکال ڈالا۔
کئی بار میں نے اس سے اپنی لیچڑ قسم کی روم میٹ کا ذکر کرنا چاہا مگر نہ جانے
کیوں زبان نہ کھلی۔

پھر جب امتحان سر پر آئے تو میں اپنی ممانی جان کے ہاں چلی گئی کیونکہ اب سعادت
تنہا پڑھنا چاہتی تھی۔ اور میرا ماموں زاد بھائی عشرت عثمانی بھی میٹرک کا امتحان
دے رہا تھا۔

عشرت بہت ہی ذہین تھا۔ مگر اسے بھی کسی کے ساتھ پڑھنے کی عادت
تھی عشرت نے بھی مجھے بے انتہا گھسا۔ آپا جی ہماری دینیات کی استانی نے

ایک دعا بتادی تھی کہ پڑھ کر امتحان کے کمرے میں داخل ہو تو کامیابی یقینی ہے۔ اور امتحان کے زمانے میں نماز تو زور شور سے پڑھتے ہی لگتے ہیں۔ خاص طور پہ تہجد کیونکہ صبح اٹھ کر پڑھنے سے پہلے اگر وضو کر کے نماز پڑھی جائے تو نیند اڑ جاتی ہے اور برکت تو ملتی ہی ہے۔

امتحان کے کمرے میں جاتے وقت لڑکیاں اپنی دوستوں کو ہار پھول پہنا کر وش کرتی ہیں۔ مگر میری روم میٹ روز میرے لئے بازار سے گجرا منگا کر پیش کرتی۔ جی چاہتا کمبخت کے منہ پر مار دوں کیوں؟ یہ مجھے نہیں معلوم تھا۔

ایک دن جب آخری پرچہ تھا تو صبح ہی اٹھی تو میں نے شکر کیا کہ کوئی گجرا میرے تکیہ پر نہیں سجا ہوا تھا۔ کمرے سے نکلنے لگی تو ایک سسکی سی سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو بڑی بڑی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ قریب گئی تو پلکیں نہیں جھپکیں اور آنکھوں کے ڈیلے ابلنے لگے جیسے مینڈک کی طرح اچھل کر مجھے دبوچ لیں گے اس کا پاجامہ اور بستر بھیگا ہوا تھا اور سارا جسم نیلگوں ہو رہا تھا۔

میں سرپٹ بھاگی کمرے سے۔

آخری پرچہ کر کے جیسے کندھوں پر کسی نے پر اُگا دیئے۔ خوشی سے الٹے سیدھے انگریزی اور اُردو کے گانے گاتے قلانچیں بھرتے داخل ہوئے۔

"شی!" میٹرن نے ڈانٹ بتائی۔

"کیوں — ؟"

"رسول فاطمہ کا انتقال ہوگیا۔"

نہیں میرے قلم میں طاقت نہیں جو میں اس نفرت اور گھن کی تفصیل لکھ سکوں جو مجھے خود اپنے وجود سے آنے لگی۔ صبح شاید وہ دم توڑ رہی تھی۔ میں نے میٹرن کو اطلاع نہ دی سیدھی امتحان دینے چلی گئی۔ آخری پرچہ اُردو کا تھا۔

اگر میں میٹرن کو خبر کر دیتی تو شاید وہ بچ جاتی۔ کئی دن سے وہ پیلنے کے درد میں

تڑپ رہی تھی۔ مگر اپنا کمرہ چھوڑ کر نرسنگ روم میں جانے کو تیار نہ تھی کہ اکیلے کمرے میں مجھے دہشت ہوگی، پرچہ اچھا نہ کر سکوں گی۔

دن رات دو زخمی آنکھیں میرا پیچھا کرتیں۔ اندھیروں سے جھانکتیں۔

وہ ایک لاوارث لڑکی تھی کوئی اس کی میت کا وارث بھی نہ آیا۔ اس کا جنازہ اٹھا یا لڑکیاں چیخ چیخ کر روئیں۔ کاش مجھے بھی رونے کی عادت ہوتی۔ میری آنکھوں میں کنکر چبھتے رہتے ہیں میں نے اسے قتل کیا۔ آج تک میں نے کسی کو نہیں بتایا کہ میں قاتل بھی ہوں۔

کوئی لڑکی اسے اپنے ساتھ رکھنے کو تیار نہ ہوتی تھی، وہ نہایت چپکنی تھی، لپٹ جاتی تھی۔ لڑکیاں اس سے گھبراتی تھیں۔ میں کتنی فراخ دل تھی کہ میں اس کے ساتھ اتنے سکون سے رہی۔

"تمہیں اس نے نہیں ستایا؟"

"نہیں —!" میں نے کہہ دیا۔

"تم بڑی دل والی ہو بہن!" سب نے بڑی تعریف کی۔

اور خود میں نے!

میں نے خود اپنے سے کبھی کچھ اس کے بارے میں نہ پوچھا نہ کہا۔ دماغی توازن برقرار رکھنے کے لئے مجھے چُپ ہی رہنا تھا۔

کئی رات وہ خواب جو مجھے بچپن سے ستایا کرتا تھا، اور میں سوتے میں اٹھ کر اِدھر اُدھر نہ جانے کسے ڈھونڈا کرتی تھی۔ وہی دھند میں کوئی میلے مٹیالے کپڑوں کی گٹھڑی سِل پر سفید کچھ پیس رہی ہے۔ شاید کھیر کے چاول ہیں۔ دور تک فضا میں عورتوں کے بین کی آواز پھیلی ہوئی ہے۔ اور میری سانس رُک رہی ہے۔ رُک جاتی ہے۔ میں چونک کر جاگ پڑتی ہوں۔ لالٹین جلا لیتی ہوں کہ اندھیرے میں دو زخمی لحیم شحیم آنکھیں مجھے ڈسنے لگتی ہیں۔

بیڈی میکبتھ کو ذہنی تلوار پر خون کے دھبے دکھائی دیا کرتے۔ وہ مسلسل ہاتھ دھوتے
جاتی دھبے اور گہرے ہو جاتے۔

بعد میں ڈاکٹر کی رپورٹ سے پتہ چلا کہ آٹھ دس گھنٹے پہلے ہی مر چکی تھی؛ وہ
آواز شاید کوئی اور آہٹ ہوگی۔ پھر اس کی آنکھیں لاکھ کوشش پر بند نہ ہو پائیں۔

شمیم بھی بورڈنگ میں تھے اور ان کے پاس آتا تھا۔ ننھے بھائی نے انہیں
تھوڑے دن رکھا۔ وہ دن بھر شوکت آپا کا جی جلاتے، نعیم کو رلاتے۔ اور کھانا
ہاتھ لگ جاتا تو گوشت قیمہ روکھا کھا جاتے۔ روٹیاں کوؤں کو کھلا دیتے شوکت
آپا زیادہ تر سویا کرتی تھیں۔ اٹھتیں اور کھانے کا صفایا اور شمیم کو گھر سے غائب پاکر
سر پیٹ کر رہ جاتیں وہ کئی کئی دن کے لئے غائب ہو جاتے آہستہ آہستہ
وہ اپنا سامان بھی لے گئے تھے۔ جس دن اچانک آجاتے صفایا کر دیتے۔
یہاں تک کہ نعیم کا دودھ بھی مع ملائی کے کھا جاتے۔

ننھے بھائی نے سرکار کو لکھا کہ اس سے ان کی جان چھڑائی جائے۔ اور وہ
بورڈنگ منتقل ہو گئے۔ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ میرے پاس روپے ہیں۔ جھوٹ
بولنے میں تو مشتاق تھے۔ کہتے

"ابا میاں نے لکھا ہے کہ تم سے لے لوں۔ اور ویسے بھی اگر میں فیل ہو گیا تو تم بھی
فیل ہو جاؤ گی۔"

"وہ کیوں ——؟"

"کیونکہ میں ہی تمہیں پاس کرا سکتا ہوں۔ میری سب پروفیسروں سے دوستی
ہے۔ دن رات کا ساتھ اٹھنا بیٹھنا ہے، بلکہ پرچے بنانے میں ان کی مدد کر رہا ہوں۔"

مجھے اس وقت نہیں معلوم تھا کہ زیادہ ممتحن باہر کے ہوتے ہیں۔ میں ان کے
چکر میں آجاتی اور وہ روپیہ مار لے جاتے۔

امتحان کے بعد جب دعوتیں، پارٹیاں ختم ہوئیں تو جودھپور جانے کا سوال آیا۔
کئی بار شمیم آ چکے تھے کہ "چلو اب یہاں کیوں مری پڑی ہو" ان کے نوابزادے تو
بغیر امتحان دیئے ہی چلے گئے تھے۔

جیسے ہی شدت کی گرمی ہونے لگی، وہ مسوری چل دیئے۔ شمیم ایک پارٹی
کے ساتھ آگرہ رنڈیوں کا گانا سننے گئے تھے۔ ورنہ ضرور ان کے ساتھ جاتے۔ میں
ان سے پڑھنے کو کہتی تو جواب دیتے۔

"تین دفعہ کا کورس رٹا پڑا ہے۔ ذرا سی کتبیا بدلی گئی ہے سو ہم سے بچ کر کہاں
جائے گی۔"

"کچھ مشکل سوال ہوں"

"کون سی کتبیا؟"

"یاد نہیں، پتلی سی ہے۔ اس کمبخت شیکسپیئر کی۔"

"میکبتھ ——؟"

"ہاں ہاں وہی۔ اس میں کیا دھرا ہے۔ مجھے پورا شیکسپیئر رٹا پڑا ہے۔ چاہے
جہاں سے پوچھ لو۔"

"مگر وہ تو خاصی موٹی کتاب ہے۔"

"پیارے میاں الو کے پٹھے نے اپنے کتے سے پھڑوادی آدھی سے
بھی کم بچی۔ مگر ہمیں سب یاد ہے۔"

"اچھا لیڈی میکبتھ کی سولو لوکی سناؤ۔"

"کس کی؟ اس کھکھوڑائن کی؟ کیا گدھے پن کی بکواس ہے۔ میں نے بھی اسے
وہ کھری کھری سنائیں کہ بس دانت کھٹے ہو گئے ہوں گے۔ مگر دیکھ لینا نمبر فل
ملیں گے۔"

میں نے تو لیڈی میکبتھ کو ذہنی احساسِ گناہ میں گرفتار رہتا کر رحم کھایا تھا۔ دولت اور اقتدار کی ہوس انسان کی کیا مٹی پلید کرتی ہے۔ دو دن پہلے رشیدہ آپا آئی تھیں۔ پتہ نہیں وہ کیا کان میں ڈال گئیں۔ شمیم کے بقول خود ان کی فرسٹ ڈویژن تو دھری ہے، کیا تعجب جو ٹاپ کر جائیں۔

شمیم ہانکتے تو بہت تھے مگر تین برس ایک ہی کلاس میں پڑھ کر تو میں بھی شاید فرسٹ ڈویژن مار لوں۔ شمیم فرسٹ ڈویژن آ گئے تو کون سا تیر ماریں گے۔ مجیب کے ساتھ تھے۔ انہوں نے بی ایس سی کا امتحان دیا ہے انہیں بھی۔ بی۔ اے کا امتحان دینا چاہیئے تھا۔ مگر ان کا ارادہ آگے جھک مارنے کا بالکل نہیں تھا۔ وہ فلم میں جانے کے منصوبے بنا رہے تھے۔

”فلم میں جاہل ہی زیادہ کامیاب ہوتے ہیں۔“ وہ بھولے میں خود کو جاہل کی فہرست میں شمار کر گئے۔

”بالکل غلط سُندری۔ اے ہیں۔ موتی لال بی اے ہیں۔“ انہیں کسی فلم میں دیکھا نہیں تھا صرف سُنا تھا۔“

”ارے سب شہرت کے لیئے دُم چھلے لگا لئے ہیں۔ چارلی اور ڈکشٹ۔“

”چارلی تو سُنا ہے بی۔ اے ہیں۔“

”بس اتنی ہی تمہاری معلومات کچھ نہیں جیب کترا تھا۔ ایک دن چندولال شاہ کی جیب کتری، اس صفائی سے کہ ان کے فرشتوں کو بھی خبر نہ پڑی۔ بس لوٹ ہو گئے چندولال شاہ اور رکھ لیا پانچ سو پر ملازم۔“

”پانچ سو پر“ مجھے کسی فلم والے موتی لال، سرتندر اور اشوک کمار۔ کسی کے نام نہیں معلوم تھے۔ ہاں اور ڈی بلی موریہ اور ای بلیموریہ اور سلوچنا۔ یعنی کافی معلومات تھیں۔

ان میں سے صرف ایک فلم سلوچنا اور بلی موریہ کی نمائش کی سال پہلے میں نے دیکھی تھی جس پر ابا نے اماں کو بہت ڈانٹا تھا اور باقی نمائش پر پابندی لگا دی گئی تھی۔

امتحانوں کی وجہ سے سعادت نے مجھے نہیں جانے دیا تھا۔ ورنہ جی تو بہت تڑپا تھا۔

”تو ہمارا کرایہ تم دو تو ہم تمہیں گھر لیتے چلیں۔“

”میں تو اکیلی آئی تھی اکیلی چلی جاؤں گی۔“

”نہیں ہم تمہیں اکیلا نہیں جانے دیں گے۔“

”تمہیں پتہ بھی نہیں چلے گا کہ ہم کس دن گئے۔ ہم برقعہ اوڑھ لیں گے اور بہت سی لڑکیوں کے ساتھ جائیں گے۔“

بڑی کمینی ہے کمبخت۔ بہن ہمیں لے چل ہمارے پاس کرایہ نہیں۔ لاؤ اپنے اور ہماری ٹکٹوں کے پیسے۔“

تھوڑی سی بحث کے بعد میں نے حساب لگا کر خرچہ کے روپیہ دے دیئے۔ شمیم خوب ہنسے۔

”گدھی! یہ دیکھو انہوں نے جیب سے روپیہ نکال کر دکھایا آج ہی منی آرڈر ملا ہے۔“

”لاؤ میرے پیسے کمینے کمبخت۔“ مگر شمیم ہنستے ہوئے چلے گئے۔

شمیم نے زندگی میں اتنی بار اُلّو بنایا پھر بھی عقل نہ آئی اور ہمیشہ ہر کوئی اس کے جھانسے میں آجاتا تھا۔

پلیٹ فارم پر مجھ سے میرا ٹکٹ مانگا۔

”کیوں ——؟“ میں نے پوچھا۔

"ارے بیوقوف ہم حفاظت سے رکھیں گے تم کھودوگی"

میں نے ٹکٹ نہیں دیا۔ کیا عجب جو ابھی جاکر ٹکٹ واپس کر کے پیسے داب لے اور میں بے ٹکٹ سفر کرتی پکڑی جاؤں۔ اور جرمانہ بھردں۔ میں نے کہا "تم فکر نہ کرو میں حفاظت سے رکھوں گی"

"دیکھو وہ آئس کریم والا کھڑا ہے۔ ہمیں آئس کریم کھلاؤ"

"لاؤ پیسے ——!"

"نہیں اپنے پیسے سے کھلاؤ"

"ہٹ ہٹ۔ یہ جھول ہے"

"اگر نہیں کھلاؤ گے تو میں چلاتی ہوں کہ یہ لڑکا مجھے چھیڑ رہا ہے" میں نے ان کا گریبان پکڑلیا۔

"ہٹ بیہودہ ہم تو تیرے سگے بھائی ہیں"

"ٹکٹ بابو کو کیا معلوم" شمیم بے بس ہو گئے۔

"کمینی کہیں کی اچھا گریبان تو چھوڑ ابھی کھلاتا ہوں چڑیل"

میں نے گریبان چھوڑ دیا۔ دور ہٹ کر بولے "دو جوتے کھلاتا ہوں۔ ذلیل ہمیں بنانے چلی تھی"

"اچھا تو ناشتہ دان میں سے ایک نوالہ نہیں ملے گا۔ ممانی جان نے کباب پراٹھے اور خاگینہ اور شکر قند کا حلوہ ......"

"لا ہمارا حصہ دے دے"۔ "دو جوتے دوں گی"

"مکار!" جھنجھناتے ہوئے گئے اور آئس کریم لادی۔

"اللہ کرے حلق میں کیڑے پڑیں ڈپتھیریا ہو جائے۔"

"اُف کتنی لذیذ ہے کہ بس مم مم"

شمیم کتنے ہی بدذات سہی ان کی خدمت میں وقت خوب گزرتا تھا۔ اتنا ہنساتے تھے کہ پیٹ دُکھنے لگتا تھا۔ گھر میں ہر ایک کو بنا کر جو چاہتا اینٹھ لیتا۔ اور سچ تو خدا کا بندہ کبھی بولتا ہی نہیں تھا۔ پھر بھی شمیم نہ ہوتے تو مزہ نہیں آتا تھا۔ شوکت آپا کو بے حد ستاتے تھے۔ مگر وہ بھی ان کی باتوں پر ہنسی نہ روک پاتی تھیں۔ نعیم کے دودھ کی ملائی چپٹ کر جاتے۔ شوکت آپا دُھائی ڈالتیں۔ تو کبھی نہ مکرتے۔

"ہاں کھائی ملائی تو پھر؟ ارے اس کمبخت کا چچا ہوں۔ بزرگوں کی خاطر مدارات تو چھوٹوں پر واجب ہے۔ اسے توفیق نہ ہوئی تو میں نے دل میں کہا "تو چچا ہے بھتیجے کا خیال تو نہ رکھے گا۔ تو نہ رکھے گا تو اور کون رکھے گا۔ میں نے ملائی کھائی اسے خدا کی خوشنودی مُفت ہاتھ آگئی۔ بزرگوں کی خدمت بڑا ثواب کا کام ہے"

"ارے غارت ہو خوشنودی! اور ثواب جائے چولہے میں۔ ندیدہ کہیں کا"

"اور بھئی ہم تو اسی کے فائدے کے لئے ملائی زہر مار کر جاتے ہیں، کوئی ہمیں پسند ہے ملائی۔ اللہ قسم۔ گھن آتی ہے چکنی چیزوں سے"

"ہاں بڑے چہیتے بزرگ بنتے ہو کبھی بھتیجے کو کچھ دیتے ہاتھ ٹوٹتے ہیں"

"ارے کیا ذلیل باتیں کرتی ہو شوکت، یہ لے نعیم بیٹے" انہوں نے جیب سے روپیہ نکال کے نعیم کی ہتھیلی پر رکھ دیا" شوکت آپا شرمندہ ہو گئیں "جا بیٹے عیش کر!"

ننھے بھائی تولیہ باندھے نہا کر نکلے، میز پر کچھ ڈھونڈنے لگے۔

"شوکت یہاں روپیہ رکھا تھا، تم نے نہیں اٹھایا؟" نعیم کے ہاتھ میں روپیہ دیکھ کر "نعیم یہ روپیہ ......"

نعیم بے حد ہکلاتا تھا۔

"یہ ...... یہ ...... رو رو .... "

"گدھے کتنی بار منع کیا ہے۔ ہماری چیزوں کو ہاتھ نہ لگایا کرو" انہوں نے روپیہ چھین ایک چپت لگائی۔

"چہ ... چہ چاچا" نعیم اور بھی ہکلا کے رونے لگا۔

"واہ واہ! بیکار مار دیا۔ شمیم دے کے گئے ہیں یہ روپیہ"

"شمیم اور کسی کو روپیہ دیں اور وہ بھی اپنی جیب سے۔ گھاس کھا گئی ہو"

شوکت آپا خوب جھنائیں شمیم کو کوسنے لگیں۔ مگر ننھے بھائی مسکرا رہے تھے

"بدذات کو ڈانٹیے گا"

"ہمارا روپیہ مل گیا، ہم کسی کو نہیں ڈانٹیں گے"

یہ قصہ شوکت آپا نے سُنایا اور ہنسنے لگیں۔ کہاں تک جی جلاتیں۔

چھٹیاں ختم ہونے والی تھیں، اور سب کا چل چلاؤ تھا۔ ننھے بھائی شوکت آپا کو لینے جودھپور گئے، وہ اسحاق بھائی کے ہاں ٹھیری ہوئی تھیں وہیں چنو ٹائیفائڈ کے علاج کے لئے مستقل سال بھر سے تھے، انہیں کوئی افاقہ نہیں ہو رہا تھا۔

ننھے بھائی انہیں معائنہ کے لئے ہسپتال لے گئے معلوم ہوا ٹی بی ہے دوسری اسٹیج شروع ہو چکی ہے۔ ننھے بھائی نے وہیں چنو کو بتا دیا کہ تمہیں ٹی بی ہو گئی ہے سیدھے سوجت چلو، وہاں سرکار کے فیصلہ کے بعد تمہارا علاج ہوگا۔

جب چنو آیا تو پہچان نہیں پڑتا تھا۔ میں نے اسے قریب دو سال بعد دیکھا تھا بے انتہا لمبا بانس، ہڈیاں ہی ہڈیاں بوٹی نام کو نہیں۔ گھر میں ماتم پڑ گیا۔ اماں نے ننھے بھائی کو خوب ڈانٹا جیسے وہی چنو کو ٹی بی کرا لائے تھے۔

ابا نے سینی ٹوریم میں عرضیاں بھیجیں کہیں خالی جگہ نہ تھی۔ آپا موجود تھیں وہ بچوں کو لے کر علی گڑھ جانے والی تھیں۔ ابا نے ان سے کہا "تم چنو کو لے کر آبو ہل اسٹیشن

چلی جاؤ تمہارے بچے آرام سے علی گڑھ پہنچ جائیں گے۔

چنو کا قد چھ فٹ تین انچ ہو گیا تھا۔ ایک دن اسے خون آیا تو بچوں کی طرح رونے لگا۔ اماں کا روتے روتے بڑا حال تھا۔ چنو سے انہیں محبت کرنے کی فرصت ہی نہ ملی تھی۔ کسی کو بھی چنو سے دلچسپی نہ تھی وہ بہت تندرست جنگلی بجار کی طرح طاقتور تھا۔ منے بھائی کو بھی ٹی بی ہو جائے گی۔ یہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ میں اور چنو بچپن سے ایک دوسرے سے زیادہ قریب رہے تھے۔ شمیم انتہائی بدذات اور مرکھنے تھے۔ جب وہ ہم سے تگڑے تھے تو ہم دونوں میں کسی کو بھی ستاتے دوسرا فوراً مدد کو پہنچتا۔ اور ہم دو مل کر ان پر بھاری پڑ جاتے تھے۔ چنو کو دق! میرا کلیجہ مسل گیا اور چھپ کر بہت روئی۔ سارا گھر سہما ہوا تھا۔ اماں وقت بے وقت روتیں۔

میں نیرّ حبیب مجیب علی گڑھ چلے گئے۔

ایف اے کلاس میں چھ لڑکیاں تھیں۔ آج علی گڑھ کالج میں دو دو سیکشن ہیں۔ اور داخلہ نہیں ملتا۔ اس وقت علی گڑھ میں صرف "ایف اے" سیکنڈ ایئر تک انتظام تھا۔ مسلمان، لڑکیوں کو پڑھانے کے خلاف تھے۔ سعادت لکھنؤ آئی۔ ٹی کالج چلی گئی تھی۔ وہ میڈیسن کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ لکھنؤ میں چھٹیاں ہوتیں تو وہ بنگلور اتنی دور جانے کے بجائے علی گڑھ آجایا کرتی تھی۔ اور کلاس میں بھی بیٹھتی تھی اگر ہماری کلاسیں ہوتیں۔

بورڈنگ کی زندگی انتہائی محدود مگر زندہ دل انسان کے لئے تو پتھر میں بھی پھول کھلنے لگتے ہیں۔ میں ہر ہنگامے میں انتہائی جوش و خروش سے حصہ لیتی۔ بہت سی دوست تھیں تو بہتوں سے لڑائیاں بھی ہوئیں گیمس اب میرے قابو میں آ چکے تھے اور ہر گیم میں حصہ لیتی تھی۔

البتہ اسے کی لڑکیاں ان خاص کمروں میں رہتی تھیں۔ جو ڈرائینگ روم کے قریب تھے۔ کمروں کے پیچھے غسل خانے بھی تھے۔ بجلی اب بھی نہیں آئی تھی۔ اور لالٹین جلتی تھی۔ پلنگ ہر لڑکی کو اپنے یہاں سے لانا پڑتا تھا۔ اور ایک دن جب شوکت آپا سو رہی تھیں میں کوڑے کی کوٹھری میں چھپا ہوا نیا نیا پلنگ اڑا لائی تھی۔ اس کا میں نے ان سے کبھی ذکر نہیں کیا، بیچاری نے ڈھونڈا ہو گا۔ پھر مہترکو چور گردان لیا ہو گا۔

میری روم میٹ نصیرہ تھی جو سیکنڈ ایئر میں تھی۔ نصیرہ بے حد پیاری ہنس مکھ اور ہر کھیل میں مشاق تھی۔ نصیرہ میری جان تھی میرے چھوہر پنے کو جھیلتی تھی۔ اگر میں کسی میں کسی کے پاس گپوں میں کھو جاتی تو فوراً پکڑ کر مجھے پڑھنے کی طرف توجہ دینے پر مجبور کرتی۔

ممتاز عبداللہ ہمیں ہسٹری پڑھاتی تھیں۔ کافی معمر اور انداز سے بے حد زردس تھیں اس لئے بے حد رعب جماتی تھیں۔ ان سے لڑکیاں بے حد خائف تھیں۔ میں بھی خاصی ڈرتی تھی۔ اور اپنی خصلت کے مطابق جس سے ڈرتی تھی اس سے کافی بدظن ہو جاتی تھی۔ مجھے رعب جمانے والوں سے بغض تھا۔

ان سے بالکل مختلف اُن کی بڑی بہن خاتون عبداللہ پرجان جاتی تھی۔ بے حد نرم گفتار ہمیشہ مسکرا کر بات کرتیں۔ کسی لڑکی کو ڈانٹنا ہوتا تو بے حد گھبراتیں ڈانٹتے ڈانٹتے انہیں ایک دم ہنسی آجاتی اور اُن کی پوزیشن ڈگمگانے کا خدشہ پیدا ہو جاتا۔ کیونکہ وہ اتنی نرم دل تھیں اُن سے واقعی ڈر لگتا تھا۔

مس رام اب میری کوئی کلاس نہیں لیتی تھیں۔ صرف گیمس کراتی تھیں خود انہیں گیمس سے وحشت ہوتی تھی۔ مگر اپنی ڈیوٹی بجا لانا فرض سمجھتی تھیں۔ چوتھی کلاس سے وہ مجھے جانتی تھیں اور ہر شرارت میرے سر چپکا دیتی تھیں۔ لڑکیاں میری طرف

سے صفائی پیش کرتیں میں خود بے گناہی کے ثبوت مہیا کرتی مگر وہ بڑی لجاجت سے کہتیں "پلیز کونے میں بیٹھ جائیے" میں تنگ آکر ہتھیار ڈال دیتی۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنے احکام بھول کر مجھے سیڑھیوں پہ بے کار بیٹھا دیکھ کر آگ بگولا ہو جاتیں۔

"آپ گیم میں حصہ کیوں نہیں لیتے۔ بس ہر وقت کھلی بیٹھے رہتے"

"میں انہیں قطعی یاد نہ دلاتی کہ انہوں نے خود سزا دے کر بٹھایا ہے اور فوراً کھیل میں شریک ہو جاتی۔

ایک دن خالی پیریڈ میں وہ اپنی کلاس کی لڑکیوں کو ہنکاتی لے جا رہی تھیں میرا بھی خالی پیریڈ تھا۔

"چلیئے یہاں کیوں بیٹھے ہیں؟ چلیئے ایک دم"

"مگر ——!" میں نے کہنا چاہا۔

"چلیئے ——!" وہ بہت سختی سے بولیں اور قریب قریب دھکیلتی ہوئی آٹھویں کلاس میں لے گئیں۔

"مس رام پلیز ——!" میں نے جیسے ہی منہ کھولا وہ دھاڑیں۔

"سائیلینس ...... اپنی سیٹ پر، اپنی سیٹ پر چلیئے۔ پلیز ایک دم سائیلینس"

لڑکیاں دوپٹوں میں منہ چھپا چھپا کر ہنس رہی تھیں۔ جس کی سیٹ پر میں بٹھا دی گئی تھی۔ وہ عجب چکر میں تھی۔ اور بوکھلائی چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ انہوں نے اسے میرے پاس کھڑا دیکھ کر ڈانٹا اُسی لڑکی کو۔

کلاس میں بات نہیں، خالی پیریڈ میں دوستی چلاؤ۔ گیٹ آؤٹ پلیز۔"

"مگر مس رام ......"

"پلیز گیٹ آؤٹ ...... گولڈ لیور کلاس، بیٹھیے بیٹھیے - پلیز
سٹ ڈاؤن" وہ بیٹھی ہوئی لڑکیوں کو ڈانٹ کر بلیک بورڈ کی طرف متوجہ ہو
گئیں۔ وہ لڑکی منہ موڑ کر رونے لگی۔ نئی نئی داخل ہوئی تھی۔
خاتون آپا کی عادت تھی دبے پیر بلی کی طرح کلاس روم میں کھڑی ہو جاتیں
اور لڑکیاں اٹھنے لگیں تو فوراً بٹھا دیتیں۔ ایک دم جاتے جاتے مجھے دیکھ کر
بھونچکی رہ گئیں۔

"یو ...... او ہاٹ آر یو ڈوئنگ ان دِس کلاس"

"میں ..... وہ ......"

"کم ٹو مائی آفس پلیز"

میں مس رام سے اجازت لے کر بھاگی۔ انہوں نے بھی خاتون آپا
کو حکم دیتے سن لیا تھا۔ وہ اس نئی لڑکی کو ڈانٹنے لگیں جو کھڑی بسور رہی تھی۔
میں نے تفصیل بتائی تو خاتون آپا نے کہا۔

"بکو مت —"

"قسم خدا کی آپ آٹھویں کی لڑکیوں سے پوچھ لیجیے۔ مس رام زبردستی
پکڑ کر لے گئیں"

پھر خاتون آپا ہنسنے لگیں۔
"مس رام کب سے پڑھا رہی ہیں۔ تھک گئی ہیں، کہتی ہوں چھٹی لے تو بگڑ
جاتی ہیں"

مس رام کبھی کافی حسین ہوں گی۔ بے حد سبک نقشہ، صاف بے داغ رنگ
کافی سفید ہوتے ہوئے گھونگر والے بال مجھے کرید لگ گئی۔ کسی استاد کے
بارے میں اُلٹے سیدھے سوالوں کے جواب نہایت خشک ہوتے ہیں۔ مگر
رشیدہ عبداللہ سے دنیا کی کسی بات پر روکھا جواب نہیں ملتا تھا۔

مس رام ایک انگریز کے دامِ محبت میں گرفتار ہو گئی تھیں۔ وہ پولیس میں
تھا۔ اور اس کی منگیتر ولایت ہی میں تھی، مس رام اس وقت بے حد حسین تھیں۔
ان کی نانی پرنانی ہندوستانی تھیں۔ تو قاعدہ سے وہ اینگلو انڈین ہوئیں۔ ان کی شادی
اس پولیس والے سے نہ ہو سکی۔ اور وہ محکمہ تعلیم میں غرق ہو گئیں۔ جب علی گڑھ
آئی تھیں تو بے حد خوبصورت تھیں۔ کئی پروفیسروں نے ڈورے ڈالے مگر یہ
بالکل تارک الدنیا ہو گئیں۔ ارتھ میٹک میں بڑی دماغ پاشی کی ضرورت ہوتی ہے
عموماً اس مضمون میں اس قابلیت کی ایسی ٹیچر نہیں ملتیں۔
اختر اور جمیلہ ساتویں کلاس میں تھیں ڈے اس کالر تھیں۔ گھر سے مزے مزے
کے کھانے پکوا کر خوب ہماری دعوتیں کرتیں۔ نیّر میٹرک تیاری کر رہی تھی اور بہت
کم جاتی تھی۔ مگر۔ میں کبھی مہینہ دو مہینہ میں عثمان ولا چلی جاتی تھی۔ عشرت میٹرک کے
بعد بمبئی سینٹ زیویر میں داخل ہو گئے تھے۔

جسیم بھائی کو اختر کی طرف سے انکار ہوا تو وہ ایسے دل شکستہ ہوئے
تھے کہ ابا نے انہیں انجینئرنگ کے لئے انگلینڈ بھیج دیا تھا۔ انکار اس وجہ سے
ہوا تھا کہ داؤد بیگ باوا یعنی رفیع الدین بیگ کے بھتیجے بمبئی فلموں میں بہت
دولت کما رہے تھے۔ باوا اختر کی شادی ان سے کرنا ہی چاہتے تھے۔ وہ جو
اتنے ٹھاٹ باٹ سے لوٹے تو فوراً منگنی کر دی گئی۔ اور جسیم بھائی کو انکار کر
دیا گیا۔

اختر نے مجھے انگوٹھی اور بہت قیمتی گھڑی دکھائی۔ مجھے اس کی منگنی سے
بہت خوشی ہوئی۔ شمیم ٹھیک ہی کہتے تھے فلم لائین میں ڈگریوں کی نہیں فن کی قدر
ہوتی ہے۔ داؤد بیگ حسین تھے جوان تھے اور بے حد کامیاب۔ میں نے اس
وقت تک صرف ایک فلم دیکھی تھی سلوچنا اور بلی موریہ کی۔ فلم لائن سے دور کا

بھی واسطہ نہ تھا۔ بس شمیم کو کچھ فلمی ستاروں کے نام سے واقفیت تھی اور شمیم پھکڑ تھے۔ انہوں نے ایک سال امتحان نہیں دیا۔ سوجبت اور جودھپور میں مڑگشت کرتے رہے جنوالو سے نینی تال اور پھر بھوالی سینی ٹوریم چلے گئے ان کی بیماری گرفت میں آگئی تھی اور وزن بڑھ رہا تھا۔ مگر ابھی انہیں اور رہنا تھا۔

میں خاتون آپا کے آفس کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ جڑوانے کے لئے آدھ گھنٹہ پہلے جا کر کھول دیتی تھی۔ ممتاز آپا اسی طرح رعب گانٹھتی تھیں مگر خاتون آپا بڑی بے تکلفی سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی تھیں۔ میں ڈیبیٹنگ سوسائٹی کی صدر بھی تھی۔ اور ویسے بھی بورڈنگ کی ہر میٹنگ میں پرجوش حصہ لیتی تھی۔ کھانا بورڈنگ کا ہونا ہی خراب اور بدمزہ ہے۔ دراصل ایک ہی مزے کا کھانا روز پکتا ہے تو دل لوٹا جاتا ہے۔ ایک دن روٹیوں میں مکھیاں چپکی ہوئی نکلیں۔ بس لڑکیوں نے ڈائننگ روم چھوڑ دیا اور ہنگامہ ہو گیا۔ لڑکیوں نے بھوک ہڑتال کر دی۔ کامن روم میں میٹنگ ہوئی کافی جوش آگیا۔ اور اگلی پچھلی ساری بلائیں یاد کر کے ماتم پڑ گیا۔ رات کو بھی کسی نے کھانے کو ہاتھ نہ لگایا۔ چوری چوری باہر سے مونگ پھلی اور چنے چھوٹی بچیوں کو کھلا کے پانی پلا دیا۔ خاتون آپا مع کچھ ٹیچروں کے سمجھانے آئیں۔ مگر ہم نے فوراً نماز کے کمرے میں جا کر مغرب کی نماز کے بعد نفلیں پڑھنا شروع کر دیں۔ یہ ترکیب خاکسار نے نکالی تھی اور نہایت کامیاب رہی ویسے اختر جمیلہ کو پتہ چل گیا تھا۔ اور وہ چھ سات ڈاگ بسکٹ کے بنڈل اور اچار چیکے سے کپڑوں میں لپیٹ کے دے گئی تھیں۔ ایک نہایت مرغن کھانوں کا بڑا سا کٹورا دلن زہرو سیٹ کھسکالائی تھیں۔ جو تبرک کی طرح کمروں کمروں بانٹا گیا مگر ادپر والوں کا دانہ پانی حرام تھا کہ بچیاں بھوکی ہیں۔ ویسے بچیاں کچھ نہ کچھ دبا کے ڈبوں اور تھیلیوں میں رکھتی ہی تھیں وہ نکل پڑا لیکن غنیم بے خبر تھا۔ اس کے علاوہ کچی کیریاں جھول رہی

تھیں۔ نیچے بھی گرتی تھیں، وہ چھوٹی بچیاں بٹور بٹور کر لا رہی تھیں منہ کا مزہ بدل رہا تھا عیش ہو رہے تھے۔

رات کو ہم نے سونے کی گھنٹی کا بھی بائیکاٹ کیا اور ٹینس کورٹ پر دریاں بچھا کر خوب زور زور سے قوالیاں گائیں۔ بی بی مینڈک کی دھن پر ایک ہجو پورے اسٹاف پر لکھی جسے گا گا کر لوٹ ہو گئے۔ کھانا میز پر لگتا۔ گھنٹی بجتی اور پلیٹوں میں چوہے فٹ بال کھیلتے مگر ہم ڈٹے ہوئے تھے۔

پھر منتظمین کا وفد آیا۔ اور لڑکیوں نے مجھے ٹھو کے مار مار کر آگے دھکیلا حالانکہ میں بھی برابر کی گناہ گار تھی لیکن سب کا غصہ مجھ پر ہی اترا۔

"ہم یہ غلیظ کھانا کھانے سے موت کو ترجیح دیتے ہیں"۔ ڈرامائی انداز میں فرمایا۔

"کھانا اچھا خاصہ ہوتا ہے"۔ ممتاز آپا بولیں۔

"آپ کھاتی کتنا ہیں"۔ میں نے ان کے دبلے پن پر چوٹ کی۔ وہ مجھ سے کافی عاجز تھیں۔ سلگ کر رہ گئیں۔

"اور پھر آپ کے ہاں تو اچار چٹنی، مکھن، دودھ، ملائی، انڈے"۔

"پھل میوے مٹھائی پڑی سڑا کرتی ہیں"۔ لڑکیوں کی ہمت بڑھ گئی۔ وفد نہایت غصے سے واپس لوٹ گیا۔

کوئی چار بجے اعلابی کاسنی غرارہ، سفید چکن کا کرتا اور سفید چنا ہوا دوپٹہ اوڑھے جیسے ہوا پر تیرتی چلی آ رہی ہیں آتے ہی پکارا۔

"اے لڑکیو! اے کہاں مر گئیں" ان کی آواز سنتے ہی چند لڑکیاں تو ٹسر ٹسر رونے لگیں اور کمروں میں جا چھپیں چھوٹی ٹیچیاں بے ساختہ دوڑ کر انہیں گھیر کر کھڑی ہو گئیں۔ ان بچیوں کو ہم لوگ "چوزے" کہا کرتے تھے۔ "چوزوں" کا غول لئے وہ ہماری طرف آئیں۔

"کیوں ری کچی کیری بھکس رہی ہے۔ گلا آئے گا تو مرے گی۔" انہوں نے حمیدہ کے ہاتھ پر تھپڑ مار کر کیری گرا دی حمیدہ نیم کے پیڑ سے لپٹ کر رونے لگی ـــ

"ارے کھڑی میرا منھ کیا دیکھ رہی ہو۔ چلو میرے ساتھ۔"

دم بھر میں گودام کھلا جھپلا جھپ پوریوں کا آٹا گندھا، کچھ لڑکیاں آلو چھیلنے لگیں۔

ایک ہلچل مچ گئی۔

"اے ہے چٹنی، لڑکیوں چٹنی بغیر پوریوں کا خاک مزہ آئے گا۔" اعلابی بولیں۔

ایک جھنڈ کیریوں پر ٹوٹ پڑا۔ آدھی کھائیں آدھی کی بھر بھگونا چٹنی پیسی۔ اعلابی پوریاں تلنے بیٹھ گئیں۔ جتنے چھلکے، صاف پڑے ملے بیلنوں اور خالی بوتلوں سے پوریاں آڑی ترچھی تکونی بیلی جانے لگیں۔

ایک بچی اپنی سلیٹ پر بیل رہی تھی۔

بیان نہیں کر سکتی اس دن کیا لطف آیا ہے۔

"اے دلیوا نیو میٹھا!" اعلابی چلائیں۔ اور سب سناٹے میں رہ گئے۔

"حامد میاں کی منگنی کے لڈو لڑکیوں کے حصے کے اماں نے بھیجے ہیں۔" اچھن آپا چھوکرے کے سر پر ٹوکرا رکھوائے داخل ہوئیں۔ پیچھے پیچھے برقعہ سنبھالے ہانپتی کانپتی ان کی اماں پالی خالہ۔

"اہو تو یہ ٹھاٹ ہیں"۔ شلوار قمیض بغیر دوپٹہ کے کٹے ہوئے بال اڑاتی رشیدہ آپا پھٹ پڑیں لڑکیاں کائیں کائیں کرتی ان سے لپٹ پڑیں۔

چٹائیاں بچھیں، ٹاٹ کے ٹکڑے گھسیٹ کر لائے گئے رکابیاں سینیاں لگیں غرض جس برتن میں موقع مل گیا جُٹ گیا۔ اُف کتنا کھایا۔ نمکین پھر چٹنی! پھر میٹھا بڑی دیر میں نظر آئیں کچھ اجنبی سی غیر غیر سی ایک طرف خاتون آپا کھڑی دھیمے

دھیمے مسکرا رہی تھیں۔

"اے ہے کوئی دولہا میاں کو تو بلاؤ۔" وہ شیخ عبداللہ کو دولہا میاں کہتی تھیں اور جیسے کسی نے علادین کا لیمپ گھسا، شاہد نے ٹاٹ کا پردہ اٹھایا۔ پاپا میاں ذرا جھک کر داخل ہوئے۔ تالیوں کے شور میں وہ کڑھائی سے تھوڑی دور ایک کرسی پر بیٹھا دیئے گئے۔

کھانے کے بعد کرسیوں پر اسٹاف، پاپا اور اعلابی بیٹھے۔

"بچیو! ایک دن یہ سارا لمبا چوڑا میدان"۔ انہوں نے چھڑی گھما کر کہا۔ "ایک جنگل تھا۔ یہاں سیار گیدڑ چلاتے تھے۔ سانپ پھنکارتے تھے میں منڈیر پر کھڑا ایک گلزار کے خواب دیکھا کرتا تھا، آج اس جنگل میں پھول کھلے ہیں"۔ کالی کلوٹی لڑکیوں تک کے چہرے گلنار ہو گئے۔ دو چار مجرم آنسو بہانے لگیں۔"

"تمہی اس کالج کی آن بان ہو۔ تم سے اس حقیر زمین کے ٹکڑے پر ایک درسگاہ قائم ہے۔ میری دُعا ہے کہ زندگی میں تم بھی کوئی حسین خواب دیکھو اور وہ حقیقت بن جائے۔"

تالیوں کا شور کم ہوا تو خاتون آپا بولیں۔

"پاپا کی رائے ہے کہ بورڈنگ کی چار ذمہ دار لڑکیاں ایک ایک ماہ کھانے کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیں۔ دوسرے مہینہ دوسری چار لڑکیوں کا گروپ ذمہ داری لے"

"ہم تیار ہیں" بہت سی لڑکیاں چلائیں۔ میں چپ رہی مگر سب کی نظریں مجھ پر گڑی تھیں۔

"مہینے کے شروع ہونے سے پہلے تمہیں تمام جنس گیہوں دالیں گھی تیل، مٹی کا تیل، وغیرہ کا بجٹ تیار کرکے"! کچھ مس جرمی نے کان میں کہا۔ "ہاں صبح کا ناشتہ اور شام کی چائے پر بسکٹ۔"

"مر گئے" میں نے گھٹی آواز میں کہا۔

وہ اور تفصیلیں سناتی رہیں مگر میرا دماغ نہ جانے کہاں قلانچیں بھر رہا تھا۔

"کیوں؟ آپ کی کیا رائے ہے" ممتاز آپا نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

"میری!" میں چونک پڑی۔

"ہاں میرے خیال میں پہلے بیچ میں عصمت کو ہی ذمہ داری سونپی جائے"

"ذمہ داری اور میں!" میں نے سوچا۔

"اس طرح لڑکیوں کو گھرداری کا بھی سلیقہ آئے گا"

"گھرداری!" مجھے چکر آ گیا "غریب ہوا تو کھچڑی پکالیں گے، امیر ہوا باورچی رکھے گا۔ مجھے اپنے ہی الفاظ یاد آئے"

"عصمت! پلیز اسٹیڈ اپ اینڈ آنسر!" خانون آپا نرمی سے بولیں۔ میں کھڑی ہو گئی۔

"میں تو بہت پھوہڑ ہوں" میں نے جیسے فخریہ کہا۔

"تب تو تم دوسرے تیسرے بیچ میں بھی شامل رہنا۔ پہلے بیچ میں نصیر"

"پلیز! میرا فائنل ایئر ہے" نصیر منمنائی۔

"تو محمودہ۔ مسعودہ۔ عصمت اور سلطانہ"

"پلیز عصمت کو ہمارے بیچ میں مت رکھیئے یہ بڑی گڑبڑ مچائیں گی۔ کچھ کریں گی نہ کرنے دیں گی" محمودہ بے انتہا خوبصورت تھی، تمام لڑکیاں اس پہ مرتی تھیں مگر مجھ سے جھگڑا تھا۔ ایک نازک سی بات پر۔

"ارے واہ خواہ مخواہ ہی جھوٹے الزام لگا رہی ہو" میں نے اسے ڈانٹا۔

نصیر آپا سے پوچھ لیجیئے، ایک منٹ تو میری ان سے بنتی نہیں۔ ہر وقت بدتمیزی کی باتیں کرتی ہیں" سب لڑکیاں کھی کھی ہنسنے لگیں۔

تم نے ہم سے تو کبھی شکایت نہیں کی۔ نیا دکیا ہے جھگڑے کی" انہوں نے لڑکیوں کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ لڑکیاں بے تحاشہ ہنستی رہیں، محمودہ چُپ!

"عصمت محمودہ کل وقفہ میں دفتر آؤ" محمودہ رو پڑیں۔ میں نہایت معصوم شکل بنائے رہی۔

"اور سوچ سمجھ کر ہمیں اپنی رائے سے مطلع کرو کہ کھانے کے بارے میں جو آئے دن شکائتیں پیدا ہوتی ہیں ان کے بارے میں کیا کرنا چاہیئے۔ بے دھڑنے اور اسٹرائیک سے پہلے سوچ بچار کر کے اپنی شکائتیں دفتر میں پیش کرو"

اعلانی اور پاپا میاں سب کو دعائیں دیتے چلے گئے۔

"عصمت، محمودہ ہمارے ساتھ عبداللہ لاج تک چلو، ملازم واپس پہنچا جائے گا" خانون آپا بڑی فکرمند تھیں، ان کا چہرہ بے حد سفید تھا اور ماتھے پہ شکنیں۔ تھوڑی دور تک ہم چلتے رہے۔

"اب بتاؤ کیا قصہ ہے محمودہ" محمودہ نے سر جھکا لیا۔

"عصمت تم ہی بتاؤ"

"خانون آپا مجھے تو محمودہ سے کوئی شکایت نہیں"

"پھر بھی تمہیں معلوم تو ہو گا انہیں تمہاری کون سی بات ناگوار گزری"

"خانون آپا دن میں نہ جانے کتنی باتیں لڑکیوں کو ناگوار گزرتی ہوں گی"

"تم بہت بدتمیز ہو"

میں نے اقرار میں شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا۔

"لڑکیوں کو بہت ستاتی ہو"

"آپ سے کس نے شکایت کی میری۔ اور پھر آپ نے مجھے سزا کیوں نہ دی؟"

«تم بہت محبت کرتی ہو۔» وہ غصہ ہو گئیں۔

«سوری خاتون آپا - میری تو ساری لڑکیوں سے دوستی ہے۔ بچیاں تک مجھے
گھیر کر کہانیاں سنتی ہیں۔ کوئی گھر کی یاد میں بے چین ہوتی ہے تو میرے پاس آتی ہے
مجھے سب لڑکیاں پیاری لگتی ہیں مجھے اس اسکول سے بے پناہ محبت ہے
میرا کوئی استاد مجھ سے ناراض نہیں - میں نے آج تک کسی سے گستاخی نہیں
کی ہے۔»

«تم مُنتی کے بارے میں کچھ بکواس کی ہے» ممتاز آپا کو وہ مُنتی کہتی تھیں۔

«شاہدہ خورشید چڑیلوں نے شکایت جڑی ہوگی۔ چور کہیں کی»

"نہیں شکایت نہیں کی، مگر تم ایسی الٹی سیدھی باتیں کرتی ہو"

«کیا ممتاز آپا بہت خفا ہیں۔ خورشید بہت ذلیل ہے۔»

"نہیں اگر تمہاری استاد ہیں۔ ان کے بارے میں تم کیا بکواس کرتی ہو۔"

"خاتون آپا، ہم سب لڑکیاں پیٹھ پیچھے ٹیچروں کے بارے میں الٹی سیدھی
باتیں کرتے ہیں مگر ہم جاکے ان کی رپورٹ تو نہیں کر دیتے، خورشید جھوٹی ہے"

«نہیں تم خورشید سے نہ کچھ کہنا۔ ہم نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ کسی کو نہیں
بتائیں گے۔ اور پھر بات پھیلے گی۔ مگر تم ایسی دیوانی باتیں کیوں کرتی ہو؟»

وہ دیوانی بات یہ تھی کہ ایک دن ممتاز آپا نے مجھے ہسٹری کی کاپی کھو دینے
پر ڈانٹا، بعد میں وہ کاپی انہیں مس جرمی کے کمرے میں مل گئی۔ وہ وہاں کاپیاں لے
کر گئی تھیں ایک کاپی چھوٹ گئی تھی۔ مس جرمی نے براہ راست مجھے دے دی
کاپی کھوتے پر ممتاز آپا نے مجھے کلاس سے نکال دیا تھا۔ میرا بہت جی جلا میں نے
کہا۔

«ٹھہر جاؤ میں بھی ممتاز آپا کے سسر سے شادی کر کے انہیں وہ مزہ

چکھاؤں گی کہ یاد ہی کریں گی۔»

خورشید خوب ہنسی تھی۔ کیا لاجواب ترکیب ہے انتقام لینے کی۔

«اچھا محمودہ، تمہاری شکایت!»

"یہ نہیں بتاتی تو میں بتائے دیتی ہوں، خاتون آپا خدا کی قسم میری نیت میں کھوٹ
نہ تھا۔ محمودہ بہت خوبصورت ہے۔ میں نے کہا محمودہ میں اپنے بیٹے سے
تمہاری بیٹی کی شادی کروں گی۔ خاتون آپا کیا لڑکیاں آپس میں ایسے رومینٹک وعدے
نہیں کرتیں۔»

«کرتی تو ہیں»

«تو میں نے کون سا اتنا بڑا جرم کیا۔ یہ بولی میں تو اپنی لڑکی کی شادی ہرگز تمہارے
لڑکے سے نہیں کروں گی۔ میں نے کہا میں زبردستی تمہاری لڑکی بھگوا لوں گی۔ اس
پر سب لڑکیاں ہنسنے لگیں تو یہ بھوں بھوں رونے لگیں۔ بیوقوف کہیں کی۔»

خاتون آپا ہنسنے لگیں تو محمودہ بھی ہنسنے لگی۔

«محمودہ تم بے فکر رہو، اگر خدا نہ کرے تمہاری لڑکی کا دل میرے بیٹے پر
آ گیا تو میں اس کا گلا گھونٹ دوں گی۔ میرا مطلب ہے اپنے بیٹے کا۔ بس اب
تو تم خوش؟»

"کیا تم لوگ بچوں جیسی باتوں پر لڑ بیٹھتی ہو"

ابھی دو سال ہوئے پاکستان میں محمودہ سے ملاقات ہوئی۔ اس کی چاند سی
بیٹی بھی ساتھ تھی میں نے اس سے کہا بیٹی جان، میرے کوئی بیٹا نہیں ورنہ قسم سے
میں ساری سرحدیں توڑ تاڑ کے تمہیں اُٹھوا لیتی" محمودہ کی بیٹی میرے سینے سے
لگ گئی۔

کتنی حسین و دلچسپ تھی کالج کی زندگی۔ ایک ایک بات دل پر نقش ہے

ہنسی مذاق ہی نہیں - وہ وقت جو اعلابی کے ساتھ گزرتا۔ جو پاپا میاں کے قدموں میں بیٹھ کر بتایا۔

خاندان کے بزرگوں سے مجھے اپنے سوالوں کے جواب کبھی نہیں ملے میرے ہر سوال پر ناراضگی اور ناپسندیدگی کا اظہار ہوتا۔ اماں سے بات کرتے ڈر لگتا تھا- وہ مجھ سے ہر وقت نالاں رہتی تھی۔ میں نیک اور سمجھدار لڑکی نہیں تھی۔ گھر گرہستی سے مجھے دلچسپی نہیں تھی۔ میری تینوں بہنیں سلائی، بنائی اور پکوان میں ماہر تھیں بڑی کامیاب بیویاں ثابت ہوئی تھیں۔ آپا بیوہ ہوگئی تھیں۔ مگر زندگی کے چند پُر بہار سال اور تین ہونہار ذہین بچے ان کے مثالی مشرقی عورت ہونے کا ثبوت تھے ۔ اماں نے گھر کا سارا انتظام سونپ دیا تھا۔ اور بڑی خوبصورتی اور سگھڑاپے سے گھر کا انتظام کرتی تھیں۔ علی گڑھ میں خواجہ فیملی کے سگھڑاپے اور ٹھاٹ باٹ سے بے حد مرعوب تھیں۔ آپا بالکل مشین بن گئی تھیں۔ صبح اٹھ کر نماز اور تلاوت قرآن کے بعد وہ کھانے کی طرف توجہ دیتیں۔ پھر بڑے چوکے پر سلائی کی مشین اور کپڑوں کے گٹھر کھول کر بیٹھ جاتیں۔ جب تک چھوٹی آپا کی شادی نہیں ہوئی تھی وہ بھی ان کا ساتھ دیتیں۔ اماں ایک مخصوص کونے میں بیٹھی چھالیا کترا کرتی رہتیں۔ وہ بالکل ریٹائر ہوگئی تھیں، اور ہر طرف آپا کا حکم چلتا۔ اور ہم چھوٹوں کی حیثیت محکوم جیسی تھی۔ چونکہ میں سلائی اور پکوان میں دلچسپی نہیں لیتی تھی لہٰذا راندۂ درگاہ تھی۔ پوری کوشش یہی رہتی تھی کہ ان کے سامنے سے دور رہوں ۔

تو بھلا اپنے سوالوں کے جواب کس منہ سے مانگتی۔

اعلابی دوستوں جیسا برتاؤ کرتی تھیں۔ ان کی باتوں میں کہانی قصوں جیسا چٹخارہ تھا۔ اسکول کے قیام میں کیا کیا لعنتیں اور بدنامیاں سہیں۔ ان کا خاندان بڑا روشن خیال تھا۔ شادی سے پہلے ہی انہوں نے لڑکیوں کا اسکول کھولنے کے خواب دیکھنے

شروع کر دیئے تھے۔ نوکروں کی بچیوں کو جمع کر کے قرآن اور اردو کے ساتھ تھوڑا بہت حساب بھی سکھاتیں۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مسلمانوں میں بڑی شدت سے احساس پیدا ہو رہا تھا کہ وہ دوسرے فرقوں سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ خاص طور پر عورتوں کے معاملے میں تو بہت ہی جہالت کا زور ہے۔

اعلابی نے جو میکے میں اسکول سا شروع کیا تھا وہ گھر کے نوکروں کے علاوہ محلہ کے بچوں تک پھیل گیا تھا۔ شادی کے بعد یہ اسکول خاک میں مل جائے گا۔ پاپا میاں تو بچپن سے ہندوستانی عورت کی زبوں حالی سے متاثر تھے۔ وہ جموں کے ایک برہمن خاندان کے بیٹے تھے، بچپن سے ہی بے انتہا حساس تھے۔ محلہ میں کوئی مرد اپنی بیوی کو روزانہ رات کو شراب پی کر مارا کرتا تھا۔ اس کی چیخیں پاپا کی نیند حرام کر دیتیں۔ جب اس کے پٹنے اور چلانے کا وقت آتا تو پاپا بے چین کروٹیں بدلتے جس دن اس کے رونے چلانے کی آواز نہ آتی۔ وہ کان لگائے ان چیخوں کے انتظار میں جاگتے رہتے پٹنے والی عورت کا سارا کرب پاپا کے دل میں سما گیا تھا۔

انہوں نے اپنی ذہانت سے تن تنہا تعلیم حاصل کی اور ایک مقام پیدا کیا۔

"سہاگ رات" اعلابی کہتی تھیں، نہ جانے کیوں میرے آنسو بہہ رہے تھے۔ زندگی کے اتنے عظیم موڑ پر جی کانپ رہا تھا۔ وہ اجنبی جو اتنا قریب آنے والا تھا کیسا ثابت ہوگا؟

مگر وہ اجنبی اُن کے اپنے خوابوں کا شہزادہ ثابت ہوا۔ اس کے سر میں تعلیم نسواں کا سودا بھرا تھا ایسے میل شاذ ہی ہوتے ہیں۔

"میں نے سُنا ہے تجھے شادی سے چڑ ہے لڑکی" اپنی سناتے سناتے ایک دم اعلابی نے بات پلٹی۔

اعلانیہ کسی انسان کے حکم کا تابع بننا، مجھ سے نہیں جھیلا جائے گا۔ میں نے زندگی بزرگوں کے جبر کے خلاف احتجاج کر کے گزاری ہے مجھے اپنی راہ آپ بنانی ہے مجھے تپنی ورنہ مشرقی سگھڑ بیوی بننے کے خیال سے ہی گھن آتی ہے۔"

"اے ہے وہ کیوں"

"سب کا خیال ہے کہ میں کچھ پاگل ہوں۔"

"اللہ خیر!"

"مگر میں اپنے پاگل پن میں بھی اپنے دکھ سکھ انعام و سزا کی خود ذمہ دار بننا چاہتی ہوں۔"

"اگر کوئی تیرا جیسا سر پھرا مل گیا تو؟"

"جیسا آپ کو ملا۔"

"ہاں، میں تو سوچ بھی نہیں سکتی کہ تیرے پاپا کے علاوہ کوئی مجھے سمجھ سکتا تھا۔"

"لوگ کہتے ہیں آپ نے اپنے گھر اور بچوں کو نظر انداز کیا۔ آپ کی بہنوں نے بچے پال لیے۔"

"اے ہے تو تمہاری خواجہ فیملی میں کون بچے پالتا ہے آپا دادا یا دادی یا نانی خالہ پھوپھی، ہمارے یہاں مائیں بچوں کو خاک پالتی ہیں۔ پہلا بچہ دادی کا اور دوسرا نانی کا، پھر خالہ پھوپھی کا۔ اور جتنے بچے آتی آیائیں ہیں کہ نہیں۔ رہا۔ کھانا پکانا تو باورچی موجود ہیں۔"

"بیگم اماں روز کچھ نہ کچھ اپنے ہاتھ سے ضرور پکاتی ہیں۔"

"ارے وہ تو جی بہلاوے کے لئے، کوئی چٹپٹی مصالحہ دار چیز، میاں پپیسری کھاتے ہیں نا۔ اور سلائی بھی مثلاً کرتی ہیں۔ اب تو درزی بھی زنانے کپڑے سینے لگے ہیں۔"

"ویسے میں اپنے کپڑے سی لیتی ہوں۔"

"اے بس کافی ہے۔ یہ دیکھو میں محسن کا کرتا ترپ رہی ہوں۔ اصل میں یہ گھرداری اور سگھڑاپے کا خواہ مخواہ جھنجھٹ کھڑا کر دیا گیا ہے۔"

"آپ پاپا کے بٹن ٹانکتی ہیں۔"

"اے وہ بٹن تو دھوبی ٹانکتا ہے۔ اُسے چار پیسے مل جاتے ہیں۔ اُس کی لونڈیا رام دلی چوتھی میں پڑھ رہی ہے۔ میں نے کہہ دیا ہے مڈل سے پہلے گونا کیا تو نکال دوں گی۔ کہتا ہے اس کی ساس اندھی ہے۔ اور جیٹھانی برتن کا چھنتی ہیں۔ میں نے کہہ دیا تب تو میٹرک کے بعد ہی رخصت ہو گی۔ موئے نے چھ برس کی تھی تب ہی شادی کر دی تھی۔ سنا ہے لڑکا موٹر سائیکل مانگتا ہے، کالج کا دھوبی ہے کھاتا پیتا آدمی ہے۔ داماد کو تمہارے پاپا نے رکھوا دیا ہے۔ میں نے کہہ دیا۔ اگر موٹر سائیکل مانگی تو نوکری سمجھو گئی۔ مانگ کے تو دیکھے۔ ہاں سائیکل میں دلا دوں گی۔"

"سُنا ہے رتی رام بہو کو مارتا ہے۔"

"کچھ ایسا مارتا ہے۔ حرام خور چھدا کی بہو بیٹے کو بھڑکاتی ہے۔ میں نے ساس اور بیٹے کو بلایا ہے۔ بس آتے ہی ہوں گے۔"

اتنے میں بالو دھوبی آ گیا۔ بالو لمبا سجیلا، سانولا سا نوجوان، نہایت صاف قمیض اور تپلون ڈالے بالکل کالج کا اسٹوڈنٹ لگتا تھا۔ سائیکل پر نئی دلہن کو بٹھا کر سنیما دیکھنے جاتا تھا بڑھیا ساس جل جل کر مرنڈا ہوتی، بقول بھلی بیٹیوں کے عبداللہ فیملی نے علی گڑھ کے نوکروں کے دماغ آسمان پر چڑھا دیئے تھے۔ کالج کے نوکر تو ایسے اکڑتے تھے جیسے لاٹ صاحب کے بچے ہوں۔ بیگم عبداللہ نے تو جیسے علی گڑھ کے سارے نوکروں کا ٹھیکہ لے لیا ہے۔ ذرا ڈانٹو مارو

ان کے پاس رد تا جاتا ہے، اور وہ اُسے یا تو کالج میں نوکری دے دیتی ہیں یا یونیورسٹی میں کھپا دیتی ہیں۔ صرف وہ نوکر جمے رہتے ہیں جو بزاز سے ڈسکاؤنٹ وصول کرتے ہیں، ترکاری والوں سے، سودے والوں سے کمیشن لیتے ہیں۔ آم کے موسم میں مُفت آم، درزی سے مفت بچوں کے کپڑے سلواتے ہیں۔ ورنہ کوٹھی کے پھاٹک میں بھی داخل نہیں ہونے دیتے۔

موٹر میں شہر خریداری کے لئے جاتی ہیں۔ تو ہر دکاندار سے ڈرائیور کا یارانہ کیوں نہ وہ گالیاں کھالیں۔ سب جانتے ہیں نوکر چور ہوتے ہیں جو پکڑا نہ جائے وہ ساہوکار۔

" بی بی پتلون کے بٹن اور چاہئیں، محسن بھائی کے بٹن بہت ٹوٹتے ہیں۔"

اعلیٰ بی نے بٹنوں کا پتہ دے دیا۔

جب وہ چلا گیا تو بولیں۔

" بڑا چور ہے مگر پکڑنا مشکل ہے۔"

" کیا چُراتا ہے۔"

" چادریں، تکئے کے غلاف، چُراتا نہیں۔ بس خود استعمال کرتا ہے۔ نئے کی جگہ پُرانے پکڑا دیتا ہے۔ لڑکیاں دیوانی خاک سمجھیں، جب پھر نئے سال نئے کپڑے لاتی ہیں، یہ پُرانے دے دیتا ہے۔ نئے خود استعمال کرتا ہے۔ مگر نامراد کو پکڑوں کیسے؟"

اور مجھے یاد آیا، گھر سے چھ چادریں لاتے ہیں واپسی میں بس چیتھڑے لے جاتے ہیں۔

" بڑا چالباز ہے۔ پکڑا نہیں جاتا۔"

" اے بیٹی کس کس کو پکڑو یہ موئے ہوڑے رعانہ بد دشش ہرجن (چوڑا) پر ہی گزر بسر کرتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی چوریاں کرتے ہیں۔"

اور مجھے یاد آیا کہ حسیم بھائی باہر سو رہے تھے، تھوڑی سردی میں باہر سونے میں بڑا مزہ آتا ہے۔ ننھے بھائی کی شادی کے بعد صحن کا ایک کونا ان کے لئے وقف ہو گیا تھا۔ لڑکے باہر سونے لگے تھے۔ رات کو کوئی لحاف لے کے بھاگا۔ حسیم بھائی پیچھے لپکے وہ کھیتوں میں غائب ہو گیا۔ واپس لوٹے تو توشک چادر اور تکیہ دوسرا لے کے چمپت۔ ہر کوٹھی میں پہرے دار موجود پھر بھی اُچک ہی لے جاتے تھے۔

اسی لئے ابا رات کے وقت کتے چھوڑ دیتے تھے اور ہمارے پھونس کے بنگلہ میں کبھی چوری نہیں ہوئی۔

رتی رام اس کی ماں اور چھدّا رام اس کا باپ حاضر ہوئے۔

معلوم ہُوا کہ تازہ مار پیٹ کی اصل ذمہ داری بہن یعنی رشیدہ آپا تھیں انہوں نے اپنا گلابی شلوار کا جوڑا بہو کو دے دیا۔ وہ بہت شرمائی سر ہلایا۔ مگر ضد کر کے اسے پہنا ہی دیا۔ خود کمر بند باندھنا سکھایا۔

ساس بھڑک اٹھی " یہ پہراوا ہمارے کیاں نا چلے گو۔"

" کیوں نہ چلے گو؟" اعلابی نے ڈانٹا۔

" برادری کے لوگ کھلی اڑائیں گے جی۔"

" اڑانے دو ---!"

" نا بیگم صاحب یہ نا ہو سکے۔"

" مگر تو نے بہو کو مار لگوائی۔ ہم سے آکے کہا ہوتا۔"

" جے موری بھول بھئے گئی بیگم صاحب، تاؤ چڑھ آیو۔ اور پھر تیرلوں سدمی آئینہ میں مٹک رئی ہی چھنال۔"

"دیکھ مہوری کی دلہن شلوار بھی پہنے گی۔ اور آئینہ میں بھی مٹکے گی۔ اور رتی رام نے ہاتھ بھی لگایا تو ہتھکڑیاں ڈلوا دوں گی۔ سمجھی!"

"جسے بھی کوئی زبردستی ہے بیگم صاحب" بہو بھنائی۔

"چپ رہ کھانگی" چھیدا نے چوڑے ہاتھ کا ایک تھپیڑ بہو کے جڑ دیا۔

"چھیدا کے بچے۔ تو نے پھر بہو کے ہاتھ اٹھایا"

میں جب بھی اعلابی سے ملنے جاتی انہیں نوکروں کے درمیان صلح صفائی کرتے پاتی۔ یہی نہیں پڑوس کے نوکروں کی بیویاں شکایت لے کے آتیں اور اعلابی اُن کے مالکوں کی مدد سے مقدموں کے فیصلے کرتیں۔

ایک زمانے میں علی گڑھ میں نوکروں کی پلٹنیں رہا کرتی تھیں۔ ہر کوٹھی میں شاگرد پیشہ ہوتا تھا۔ ہر کوٹھی کا مہتر دھوبی، چوکیدار، چپراسی، بہشتی، ڈرائیور، خان ساماں اُوپر کے کام کے چھوکروں کے لئے کوٹھریاں تھیں جہاں ان کے خاندان رہتے تھے مغلانیاں، مامائیں، بچوں کی کھلائیاں اور ہر میاں اور بیگم کا پرائیویٹ اوپر کے کام کا چھوکرا۔ گھر کے اندر ہی اسباب کی کوٹھڑی یا نوکروں کے دالان میں رہتے تھے۔

ان ہی دنوں میں ایک طوفان پھٹ پڑا لکھنؤ کے کچھ منچلے نوجوانوں نے ایک کتاب "انگارے" چھاپ ڈالی۔

انگارے اور وہ بھی اردو ــــ یعنی مسلمانوں کی جاگیری زبان میں۔ ایک ہنگامہ مچ گیا۔ اور ایک ملّا شاہد احراری اس کا نام تھا۔ گرلز کالج پر پل پڑا۔ اس نے ایک چیتھڑا سا اخبار نکالا اور عبداللہ فیملی کی دھجیاں اڑانے لگا۔ اس نے کہا گرلز کالج رنڈی خانہ ہے اسے فوراً بند کر دیا جائے۔ اور رشیدہ آپا اور دوسرے لکھنے والوں کے گندے کارٹون نکالے۔

میں نے وہ کتاب نہیں پڑھی تھی، لیکن احراری نے دل میں اس کتاب کو پڑھنے کی لگن پیدا کر دی۔ نہ جانے کہاں سے وہ کتاب بورڈنگ میں کسی ڈے

اسکالر نے لا دی۔ اور راتوں رات لالٹین جلا کر، روشنی نہ دکھائی دے اس لئے شیشوں پر رضائیاں لٹکا کر ہم نے وہ کتاب پڑھی۔

اور ہل گئے۔

مگر پڑھ کر تذبذب میں پڑ گئے۔ عریانیت اور گندگی بہت تلاش کی مگر پلّے نہ پڑی مگر کسی کو یہ کہنے کی ہمت نہ ہوئی کہ "انگارے" گندی نہیں یہ سخت بے حیائی کا ثبوت ہوتا کہ کوئی شریف لڑکی "انگارے" کو گندہ نہ کہے سب میری طرف دیکھنے لگیں حالانکہ میری ہم خیال تھیں لیکن میری طرح بے لگام نہ تھیں۔ اب مجھے معلوم ہو چلا تھا کہ بہت سی باتیں جو یہ دل میں تو مانتی ہیں خوف سے زبان تک نہیں لا پاتیں تو چاہتی ہیں میرے منھ سے سُنیں "کتاب بے انتہا گندی ہے۔ میرے تو ہاتھ سڑ گئے دل سڑ گیا دماغ سڑ گیا۔ چلو نماز کے کمرے میں توبہ کریں۔ اللہ سے معافی مانگیں۔ اللہ کو یہ کتاب بہت ناگوار گزری ہو گی"

"ایسی باتوں کا مذاق نہیں بنانا چاہیئے"

"مذاق کون نامعقول بنا رہا ہے۔ شریف لوگ کہتے ہیں گندی ہے تو جھوٹ تو نہ بولتے ہوں گے"

"ورنان سنس" جمیلہ حامد بولی۔ وہ اعلیٰ خاندان کی کانونٹ کی پڑھی لڑکی تھی۔ بے حد منھ پھٹ دھڑ سے بات کہہ دینے کی عادی۔ ظاہر ہے میری اس کی خوب پٹتی تھی۔

"تو بہ جمیلہ" لڑکیاں چلّائیں۔

"تم نے لیڈی چیٹرلیز لَوَر' پڑھی ہے"

"لائبریری میں ہو گی یونیورسٹی میں!"

"ہرگز نہیں، وہ کتاب بین ہو چکی ہے۔"

"پھر تم نے کہاں پڑھی؟"

"میری ایک کلاس میٹ لورٹیو کانونٹ میں تھی اس نے دی تھی۔"

ہم سب جل کے خاک ہو گئے۔ دیسی اسکولوں کی پڑھی لڑکیاں کانونٹ کی لڑکیوں کے سامنے چت ہو جاتی ہیں۔ سعادت کتنی ذہین تھی یونیورسٹی میں اول آئی تھی، تھوڑے سے دن کانونٹ میں پڑھی تھی لیکن محمودہ عمر، جمیلہ حامد، عذرا حیدر، ۲۔ فلافٹ انگریزی بولتی تھیں کہ ہم سب کی سٹی گم کر دیتی تھیں۔ جمیلہ حامد کی اُردو تو ظاہر ہے کمزور تھی جو ایک خوش نصیبی سمجھی جاتی ہے، بس جمیلہ کا ایک علاج تھا کہ خوب سرپٹ فارسی ملی اردو بولو چڑھ جائے گی۔ بڑا اونچے مچان سے کہے گی۔

"نان سینس! ابھی ذرا ہولے ہولے بولیں۔"

اور کافی لڑکیوں نے ڈرتے ڈرتے فیصلہ کیا کہ کتاب گندی سہی متاثر کرتی ہے اور سچائی سے لبریز ہے۔

میں نے جب تک ایسی گندی کتاب نہیں پڑھی تھی کالجوں، یونیورسٹیوں میں یہ مواد نہیں ملتا۔ مگر زبانی اس سے گندی باتیں پلنگ کے نیچے چھپ کر بڑی بوڑھیوں سے سنی تھیں۔ ہم جنس سے محبت اچھی ہوتی ہے یہ بھید نہیں کھلا تھا۔ چند لڑکیوں کے بارے میں بعض لڑکیاں جملے اڑایا کرتی تھیں۔ کہ کس طرح وہ ایک دوسرے کی دیوانی تھیں، اگر ایک کسی اور سے بات بھی کرے تو طوفان برپا ہو جاتا تھا۔ مگر ان دوستیوں کو نظر انداز کر دینا اور ٹال جانا ہی سنجیدگی اور شرافت کی نشانی سمجھی جاتی تھی۔

"انگارے" پڑھ کر ملّا احراری کا چیتھڑا اڑھا تو جی خوب جلا اور میں نے ایک مضمون لکھا۔

کچھ اس قسم کا کہ "مسلمان لڑکیاں پہلے ہی محروم اور پچھڑی ہوئی ہیں اوپر سے

کٹر ملّا احراری جان کا دشمن ہو رہا ہے۔ کالج بند کر دیا جائے مگر ہم ساری لڑکیوں کی یہاں سے بس لاشیں ہی جائیں گی۔ کون بند کرنے آئے گا۔ ہم اس سے نپٹ لیں گے۔ اور یونیورسٹی میں ہمارے چھ ہزار بھائی ہیں، کیا وہ خاموشی سے ہماری لاشوں کو کچلتا دیکھیں گے۔ جب بھی ہمیں ملّا احراری کا خیال آتا ہے۔ ہم اپنے چھ ہزار بھائیوں، بزرگ پروفیسروں، ٹیچروں کو یاد کر لیتے ہیں تب ہماری ہمتیں بڑھ جاتی ہیں۔ جب تک وہ سلامت ہیں، کوئی مائی کا لال ہمارا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ جھانسی کی رانی نے شہنشاہ ہمایوں کو راکھی بھیجی تھی، ہم کالج کی تمام لڑکیاں اپنے ہزاروں بھائیوں کی خدمت میں نیک خواہشات کے ساتھ احترام اور خلوص کی راکھی بھیجتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ وہ ہماری رکھوالی کے لئے کوئی قدم اٹھائیں گے۔"

میں نے مضمون جو طویل اور جذباتی تھا لڑکیوں کو سنایا، ایک ہلڑ مچ گیا۔ پاپا میاں کو خبر پہنچی وہ آئے اور سنا، اسی وقت لفافہ منگوا کر علی گڑھ گزٹ کو بھیج دیا۔ دوسرے دن مضمون چھپ گیا۔

لڑکوں نے وہ مضمون پڑھا اور اسی رات جا کر ملّا احراری کی خوب ٹھکائی کی، دفتر توڑ پھوڑ ڈالا۔ کسی کو اس کی حمایت کی ہمت نہ پڑی۔ ان لڑکوں کی رشتہ دار لڑکیاں کالج میں پڑھتی تھیں۔ ان کے ذریعہ لڑکیوں کا شکریہ پہنچا دیا گیا۔ اس کے بعد ملّا غائب ہو گیا۔

اپنی اس فتح پر بورڈنگ میں خوب جشن منایا گیا۔ خوب الٹے سیدھے گانے گائے اور ٹینس کورٹ پر خورشید عبداللہ نے ڈانس کیا۔ کالج سے شیروانیاں منگوا کر مشہور شاعروں کا بھیس بدل کر ان کا کلام پڑھا گیا۔ خورشید جہاں جو بھاری بھرکم اور گوری تھی جوش ملیح آبادی بنی۔ ممتاز جو خوب سانولی تھی، چمکدار سفید دانت تھے داڑھی لگا کر جگر مراد آبادی بنی۔ صفیہ سراج مجاز کی بہن تو اپنے بھائی کے کپڑے

ملے آئی وہ حبیب مجاز بنی تو سب کی چیخیں نکل گئیں۔ فاخرہ ساغر نظامی بنی بےحد دلچسپ مشاعرہ رہا۔ خاتون آپا نے دوسرے روز کی چھٹی کا اعلان کیا۔ ٹینس کورٹ رقص گاہ بن گیا۔

ملّا احراری کا جنازہ سارے بورڈنگ میں گھمایا گیا۔ بیچ صحن میں چتا جلائی گئی جس کی آگ میں مونگ پھلیاں بھون کر کھائی گئیں۔ مہینوں اس فتح کا نشہ سوار رہا رشیدہ آپا نے بےحد پیٹھ ٹھونکی۔ یہ ہماری اپنی جیت تھی۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ کالج کے لڑکوں لڑکیوں نے ایک مقدس رشتہ قائم کیا۔ کالج کے لڑکے اس وقت پابندی سے سیاہ شیروانی پہنتے تھے۔ کبھی ہم کسی مشاعرے میں اسٹریچی ہال جاتے یا نمائش میں لڑکوں کے غول لڑکیوں کے پیچھے لگتے تو الٹی لڑکیوں پر ڈانٹ پڑتی تھی۔ حالانکہ کالی اچکن سفید پاجاموں کے رواں دواں غول سے زیادہ ہماری پہچان نہ تھی۔ لڑکیاں کالج کے لڑکوں کو "کوڑیالے" کہا کرتی تھیں۔ کوڑیالا سانپ بےحد خطرناک ہوتا ہے اس کا ڈسا لہر نہیں لیتا یہ نام کچھ رومینٹک بھی لگتا تھا۔ لڑکیوں کے دل میں چھپا خوف اور کچھ دھندلا سا رومان اس لفظ سے وابستہ تھا۔ ان دنوں کالے دُبلے سوکھے لڑکے بھی دُور سے بڑے بانکے لگتے تھے۔ جب پاس سے دیکھا تو دل بیٹھ گیا۔ ان میں زیادہ تر کالے کھرے اور بدصورت تھے۔

اب تو لڑکے کالج میں فنکشن پر آزادی سے آتے ہیں سیل کے موقعوں پر لڑکیاں ان کی خاطریں کرتی تھیں قطعی کوڑیالے نہیں اچھے بھلے انسان لگتے ہیں۔ پُرانی لڑکیاں جو اب پروفیسر لکچرار اور ٹیچرنیں بن گئی ہیں بڑی حسرت سے کہتی ہیں۔ "ہمارے زمانے کے لڑکے بڑے ہینڈسم ہوا کرتے تھے، اب تو کوڑا آ رہا ہے"۔

"دراصل وہ پردہ جو درمیان میں حاصل تھا۔ اپنے اندر نہ جانے کتنے خواب

سموئے ہوئے تھے۔ جو فنا ہو گئے۔ اب لڑکیاں، لڑکوں کو دیکھ کر لوکھلاتی نہیں۔ انہیں اپنے جیسا طالب علم سمجھتی ہیں اس کا یہ مطلب نہیں پردہ ہٹا تو رومان ختم ہو گیا۔ اب بھی عشق چلتے ہوں گے۔ بیاہ رچتے ہوں گے۔

اتنی بات تو ہے کہ پردہ ہٹتا ہے تو کچھ چھچھورے قسم کے جذبات جو صرف تصور کے بل پر پروان چڑھتے ہیں اور بڑی ذہنی اُلجھنوں کا باعث ہوتے ہیں کچھ بلکہ بہت کچھ سلجھ جاتے ہیں۔ حقیقت زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ ایک دوسرے کو جنس مخالف ہی نہیں عام انسان کی حیثیت سے سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ اندھے معاشقوں کا امکان کم ہو جاتا ہے۔ زندگی نسبتاً پائیدار بنیادوں کے سہارے بنتی سنورتی ہے۔

ایف اے کے بعد بی۔ اے کا علی گڑھ میں کوئی انتظام نہ تھا۔ میری بینک بُک میں ابھی کافی روپیہ تھا۔ ابا میاں نے لکھنؤ آئی۔ ٹی کالج میں داخلہ لینے کی اجازت دے دی۔ جگنو کو حبیب ہاسپٹل بمبئی میں ابھی دو سال کام کرنا تھا۔ کیونکہ انہیں اسی شرط پر وظیفہ ملا تھا۔

لکھنؤ میں گزارے ہوئے دو سال میری زندگی میں بہت اہم ثابت ہوئے۔ دماغ کو نئی راہیں ملیں۔ نئے دروازے کھلے۔

شاید یہ لکھنا بھول گئی کہ ابا میاں کا تبادلہ سوجت کا ہو گیا تھا۔ اور ہم لوگ سانبھر کے بجائے پھلیرہ جنکشن پہ گاڑی بدل کے سوجت کی گاڑی میں بیٹھ گئے۔

سانبھر کے مقابلے میں سوجت جنت تھا۔ یہاں اچھی بارش ہوتی تھی بہت سی باؤلیاں تھیں سبزہ ہی سبزہ نظر آتا تھا۔ رتھ کے بجائے ٹانگہ تھا جو ڈپٹی کلکٹری کے آدھے درجن ٹانگوں میں سے تھا۔ علی گڑھ کے مریل گھوڑوں والے کھٹارہ

ٹانگوں کے مقابلہ میں تو ٹنڈ لگتا تھا، نہایت تازہ دم گھوڑا۔ اونٹوں کے علاوہ اور گھوڑے بھی تھے۔ کوچوان سانبھر میں اونٹوں سے بہت کبیدہ خاطر رہتے تھے اپنے گھوڑوں پر ہیڈ سائیس بن کر بہت خوش تھے۔ نوکروں کے کوارٹر بہت صاف کھپریل کے تھے، مگر بنگلا بہت خوبصورت تھا۔ کافی کمرے تھے۔ صحن ابا میاں نے آکر بنوایا تھا باغیچہ آگے پیچھے چاروں طرف تھا چھت پر جانے کا زینہ تھا مگر اوپر کوئی کمرہ نہ تھا۔ لمبی چوڑی چھت کے دونوں سِروں پر چھپر ڈال دیئے تھے کہ برسات میں پلنگ گھسیٹ لئے جائیں۔

دودھ بے انتہا سستا تھا اور گھر پر بھینس لا کر دوہ جاتے تھے۔ مگر اماں نے فوراً بھینس پال لی۔ کہتی تھیں کہ گھر پہ بھینس نہ بندھی ہو تو گھر اجاڑ لگتا ہے مرغیاں اور بکریاں بہت ساری پل گئی تھیں، تین ٹیئے کتے بھی بڑھ گئے تھے۔ ایک بہت خونخوار کتا، کوئی کنور صاحب شکار کھیلنے آئے تھے۔ ابا میاں اول نمبر کے شکاری خود تھے۔ ان سے بہت دوستی ہوگئی۔ وہ اپنا ولایتی کتا دے گئے ابا نے انہیں چاندی کا جاپانی ڈبہ دے دیا جس پر اژدہے لڑ رہے تھے۔ سب کو بہت پسند تھا، بالکل ایسا لگتا تھا اژدہے زندہ ہیں اور ہل رہے ہیں اور نامعقول کتا بے حد خونخوار تھا۔ صرف ابا کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے ان کی مونچھیں چاٹتا تھا گھر میں اماں بغیر زنجیر کے نہیں لانے دیتی تھیں۔ یہاں پردہ بھی کم تھا۔ یہیں دو چار بول آگئے تھے۔ اور تھوڑا کام چل جاتا تھا۔

یہاں مسلمانوں میں سلاوٹ رنگریز اور قصائی افراط سے تھے۔ مرد دھوتی کرتا اور طرح دار رنگوں کے صافے باندھتے تھے۔ عورتیں تنگ پاجامہ اور ان گنت کلیوں کا بہت نیچا کرتا پہنتی تھیں۔ پیروں گلے ہاتھ اور کانوں میں چاندی سونے کا ڈھیروں زیور۔

مسلمان ہندوؤں میں کوئی فرق نہیں لگتا تھا۔ جن کے داڑھیاں تھیں وہ چڑھاتے تھے۔ کچھ مسلمان چگی داڑھی رکھتے تھے اور شرعی پاجامہ پہنتے تھے۔

اگر دال اور اوسوالوں کی گھر والیاں بڑی سی ٹولی میں نکلتی تھیں سب سے آگے ایک عورت یا باندی کہہ لیجیے کھلے منہ، ایک نہایت لمبی چادر اوڑھے ہوتی تھی جو تنبو کی طرح باقی خواتین کے اوپر پڑی ہوتی آخر میں پھر ایک باندی جیسے ڈاوڑی کہا جاتا تھا اس چادر کو پکڑے ہوتی تھی گھاگرے کا نچلا کامدار حصہ اور پنڈلیوں کا نچلا حصہ نظر آتا تھا جو سونے یا چاندی کے تنگ کڑوں سے بھرا ہوتا تھا شادی بیاہ کے دن تو خواتین پانچ پانچ سیر سونا پہن کر نکلتی تھیں۔

ہم لوگ بھی وہاں ان کی دیکھا دیکھی ساڑھی پر چادر اوڑھ کر نکلنے لگے تھے۔ راستہ میں ان کا قافلہ کا ڈولا مل جاتا تو ہم اس کے اندر گھس کر ساتھ چلنے لگتے۔ زیادہ تر حسین اور نوجوان ہی اس انداز سے جاتی تھیں۔ بچیاں ساتھ کُدکڑے لگاتی چلتیں —

جوان عورتیں بڑے بڑے بور پہنتی تھیں جو تاج کی طرح بے حد خوبصورت لگتے تھے گھونگٹ بور کے اوپر اُٹھا رہتا تھا۔ باریک ترین ململ جو چھبیس کی ململ کہلاتی تھی اس کے ڈیڑھ پاٹ کے دوپٹے چرمی ڈبی کے گل بوٹے۔ چوڑا سا کنارا اس سے چوڑا پلو اور بیچوں بیچ میں ایک بڑا سا کوئی گز بھر کے سرکم فرنس کا چرمی ڈبی کے کام سے بھرا گول بوٹا۔ چرمی ڈبی اس بندھنی کے کام کو کہتے ہیں جو عورتیں چھنگلی کے ناخن کو نوکدار اور لمبا کر کے کپڑے کی چار تہہ جاتی ہیں اور پھر اسے دانت سے پکڑ کر چٹکی سے ڈورا باندھ دیتی ہیں۔ جب یہ بندھائی ہو جاتی ہے تو رنگائی شروع ہوتی ہے قیمتی اوڑھنیاں بار بار باندھی اور مختلف رنگوں

میں رنگی جاتی ہیں۔ کھلنے کے بعد ایک ایک پرت میں کئی کئی رنگوں کی توس قزح
پھوٹتی ہے۔

ایک اوڑھنی ہوتی ہے۔ باریک ململ کو ایک طرف ہلکا فیروزی دوسری
طرف ہلکا دھانی رنگا جاتا ہے۔ اسے سمندر لہر کہتے ہیں۔ میں نے بہت پوچھا
کوئی نہ سمجھا سکا کہ یہ معجزہ کیسے ظہور میں آتا ہے۔ باریک ململ کے دو رخ کس طرح
دو رنگوں میں رنگے جاتے ہیں۔ یہ ایک معجزہ لگتا تھا چھٹیاں شروع ہو گئی تھیں
اور سارا خاندان آچکا تھا یا آنے والا تھا۔ ابا نے سب کو لکھ دیا تھا جو آئے
گا۔ اسے دونوں طرف کا کرایہ، مناسب جیب خرچ اور دو دو سادہ جوڑے
ایک عدد جوتا دیا جائے گا۔ آپا دہلی سے طب کا کورس ختم کر کے آگئی تھیں، باجی
دوسرے دن آنے والی تھیں چھوٹی آپا پورے دنوں سے تھیں لہٰذا مجبور تھیں۔
اسحاق بھائی ذکیہ وغیرہ کو لے کر آنے والے تھے بڑے ماموں کے اور جگنو کے
آنے کی خبر گرم تھی۔

ہم لوگوں کو نتیجے کا انتظار تھا۔ اماں بڑی شاندار دعوت کی تیاری کر رہی
تھیں۔ پی پاڑے سے گھی کے کنستر آگئے تھے۔ آٹھ آنہ فی بکری کے بچے کے حساب
سے درجن بھر خرید لئے گئے تھے۔

اور تو اور سوجت میں بجلی تھی۔ ہم اس نیک بخت انگریز کو دعا دیتے تھے
جو ہمارے آرام کے لئے اتنی سہولتیں پیدا کرتا تھا۔ پھر ایک دن ننھے بھائی کا
تار آیا۔

میں جتی سیکنڈ ڈویژن سے پاس۔

"اے ہے شتا کا نتیجہ نہیں لکھا" اماں چڑھ گئیں۔ بڑا چھچھورا ہے یہ
ننھے ---؟

"فرسٹ ڈویژن دیکھ کر جل گئے ہوں گے" شمیم بولے اور اسی وقت جوابی
تار دیا تھا کہ شمیم کا نتیجہ فوراً بھیجو۔

تیسرے دن تار آیا "ہفتہ کو پہنچ رہا ہوں" نتیجہ کا کوئی ذکر نہیں۔
جی جل کے خاک ہو گیا۔ شمیم کی وجہ سے خوشی مناتے بھی برا لگتا ہے وہ
بے حد پریشان۔ اماں کہہ کہہ کر کھانا کھلاتیں۔

"اے بس پرسوں آ رہا ہے ننھے۔ نتیجہ کہاں تک چھپے گا۔"

ننھے بھائی آئے تو چاروں طرف سے لعنتیں برسنے لگیں، وہ حسب
عادل ڈھٹائی سے مسکراتے رہے۔

"جوابی تار ہضم کر گئے۔"

"کہاں ہضم کیا؟ آنے کی خبر بھیج تو دی۔"

"تمہارے آنے کی خبر کو بڑی جان جاوے تھی کسو کی، نتیجہ کیوں نہ لکھ دیا
ساتھ میں۔"

"اتنے لفظوں کی گنجائش کہاں تھی۔"

"تو دو لفظ کے پیسے گانٹھ سے نہ نکلے۔"

"مگر شمیم کا نتیجہ تو سب کو معلوم ہی تھا، خود شمیم کو بھی معلوم تھا کہ فیل ہو
جائیں گے۔"

"اے ہے خدا نہ کرے۔"

"اس میں خدا بیچارے کا کیا قصور ہے۔"

"اے کیا سچی فیل ہو گیا؟" اماں نے بڑی حسرت سے پوچھا۔

"فیل نہ ہوتا، دن رات ہو حق، ناچ گانے جادرے کے نوابزادوں کی
مصاحبت، آگرے میں مجرے۔"

"بے کار جھوٹ بول رہے ہیں" شمیم منمنا ئے۔

"خیر ہم اور چچی تو پاس ہو گئے۔"

"اے غارت ہو اس کمبخت کا پاس ہونا کس کام کا۔ بلا سے یہ فیل ہو جاتی شمیم پاس ہو جاتا"

"ارے واہ، کیوں؟" میں لڑ پڑی۔

"اے ہے لڑکی ذات کو کون سی ڈگری لینا ہیں، مرد ذات کی تو زندگی خراب ہو گئی نا"

"دعوت ملتوی ہو گئی۔ کسی نے بھی زور نہیں دیا۔ دل واقعی شمیم کے فیل ہو جانے سے بیٹھ گیا اُسے خاموش اداس دیکھ کر ساری خوشی اپنی کامیابی کی خاک میں مل گئی۔

ماموں، اسحاق بھائی معہ چند بچوں کے اس وقت ان کے ساتھ بچے تھے شاید تین کو لائے تھے۔ مظہر بھائی، ان کی بیوی اور ایک بچی۔

گھر لبریز ہو گیا۔ کیا ہنگامہ برپا رہتا تھا، پھر باجی بھی آگئیں۔ ان کے ساتھ عظیم بھائی کی جو بچی گود لی تھی مدحت بھی تھی۔ نہایت تیز طرار تندرست آتے ہی نہ جانے کیوں بڑی بہن نزہت کو کھسوٹ ڈالا۔

میں نے دو دھموکے لگائے چڑیل کے۔

کیا لمبا دسترخوان لگتا تھا ایک کے بجائے ہر نئے وارد ہونے والے کے نام سے دعوت ہوتی۔ ماموں کے تیسرے روز بمبئی سے جگنو بھی آگئے ماموں انہیں خط لکھ کر آئے تھے۔

میں اور جگنو بڑی ہوشیاری سے دور دور رہنے کی کوشش کرتے جو اس بھیڑ میں مشکل نہ تھا۔ بس ایک دفعہ نہ جانے کیسے سامنا ہو گیا۔

"پاس ہو گئیں؟" جگنو ہنستے ہیں تو ان کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں بالکل گم ہو جاتی ہیں۔

"ہاں" میں نے بڑے اطمینان سے کہا۔ البتہ اے میں داخلے کے فارم بھر دیئے تھے پاس ہونے کی شرط تھی وہ پوری ہو گی۔

"ہوں" وہ بے تکے پن سے زور سے ہنسے۔

اس کے بعد میں اِدھر اُدھر چکر کاٹتی رہتی۔ جب دیکھتی جگنو بیٹھ گئے تو ان سے کافی فاصلہ رکھ کر میں لوگوں کے بیچ میں گھس کر بیٹھ جاتی دو ایک بار انہوں نے میری طرف دیکھا بھی قطعی رومینٹک انداز میں نہیں بالکل سادگی سے مگر ہنسی روکتے ہوئے۔ جیسے وہ راز جو صرف میں اور وہ جانتے تھے انہیں مضحکہ خیز لگ رہا ہے۔

ویسے مجھے کسی نے رومینٹک انداز میں دیکھا بھی نہیں تھا جیسا قصہ کہانیوں میں لکھا ہوتا ہے تو پھر پہچانتی بھی کیسے؟

شمیم ایک دم بالکل نارمل ہو گئے۔ اور خود اپنے فیل ہونے کا مذاق اڑاتے۔ اصل میں کئی سوال تو ایسے بچوں جیسے تھے کہ میں فوراً تاڑ گیا پٹھا اکزامنر مجھے الّو بنا رہا ہے۔ ارے پانچ سال کا بچہ بھی جانتا ہے۔ میں نے لکھ دیا میاں کسی اور کو احمق بنایئے آپ اس سوال کا جواب اچھی طرح جانتے ہیں اور بھولے پن کے ہم سے پوچھ رہے ہیں"

"کیا سچ مچ تم نے یہی لکھ دیا؟"

"اور کیا جھوٹ موٹ اور ایک سوال ایسے گدھے پن کا تھا، گھُنی کیا تھا سوال وہ" وہ اب میرا نام مستقل "گھُنی" رکھ چکے تھے۔ میں بھی چڑ چڑنے کی حد سے گزر چکی تھی بے خیالی میں یاد نہ رہتا تھا کہ میری بڑی بھیانک چڑ تھی جب

کوئی پھبتی کہتا تھا تو میں اس کا منہ کپڑے کھسوٹ ڈالتی تھی۔ اب سوائے شمیم کے کوئی مجھے "پھبتی"۔ "یا بھوت" نہیں کہتا تھا۔

"کون سا سوال"؟

"ہے بھوت سوال بھی یاد نہیں۔ تم نہایت گھپلے میں پاس ہو گئی ہو۔ پھر سے امتحان دو۔"

"مگر تم فیل ہو گئے۔"

"ہم تمہاری طرح گھپلے میں پاس ہونے کی بجائے شرافت اور ایمانداری سے فیل ہونا بہتر سمجھتے ہیں۔"

ایک دن بولے "ابّا میاں چُنّی کو الیف اے میں اس سال نہ بھیجئے۔"

"کیوں؟"

"اگلے سال جب ہم بھی پاس ہو جائیں گے تو ایک کلاس میں کتابوں کی بچت ہو گی ــــ"

"بات معقول ہے۔ مگر یہ لڑکیوں کے اسکول میں اور تم لڑکوں کے بورڈنگ میں!"

"کتابیں یہی رکھ لے۔ میں دوستوں سے مانگ لیا کروں گا۔" شمیم بڑی سنجیدگی سے کہہ رہے تھے۔ مگر سب جانتے تھے مذاق بنا رہے ہیں کیونکہ وہ ایسی معصوم صورت بنا کر کہتے تھے کہ بجائے غصہ آنے کے ہنسی آجاتی تھی پھر بھی ابا کچھ سنجیدہ ہو گئے۔

"نالائق، ہمارا کتنا روپیہ خراب کرا چکا ہے۔"

"واہ ابّاں اولاد کے لئے اپنی بھی کنجوسی کیا؟" شمیم نے ایسی مسکین آواز میں کہا کہ سب ہنسنے لگے اور ابا میاں بھی سنجیدہ نہ رہ سکے۔

"بیگم آخر یہ نالائق کیا کرے گا؟"

"ارے ابّاں" وہ ابا میاں کو جلدی میں ابّاں کہا کرتے تھے "ہمیں بڑے سے بڑا عہدہ دلوا دیجئے دیکھیئے پھر ہم کیسے ٹھاٹ جماتے ہیں قسم سے گورنر ہی بنوا دیجئے۔ سارے خاندان کو ٹھاٹ کرا دیں گے۔"

"آپ اور گورنر!" ہر طرف سے قہقہے پڑنے لگے۔

"اس میں دانت نکوسنے کی کیا بات ہے۔ ارے گورنر کو کرنا ہی پڑتا ہے۔ بس ڈنر پارٹیاں اُڑانا، مجسموں کی اَن ویلنگ کرنا۔ اور موٹر میں گھومنا۔ قسم خدا کی ہم بے حد اچھے ڈنر کھا سکتے ہیں اور پارٹیوں کی تو جرنہ پوچھو" بھوت ہم گورنر ہو گئے تو تمہیں اسکول کی ہیڈ ماسٹرانی فٹ بنوا دیں گے۔ اور یہ چیندھا سلوتری بے کار میڈیسن میں سر مار رہا ہے ججگنو تم فکر نہ کرو ہم گورنر بنتے ہیں تمہیں اپنے گھوڑوں کا چیف سلوتری بنوا دیں گے۔ ٹھاٹ کر دُ گے یار" پھر ماموں کی طرف مڑے۔

"مگر ہمارے لئے کوئی کچھ کرے جب نا۔ ماموں کا آتنا رسوخ ہے۔ اپنے پاجی بیٹے کو ڈاکٹر بنوا رہے ہیں اور اپنی پیاری سگی بہن کے پیارے سگے بیٹے کو کوئی سپہ سالار یا جاگیردار تعلقدار بھی نہیں بنوا دیتے۔ کیسا خون سفید ہو گیا ہے۔ لو وہ ظفر حسین جی من ہی نہیں رہے ہیں ہماری بات ہی تو مصیبت ہے۔"

"جی مہاراج کیا حکم ہے" ماموں نے نہایت ادب سے کہا۔

"یا ہمیں گورنر بنوا دیجئے یا پھر مہاراجہ سے کہیئے ہمیں گود لے لیں اور راج کنور کھسونچو کو عاق کر دیں۔ کیا اناڑی کی طرح پولو کھیلتا ہے۔"

"ہوں بات تو اپنے نے بڑی کام کی بتائی۔ مگر مائی باپ تھوڑا انتظار کرنا پڑے گا۔ آپا کھانا نکال رہی ہیں اور پسندہ کی خوشبو کچھ زیادہ ہی بے ڈھب ہے بس دو لقمے کھا کے تمہیں گورنر بنائے دیتے ہیں۔"

"کہاں چلے، کیا جا رہے ہو ماموں؟" باجی جو بڑی جانے دلہن بھابی سے کیا کھسر پھسر کر رہی تھیں چونک کر بولیں۔

"ہاں۔ ذرا شنا میاں کو ولی عہد بنوانا ہے۔ آپا، جلدی کرو۔ بیٹے کے مستقبل کا سوال ہے۔"

"اے تو نکال تو رہی ہوں۔ دستر خوان تو بچھواؤ" سب کھسکنے لگے اور بیچ میں بہت سے ہاتھ دستر خوان بچھانے لگے۔

"ارے شنا میاں؟" ماموں بولے۔

"جی ماموں۔"

"ایسا کیوں نہیں کرتے جودھپور چلے چلو، کرایہ ہمارے ذمہ۔"

"ہم چلے جائیں گے۔" بلکہ ماموں ایک لمحہ توقف کے بعد وہ معصومیت سے بولے۔

"سمجھئے کہ ہم پہنچ گئے، پھر؟"

"پھر ہم تمہارے لئے کوئی نوکری ڈھونڈیں گے۔"

"نوکری!" شمیم چیخ پڑے۔

"ہاں، یہ تمہارے ابا میاں تھیا بخش کیا نوکری نہیں کرتے؟"

"کیوں نہیں کرتے، ساری عمر نوکری ہی کی ہے بے چارے نے!"

"تو پھر تمہیں کیوں اعتراض ہے، بولو تم ان سے اونچے ہو گیا؟"

"قد میں تو اونچے ہیں۔ اور سر قد سے اونچا ہوتا ہے۔ اور عقل سر میں ہے اس لئے عقل میں بھی اونچا ہونا پڑ رہا ہے۔"

"تم تو عقل میں بھی اُن سے کم نہیں بلکہ اونچے نکلتے ہو؟"

"ہے تو گستاخی مگر عقل اللہ کی دین ہے اور اللہ میاں کو دھانستا گناہ

ذرا آہستہ" ابا میاں غور سے سن رہے تھے۔

"کیوں؟"

"اب بڑھاپے میں ایسی دل شکنی کی باتوں سے طبیعت مکدر ہوتی ہے۔ ابا میاں کا دل ٹوٹ جائے گا۔"

ان سے اب زیادہ ضبط نہ ہو سکا شمیم کی سنجیدہ ایکٹنگ پر ہنس پڑے مگر پھر جلدی سے بولے "تو پھر ٹھیک ہے۔"

"جی بالکل نشچنت رہئے گرو جی۔ مگر یہ تو پتہ چلے کہ کون سا عہدہ مناسب رہے گا میرے لئے۔"

"وہی چپراسی کا۔"

شمیم تھوڑی دیر انہیں غور سے دیکھتے رہے پھر جلدی سے ایک رکابی اٹھا کر اُن کے سر پہ پنکھا کرنے لگے۔

"ماموں آپ لیٹ جائیے"۔ ماموں پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ ہاتھ سے رکابی لے لی اور بے طرح ہنسے۔

"ہائے میرے جان سے پیارے ماموں" شمیم نے بڑے زور سے بین کے انداز میں ہانک دی۔

"ہے ہے کیا ہوا؟" اماں بوکھلا گئیں اور چمچہ کا کوفتہ اچھل کر دُور گرا شیرا نے لپک کے دانت مارے اور منہ جل گیا تو پیں پیں کرتا بھاگا۔

تھوڑی دُور جا کر زور زور سے کوفتہ کی طرف منہ کر کے بھونکنے لگا۔ اتنا کلکھنا لقمہ اس نے کبھی نہ چکھا تھا۔

"ہمیں چپراسی بنوایا تو سارے خاندان کی ناک کٹ جائے گی۔ ہماری گانٹھ سے کچھ نہیں جائے گا۔ خ... ہی سر پکڑ کے رو دو گے۔ لو وہ رکابی ہی مارے گئے"

"ارے مہاراج رکابی تو دے دو" ماموں بے تحاشہ ہنس رہے تھے اور اماں کے

سامنے رکابی پھیلائے کہہ رہے تھے!

"اپا بیٹے کراو نچے عہدے پر پہنچانا چاہتی ہو تو دو کوفتے دو۔"

"دو کے بدلے چار لے میری، تیرا کھایا بھنیا کے پیٹ پچے گا۔"

اماں اپنے دونوں بھائیوں کو کتنا چاہتی تھیں۔

بڑے ماموں کے دونوں بیٹوں میں کتنا فرق تھا۔ بڑے بھائی مظہر ہمیشہ باپ کے ساتھ رہے، ماموں عجیب مزاج کے تھے۔ اُن کی دوستی بڑے بڑے عہدیداروں سے بھی تھی مگر یارانہ سلاوٹوں رنگریزوں اور قصائیوں سے تھا۔ ان کی صحبت میں جہاں ایک طرف ملک کے مشہور کلاکاروں سے دربار میں واسطہ پڑتا تھا۔ دوسری طرف کنجڑوں نٹوں سپیروں کے بھی رنگ جما کرتے تھے ریاست میں رنڈیوں کا کوئی مخصوص کوچہ نہیں تھا۔ عموماً بال ودھوا جب جوان ہو جاتی تھیں تو کسی عہدے دار یا جاگیردار سے تعلق ہو جاتا تھا۔ جس پر ان کے عہدے اور دولت کی وجہ سے کوئی انگشت نمائی کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ اور پھر یہ برسوں کا اصول چلا آ رہا تھا۔ ستی کی رسم ختم ہونے کے بعد بیوہ کی شادی کا کوئی سلسلہ نہیں چلتا تھا۔

عموماً بامنیاں بے حد حسین ہوتی تھیں۔ سب ایک چھاپ کے چالیس گز کے گھاگرے نہایت مختصر سی مختلف رنگ کی چولیاں جن میں سے آدھا جسم دکھائی دیتا تھا اور باریک ململ کے سیاہ دوپٹے اوڑھتی تھیں۔ گھونگٹ کا کونہ دانتوں میں دبائے جب پانی بھرنے تالاب پر جایا کرتی تھیں تو لوگ بے نتھے بیلوں کی طرح بھٹکنے لگتے تھے۔ دوپٹہ ڈیڑھ گز کا ہوتا تھا اور پیچھے ایڑیوں تک نکلتا تھا لیکن آگے کا کوئی پردہ نہ تھا۔ پتلی کمریں، ناف کی پیچ دار بھونری، نازک نازک دھول میں اَٹے پیر اور کالے دوپٹے میں سے چمکتا چاند سا مکھڑا۔ سر پر تین چار گھاگریں دھرے غول کی صورت میں نکلتی تھیں تو سناٹا سا چھا جاتا تھا۔ کبھی کسی کو بول پھینکنے کی ہمت نہ ہ

ہوتی تھی کہ سب جانتے تھے کہ وہ بڑے بارسوخ افسروں کے سایہ عاطفت میں رہتی ہیں۔

ان کے بچے راج گولے کہلاتے تھے۔ محل کی ڈاکٹر نیال جناتی تھیں اور بچہ وہیں پلتا تھا۔ ناجائز بچوں کو مارنے کی کوئی ضرورت نہ تھی اور لڑکی کے ساس سسر یا والدین لڑکی کو کچھ کہتے تھے بچہ جس کا جی چاہے محل میں پہنچا دے، کچھ انعام ہی ملتا تھا پولیس وغیرہ کا کوئی جھگڑا نہیں اٹھتا تھا۔ ان بچوں کی بڑی اچھی دیکھ بھال ہوتی تھی۔ ان کے الگ اسکول تھے اور ملٹری کی ٹریننگ کے بعد راجہ گولا پلٹن میں بھرتی ہو جاتے تھے۔ یہ پلٹن عموماً مہاراج کی سالگرہ یا شادی کے موقع پر نکلتی تھی اور اس میں ایک ایک نوجوان مردانہ وجاہت کا نمونہ تھا۔ انگریز اسٹاف ان کی ٹریننگ پر مقرر تھا۔ راج گولے کے معنی ہیں مہاراجہ کے بیٹے یا مقبتی (لے پالک)

اس قسم کی لڑکیاں بھی محل میں بڑے لاڈ سے پالی جاتی تھیں اور مہارانی کی ڈاوڑیاں کہلاتی تھیں، کہنے والے کہتے تھے" ان کی آپس میں نہ شادی ہو سکتی ہے نہ تعلق کیونکہ کون جانے شاید آپس میں اُن کا بھائی کا رشتہ ہو۔ راج گولوں اور ڈاوڑیوں کی شادی کا کبھی کوئی قصہ نہیں سُنا۔ ویسے عموماً بیوہ لڑکیاں اغوا بھی ہوتی تھیں، کسی کے ساتھ بھاگ بھی جاتی تھیں۔ سُنا ہے کراچی میں ان کی بڑی مارکیٹ تھی۔ وہاں کے وڈیرے جوان تندرست لڑکیاں بڑے شوق سے خریدتے تھے اور وہاں سے وہ مرکر ہی نکلتی تھیں۔

جودھپور کا شاہی شمشان بہت شاندار تھا۔ اونچا پھاٹک جس کے قریب کی دیوار پر ہزاروں ہاتھوں کے چھاپے تھے۔ اکثر بہت چھوٹے نشان بھی دیکھے جو چار پانچ برس کی بچیوں کے معلوم ہوتے ہیں بہت دھندلے پڑ چکے ہیں۔ جب راجہ پھونکے جاتے تھے تو رانیوں کے ساتھ ڈاوڑیاں بھی پھونکی جاتی تھیں اور انڈ

داخل ہونے سے پہلے لال رنگ میں ہاتھ ڈبوکر دیوار پر چھاپ چھوڑ جاتی تھیں۔

مظہر بھائی جودھپور کی آزاد اور رنگین فضا میں پلے تھے۔ خوب موٹے اور سرخ چقندر تھے۔ بے حد نازک نقشہ تھا۔ بڑی بڑی رومینٹک آنکھیں ننھا سا منہ موتی جیسے دانت۔ لیکن بے حد زہر لگتے تھے۔ شادی سے پہلے بھی اکیلے میں دبوچنے کی کوشش کرتے تھے۔ ننھی ننھی بچیوں تک کو ٹٹول لیتے تھے۔ ان سے سب لڑکیوں کی روح فنا ہوتی تھی۔ شادی کے بعد انہوں نے ٹھنڈی سانسیں بھرنا میٹھی نظروں سے تکنا اور ہولے سے ہاتھ دبانا چھوڑا تھا۔ ان کی بیوی ان کی اس عادت سے نہایت غصہ ہوا کرتی تھیں بے حد روزہ نماز کی پابند اور گھنٹوں وظیفہ پڑھتی تھیں۔ بے حد نازک اور حسین تھیں۔ بڑے ماموں کی سالی تھیں۔ بڑی بہن سے دو سال چھوٹی تھیں یعنی بڑی ممانی کا ئی کمسن تھیں۔ بے حد خوبصورت ہوتیں اگر ان کے چہرے پر ہر دم انجانی سی دحشت اور خوف نہ طاری رہتا۔ دونوں کے گز گز بھر لمبے بال تھے۔ مگر دونوں کچھ کبیدہ خاطر سی رہتی تھیں۔ اور صبح گھنٹوں قرآن کی تلاوت کیا کرتیں بچے حلق پھاڑ پھاڑ کر روتے رہتے اور ان کے کان پر جوں بھی نہ رینگتی۔

جگنو صورت شکل میں بالکل بڑے بھائی کی الٹ تھے۔ دبلے لمبے اور بھدّے نقشے کے چھوٹی آنکھیں بڑے موٹے ہونٹوں کا دہانہ اور نیگرو جیسے ہیں گھونگھر والے بال۔ مزاج میں بھی قطعی مختلف لڑکیوں میں قطعی رومینٹنگ دلچسپی نہیں لیتے۔ جیسے رنگیلا مظہر بھائی سے کتراتیں وہ لڑکیوں سے کنی کاٹتے اور عموماً نہایت محفوظ لڑکیوں کے بیچ میں جم جاتے۔

قریب دو ہفتہ ہنگامہ رہا۔ بنگلہ سے ملحقہ کچہری تھی۔ یعنی بہت بڑا سا مردانہ ڈرائنگ روم کورٹ روم بنا دیا گیا تھا۔ باقاعدہ کٹہرے لگا کر ملزم کے لئے باقی حصہ میں دری بچھی ہوئی تھی اور ڈائس پہ جج کی کافی شاندار سی کرسی تھی۔ تو ...

خانہ میں درجنوں نواڑی پلنگ موجود ہی تھے مع دری اور تکیوں چادروں کے کیونکہ گارڈ کے آنے پر ان کے ٹھہرنے کا انتظام کرنا ہوتا تھا۔ صحن میں بڑے اہتمام سے چارپائیاں اور بستر بچھ گئے الگ الگ خاندان کے گروہ سے بنا دیئے گئے۔ پھر جس کا جی چاہا ادھر چارپائی گھسیٹ لے گیا۔ کچھ لوگ چوکے پر جم گئے جو باقی بچے وہ باہر کے احاطے میں چلے گئے۔ امّاں اور ابا چھت پر سوتے تھے بہوئیں سخت خفا تھیں کہ بڈھے میاں بیوی کیا مزے سے خلوت میں سو رہے ہیں باقی پلٹن کو میدان میں ڈال دیا ہے خصوصاً مظہر بھائی کی دلہن بڑی پریشان تھیں کہ مظہر بھائی ناغہ کے عادی نہ تھے۔

رات کا کھانا کھا کر ہم سب کورٹ روم میں چلے جاتے وہاں بجلی کے پنکھے لگے تھے اور ریگستان میں راتیں تو کافی ٹھنڈی ہوتی ہیں۔

شمیم اپنے فیل ہونے کا غم بالکل بھول گئے تھے اور کورٹ روم میں جج کی کرسی پر ایک تولیہ سر پر ڈال کر بیٹھ جاتے اور سب پر مقدمے چلانے لگتے۔

"آرڈر آرڈر آرڈر" وہ موگری میز پر مار کر چیختے "ورنہ سب کو اسی وقت سزائے حبس دوام عرف کالا پانی کی سزا ہو جائے گی" مجرم نمبر ایک بڑے ماموں عرف ظفر حسین عثمانی کو مابدولت کی خوشنودی کا مژدہ سنایا جاتا۔ کیونکہ انہوں نے ہمیں مہاراج کے منہ بیٹھے فرزند بنانے کا پکا وعدہ کیا ہے۔ اگر مہاراج اس خوش نصیبی پر انکار کرنے پر تل گئے تو کوئی اور آرام دہ عہدہ ہمارے لئے طے سمجھا جائے۔ ہم اس جاں نثاری کے سلسلے میں چھتر پیلس جو زیر تعمیر ہے اس نیک نہاد ماموں کو بخشتے ہیں۔ کیونکہ مہاراج کی گود میں بیٹھ کر ہم پوری جودھپور کو اپنی مٹھی میں لے لیں گے۔

"گھا گھنٹرین مہاراج کے بے پالک!" ماموں نے ہاتھ جوڑ کر اونچے کر دیئے

"مگر ان کے نالائق اور کپوت جگنو عرف اطہر حسین عثمانی سے مابدولت بہت

ناراض ہیں۔ یہ گھوڑوں کا ڈاکٹر کہتا ہے بدہضمی زیادہ کھانا ٹھونسنے سے ہوتی ہے
یہ نالائق اتنا نہیں جانتا کہ ہم کم کھائیں گے تو ہماری ماں جس کے پیروں کے نیچے جنت
ہے کتنی دکھی ہوگی۔ وہ ایک پتی ورتا ماں ہے اس کے دکھ سے پتی یعنی ہمارے
پوجیہ پتا کو بھی دکھ ہوگا۔ ہم اپنے ماتا پتا کا پتا کا دل توڑنے سے پہلے ہیضہ سے
مرجانا پسند فرمائیں گے۔ پاجی ہمیں گھونسا دکھا رہا ہے! سپاہیوں اس کا فوراً سر
تن سے جدا کر دو اور ......"

جگنو اٹھنے کی دھمکی دے رہے تھے، سب انہیں روک رہے تھے۔

"اسے پکڑ لو سپاہی، ورنہ ہم اسے کورٹ کی بے عزتی کے جرم میں ....
اچھا جانے دے بھئی تو سزا نہیں لیتا تو چولہے میں جا۔ مگر ہم نے منے بھائی عرف عظیم
بیگ چغتائی عرف مشہور مزاح نگار پیشہ وکالت اور بچہ بازی۔ اس کی بیوی عرف
دلہن بھابی ہر دو سال بعد بچہ داغ دیتی ہے خیر ہم صرف ایک شرط پر معاف فرما سکتے
ہیں کہ یہ علی گڑھ یونیورسٹی پر مقدمہ دائر کرے کہ ہمارے ساتھ جو بے ایمانی کی گئی ہے
یعنی ہماری فرسٹ پوزیشن مار کر ہمیں فیل کر دیا گیا ہے اس کا ازالہ کرے اور ہم سے معافی
مانگے۔"

کیا زمانہ تھا بات بے بات ہنسی آتی تھی اور جس انداز سے شمیم ابا کی نقل کر رہا
تھا ہم لوگ ہنسی کے مارے بے دم ہوتے جا رہے تھے۔

"اور مجرم مرچنی عرف عصمت خانم چغتائی جس میں سے لفظ خانم چغتائی جس
میں سے لفظ خانم اس نے ڈکار لیا ہے نہایت ناخلف گستاخ اور بے شرم ہے
کہ بڑے بھائی کے نمبر اپنے نمبروں میں جوڑ کر خود پاس ہو گئی اور ماہ بدولت پر فیل ہونے
کا جھوٹا الزام لگا دیا۔ حکم دیا جاتا ہے کہ یہ پرانے قرضوں کا تقاضا بند کرکے ماہ بدولت
کو فی السور دس روپیہ ادھار دے۔ انشاءاللہ ہم قیامت کے روز ایک کے ستر

ہزار ادا کریں گے۔ بدنصیب کیسی کوتاہ اندیش ہے۔ ذرا بھی عاقبت کی فکر
نہیں بڑا بھائی باپ برابر ہوتا ہے۔" شمیم مجھ سے ڈیڑھ سال بڑے ہوں گے۔" ہم
اس کے بزرگ ہیں اور جلد ہی کانا کھترا عقل کا اندھا گانٹھ کا پورا تلاش کرکے اس
کے ہاتھ پیلے کرکے مردار کا منہ کالا کر دیں گے۔

میں نے جوتی پھینک کر ماری۔ جو ٹھیک ان کی چھاتی پر لگی۔

"گستاخ سیدھی جہنم میں جائے گی ہاں اور یہ مجرم ......" انہوں نے انگلی اٹھائی
اور سناٹے میں رہ گئے۔ سامنے ابا میاں کھڑے تھے۔ ان کی ہنسی ہمیشہ مونچھوں میں
غائب ہو جاتی تھی۔ لیکن آنکھیں قہقہہ لگاتی تھیں۔

"باپ رے" شمیم نے جلدی سے تولیہ اتار دی اور بڑی مری ہوئی آواز
میں بولے۔

"حکم دیا جاتا ہے کہ ماہ بدولت کی چونکہ .... گھگھی بندھ چکی ہے لہٰذا کچہری
برخاست" اور شمیم عزاپ سے پچھلے دروازے میں سے غائب ہو گئے۔

اس پاپی کا کیا مستقبل ہوگا۔ ابا فکرمند مونڈھے پر بیٹھ گئے۔ محفل کو جو قہقہہ
زار بنی ہوئی تھی جیسے سانپ سونگھ گیا۔ اس کھلنڈرے ڈھولچی کا کیا بنے گا۔"
"سرکار فکر نہ کیجئے اس سال میرے پاس جودھپور بھیج دیجئے۔ میں سور کر بیل
ڈالوں گا۔ ضرور پاس ہو جائے گا" عظیم بھائی بولے۔

"یہ پاس ہونے والی آسامی نہیں" بڑے ماموں بولے "میں اسے کسی محکمہ
میں لگا دوں گا۔"

ماموں خود پڑھے لکھے نہیں تھے۔ لیکن ان کے چچا، دادا کالے میاں فوج میں
رسالدار ہو گئے تھے۔ جودھپور کی شہریت مل ہوئی تھی بڑا رسوخ تھا۔ ہم سب
مارواڑی باشندے بن چکے تھے۔ مہاراج امید سنگھ جی ہر ماہ بڑے ماموں کو دربار

میں درشن دیتے تھے یہ خبر بھی تھی کہ انہیں بھی پیر میں سونے کا کڑا ملنے والا ہے۔
ریاست میں جن خاندانوں کو سونے کا کڑا مل جاتا تھا۔ ان کی عورتیں پیر میں سونا پہن سکتی تھیں۔ ورنہ پیر میں سونا پہننا سخت جرم تھا۔ عظیم بھائی کو وکالت کی اجازت وسیم بھائی کو محکمہ خاص میں نوکری منظر بھائی کو بھی پولیس میں نوکری اور اسحاق بھائی کو تھانہ داری دلوا چکے تھے۔ ماموں کا بڑا رسوخ تھا۔ ہاں چھوٹے ماموں کو بھی ایکسائز انسپکٹر بنوا دیا تھا۔ اور جگنو کو وظیفہ دلوایا تھا ڈاکٹری پڑھوانے کے لئے۔

جودھپور میں کبھی ہندو مسلمان سوال نہیں اٹھا۔ مسلمان ہمیشہ معتبر عہدوں پر فائز رہے۔ فوج میں پولیس میں بہت کھپے تھے۔ جودھپور کے مسلمان بڑے صلح پسند میاں بھائی کہلاتے تھے۔ کوئی خاص محلہ مسلمانوں کا نہیں تھا۔ ہولی دیوالی عید بقر محرم پر جھگڑا تو دور کی بات برابر حصہ لیتے تھے۔ دیوالی پر اماں دیا ضرور جلواتی تھیں انہیں پکا یقین تھا کہ لکشمی دیوی کا ان پر سایہ ہے، انہیں کے چرنوں کے صدقے میں دن بدن خوشحالی بڑھ رہی ہے۔ پنشن کے بعد آگرہ اور علی گڑھ میں کافی درگت بن گئی تھی اور اب پنشن کے علاوہ جج کی تنخواہ نے پھر ہاتھ کھول دیئے تھے۔ سانبھر میں تو نمک کی جھیل اور ریت کی وجہ سے ہریالی نام کو نہیں تھی سو جبت کافی سرسبز تھا۔

نہ جانے کب برقع غائب ہو گیا۔ باہر نکلتے وقت ہندو عورتوں کے رواج کے مطابق سب شریف گھرانوں کی بیویاں چادر اوڑھتی تھیں سلاوٹ رنگریز چھیپے میں پردہ نہیں تھا۔ عورتیں گھونگٹ نکالتی تھیں۔ کچھ کرتے تنگ پاجامے پر باہر نکلتے وقت لشنوار پہن لیتی تھیں۔ بڑی بوڑھیاں گھونگٹ نہیں نکالتی تھیں۔ سینہ پر دوپٹہ ڈال لیتی ہیں ہاتھ بندھے چلتے ہیں لہذا گھونگٹ کے باوجود دوپٹہ سر پر ڈال کر پیٹھ پر لٹکتا رہتا تھا۔ زمین پر نہ رُلے اس لئے ایک کونا نیفے میں اڑسا رہتا تھا۔ لہنگا چولی کے ساتھ بھی دوپٹہ پیچھے ہی پڑا رہتا تھا۔ مارواڑی خواتین کا لباس نہایت بھڑک دار رنگ

کا ہوتا تھا۔ مہینوں رنگ کھلا رہتا تھا۔ ایک جوڑا جب تک تار تار نہ ہو جاتا بدلا نہیں جاتا تھا۔ عورتیں نال پر جا کر کپڑے اتار کر دھوتیں اور ریت پر پھیلا دیتیں مرد گزرتے تو پلٹ کر بھی نہ دیکھتے نہ عورتوں کو رتی بھر پروا ہوتی۔ عورت کا جسم کوئی عجوبہ نہیں تھا مرد کے لئے۔ سات آٹھ سال کے لڑکے لڑکیاں بے تکلف ننگے پھرتے۔

لڑکی کی شادی ہو جاتی تھی تو بور باندھنا ضروری ہو جاتا تھا۔ چوٹی بڑے حساب کتاب سے باندھی جاتی ہے۔ تیل ڈال کر جوئیں وغیرہ نکال لینے کے بعد عورتیں ایک دوسرے کی چوٹی گوندھتی تھیں۔ بیچ کی مانگ نکال کر پہلے آگے کے تھوڑے سے بال دونوں طرف سے بے کر بور کی دوری کے ساتھ ایک مینڈھی گوندھی جاتی پھر باقی کے دونوں طرف کے بالوں کی مینڈھیاں گوندھی جاتی ہیں۔ پھر ان سب کو سمیٹ کر گدی سے اونچی چوٹی گوندھی جاتی ہے۔ مارواڑ میں عورتوں کے بال بہت چھوٹے ہوتے ہیں اس چوٹی پر کلاوہ یا کالا ڈورا خوب کس کر لپیٹا جاتا ہے اور سونٹا سا بنا لیا جاتا ہے۔ ایک بال بھی ہفتہ یا دو ہفتہ باہر نہیں نکلتا۔ پھر جب بدلونا قابلِ برداشت ہو جاتی ہے اور سر میں جوئیں کلبلانے لگتیں تو نہان ہوتا۔

بڑے ماموں، منظر بھائی، بڑی ممانی، بھابی جان اور بچے اردو سے زیادہ اچھی مارواڑی بولتے تھے۔ آہستہ آہستہ سب کی زبان پر مارواڑی الفاظ چڑھنے لگے تھے۔ علی بخش اور شمشانی بوا کے علاوہ سب نوکر چپراسی، چوکیدار مارواڑی بولتے تھے۔ اماں مارواڑی سمجھتی تھیں بولتی نہیں تھیں۔

مارواڑ میں عورتوں کی آوازیں بے انتہا سریلی ہوتی ہیں۔ چار عورتیں جمع ہوئیں اور سر جوڑ گھونگھٹ کاڑھے گانا شروع کر دیتی ہیں آس پاس کی عورتیں جمع ہونے لگتی ہیں۔ اور کیا آوازوں کا اکسٹرا شروع ہو جاتا۔ لفظ تو پلے نہیں پڑتے مگر آوازوں کا زیر و بم بے چین کر دیتا ہے۔ سروں میں غضب کا سوز اور اداسی، ایک عجیب سی تنہائی کی پکار

میٹھا میٹھا غم ۔ پنجاب کے گانے چہکتے ہیں ۔ سرسبز کھیت اور میدان گھنے جھنڈ چھل چھل کرتی ندیاں ۔ رم جھم بارش، پنجابی گانوں میں قلانچیں بھرتی ہے ۔ مگر ریگستان میں ٹھوہڑ کے جھنڈ میلوں ریت ہی ریت سپاٹ چٹانیں ۔ ببول اور بھبٹ کٹیا کے اکاڈکا پودے ۔ اور پھر ریت ...... ریت .... ریت پانی کی بے مروتی نے دلوں میں کیسے دھیمے خشک گھاؤ ڈال دیئے ہیں ۔ سامنے پیا پتھر توڑ رہے ہیں ۔ پر سجنی پی کو پکارے ہی جا رہی ہے ۔ لگتا ہے اصلی پیا پانی ہے عورت مرد بچے، ڈھور ڈنگر بلٹیر پکھیرو سب کا پیا پانی ہی تو ہے ۔ مور بے انتہا ہیں ۔ ان کی پکار میں بھی بلا کا درد ہے ٹٹیری بھی سسکیاں بھر بھر کے پکارتی ہے ۔ ٹٹی ہٹ ٹٹی ہٹ ۔

چلچلاتی دھوپ میں سپیرے نکلتے ہیں ۔ سانپ کی جھولی اور بین سنبھالے ۔ سانپوں کے درشن کراتے وقت سپیرا پیر میں گھنگروؤں کے گچھے باندھے پٹاری کے چاروں طرف ناچتا ہے ۔ سپیرن ڈھول پر تھاپ دیتی ہے ۔ ناگ دیوتا جھومتے ہیں سپیرا نہ جانے تلوے میں کیا لگاتا ہے کہ کھڑاؤں پر لگا ہے کہ تلوے سے چپک جاتی ہے ۔ ڈھول کی گمک، بین کا جادو گھنگروؤں کی چھم چھم ۔ جیسے بادل گرج رہے ہیں ۔ کھڑاؤں بجلی کی کڑک کو ماند کئے دیتی ہے ۔ بس کوئی دم میں دیو پگھل کر برس پڑیں گے ۔ دھرتی سیراب ہو جائے گی ۔ مگر یہ بارش کانوں کے ذریعے جسم کے روم روم کو سیراب کر دیتی ہے ۔ حلق اور بھی خشک ہو جاتا ہے ۔

کٹھ پتلی والا ہر پندرھواڑے پابندی سے آتا ہے ۔ پنی دے کر سائیکار دیہ لے جاتا ہے ایک عدد چارپائی، ایک لالٹین ۔ اسٹیج سج جاتی ہے ۔ کھیل وہی پرانا مگر ابا کو تو مارواڑی گانے سننے کا شوق ہے ۔ بنیاڑی ڈھولا، مانڈ، کھیل ختم ہو جاتا ہے ۔ مگر گانے چلتے ہی رہتے ہیں ۔ جی ہی نہیں بھرتا ۔

ابا کسی کھیل تماشے والے کو نہیں لوٹاتے ۔ بندر والا، بازی گر، کبوتر باز، تنگ پاجامے چھوٹی سی چوٹی پہنے ۔ ربڑ جیسے جسم والی "کبوتر باز" یعنی نٹنیاں کیسے جسم کو مروڑتی ہیں کر لگتا ہے اب لوٹا چٹاخ سے ۔

اور مہینے میں ایک دفعہ تماشہ والے ضرور آتے ۔ صبح طے کر جاتے اور سرِ شام آکر اسٹیج سجاتے ۔ ایک پانچ چھ گز کا دبیز کپڑا دو بانسوں کی مدد سے میز کی طرح تان دیا جاتا ۔ اس کپڑے پر ایک دنیا موجود ہے تخت پہ بیٹھا راجہ، پانی بھرتی حسینائیں، بنسی بجاتے راس رچاتے کنہیا جی سودا بیچتے سوداگر، بھالے والے، بندر والے، چوڑی چنری بیچنے والے، پھل پھول، باغ، فوارے، تیر کمان تانے لکشمن جی، گرز اٹھائے پونچھ میں آگ کا شعلہ، ہنومان جی ۔ لال جیبھ سے خون ٹپکتا منڈ مالا گلے میں دھارن، شنکھ گدا کنول دھاری ...... راکھشش کے سر پہ پیر جمائے کالی ماتا نو کا میں پتوار سنبھالے مانجھی ۔ ارے ایک کونے میں لاٹ صاحب بھی ہیں منہ میں چرٹ دبائے ۔ کیا نہیں اس چھ گز لمبے سوا گز چوڑے کینوس میں ۔

باہر احاطے میں آس پاس کی خلقت جمع ہو جاتی ہے ۔ مونڈھوں پر ابا کے ساتھ عمائدینِ شہر کچھ عہدیدار سارا پولیس کا عملہ چھت پر خواتین ۔ ابا تو جلدی اٹھ آتے ۔ پھر کچھ اور بزرگ بھی چل دیتے، محفل میں کسی کو ذرا بھی احساس نہ ہوتا ۔ چپکے سے چوروں کی طرح کھسک لیتے اور رات بھر دو نوجوان پیروں میں گھنگرو باندھے بین بجاتے، ناچتے ۔ ڈھول ہمیشہ عورت ہی بجاتی اور ساری رات گھونگٹ میں سے موسیقی کے دھارے بہتے، باقاعدہ کہانیاں گائی جاتی ہیں ۔ سوال جواب چلتے ہیں ۔

وقت بہت تیزی سے گزر رہا تھا ۔ میں نے سوچا کچھ دن کے لئے جودھپور ہو آؤں منے بھائی بلا گئے تھے ۔ دلہن بھابی میرا بہت خیال رکھتی تھیں کچھ کپڑے بھی خرید لوں گی ۔ منے بھائی دن بھر وکالت میں سر کھپاتے، صحت ذرا غنیمت ہو گئی تھی ۔ دمہ کی

شکایت بھی غائب ہو چکی تھی۔ وہ رات کو دیر تک لکھتے صبح جب وہ کچہری چلے جاتے تب وہ جاگتی۔ دُلہن بھابی جھٹ پٹ کچھ ناشتہ دیتیں اور رات کی لکھی ہوئی کہانی مجھ سے پڑھوا کر سنتیں۔ وہ ان دنوں شریر بیوی لکھ رہے تھے۔ اس میں بہت سی باتیں انہوں نے زندگی سے لی ہیں۔ باقی افسانہ نگاری ہے۔ دُلہن بھابی سُن کر بہت غصہ ہوتیں "یہ سب جھوٹ ہے" اور ایک روز منے بھائی سے لڑ پڑیں اور مسودہ جلانے کی دھمکی دی۔ انہیں بے انتہا ہنسی آئی۔ سمجھانا چاہا کہ بے وقوف یہ کہانی ہے۔ مگر وہ کہاں مانتی تھیں۔ نتیجہ یہ کہ مسودہ کورٹ اپنے ساتھ لے جاتے جو لکھ چکے ہوتے۔ وہ شاہد بھائی کو دلی بھیج دیتے۔ بڑی چراغ پا ہوئیں۔ پورے دن سے تھیں مگر بے حد پھرتیلی تھیں۔

ایک دن صبح مجھے منے بھائی نے جگایا۔

"اٹھو"

"ابھی سے، تھوڑی دیر میں اٹھوں گی" میں کروٹ لے کر پھر سونے لگی۔

"ارے ہمارا بیٹا نہیں دیکھو گی؟"

"رات بھر تمہارے کیسے بیٹھے لاتیں مارتے رہے۔ یہ نجو اور چھبا بہت بد ہیں۔ میں انہیں نہیں سلاؤں گی۔ اپنے ساتھ دونوں گھس پڑتے ہیں"

"ارے نیا والا بیٹا!"

"نیا۔ ہیں، کیا بچہ پیدا ہو گیا"

"ہاں چلو دیکھ لو"

"رات تک اچھی بھلی سوئیں دلہن بھابی اور صبح بیٹے سے بچہ دے دیا"

"رات کو تکلیف تھی۔ چھوٹے خان کو بھیج کر نرس کو بلوا لیا اور ....."

"آواز بھی نہیں نکلی"

"بھئی ایکسپرٹ ہو گئی ہے ہماری خانم ہمیں بھی نہیں جگایا"

"تیسرا بیٹا، پانچواں بچہ بے حد پیارا گول مٹول۔ دُلہن بھابی لیٹی ہنس رہی تھیں" راجپوتوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا تھا اس لیے ہر وقت راجپوتی آن بان کا ذکر رہتا تھا۔ منے بھائی نے نجو کا نام موہن سنگھ، چھبا کا سوہن سنگھ اور نو وارد کا نام فوراً مکھن سنگھ رکھ دیا۔ وہ تھا بھی مکھن ملائی جیسا نرم سفید۔ وہ کبھی اُن کے اصلی نام نہیں لیتے تھے اور موہن مکھن سوہن ہی پکارتے تھے۔ بہت پیار آتا تو موہنیا، سوہنیا اور مکھی یا مکھو کہتے تھے۔ آج بھی صرف مکھو کا نام رہ گیا ہے۔ دونوں بڑے اب زعیم اور نجیم کہلاتے ہیں۔

ہم دس بہن بھائیوں میں سے دو کے اولاد نہیں ہوئی۔ آٹھ نے انتیس بچے پیدا کئے جن میں سے تیرہ پاکستان چلے گئے سولہ ہندوستان میں رہ گئے۔

عظیم بھائی کا انتقال ہو چکا تھا۔ پارٹیشن کے بعد ایک یہاں رہ گئے اور چار پاکستان چلے گئے ہم چاروں بہنیں ہندوستان ہی میں رہیں۔

چار بھائیوں میں سے تین کا پاکستان میں انتقال ہو گیا۔ بس ایک بھائی ہیں۔ مجھ سے چھوٹے ہندوستان میں بھی ایک بھائی ہیں مجھ سے بڑے۔

مگر میں مرنے والوں کا ذکر نہیں کرتی۔ ایسا لگتا ہے کہیں ہم دسوں زندہ ہیں اور ہم اب بھی چھ بھائی اور چار بہنیں ہیں۔

ایک بہن کا ہندوستان میں انتقال ہو گیا۔

باجی، میری پیاری باجی، امّاں جنہوں نے مجھے پونے دو برس کی عمر سے سنبھالا تھا۔ ان کا رنگ صاف تھا میرا سانولا، ورنہ لوگ سمجھتے تھے میں اُن کی بیٹی ہوں۔

اُلٹے بانس بریلی

جاورہ سے بریلی پہنچی تو کوئی اسٹیشن پر لینے نہیں آیا تھا۔ میں جن حالات میں

جادرہ سے فرار ہوئی تھی تار دینے کی مہلت کہاں تھی۔ مہمانوں میں صرف باجی رام پور سے آئی تھیں۔ چھوٹی آپا حیدر آباد سے آنے والی تھیں۔ مگر دولہا بھائی کو چھٹی ہی نہ مل سکی۔

اس لئے وہ نہیں آ رہی تھیں۔ جودھپور سے بھی کوئی نہیں آیا تھا۔ ابھی شادی میں چھ سات دن باقی تھے۔ نیرؔ مایوں بیٹھ چکی تھی۔ گو انتظار تھا کہ رسم بعد میں سب کے آنے کے بعد ہوگی۔

میں نے کسی کو نہیں بتایا کہ عظیم بھائی اور دُلہن بھابی میرج ڈی بی ہسپتال میں ہیں اور میں دو بچوں کو گھر میں سوتا ہوا چھوڑ آئی ہوں۔ دل بہت پریشان تھا بچوں کی طرف سے آپا کو عظیم بھائی کی بیماری اور بچوں کی تنہائی کے بارے میں ان کی شادی میں نا شادی پھیلانے سے کیا فائدہ۔ مگر جب سوچتی تو دم لوٹنے لگتا۔ ایسی دحشت ہوتی کہ جی چاہتا واپس لوٹ جاؤں۔ مگر واپسی کا خوف اور بھی بھیانک تھا۔

نیرؔ مجھے کبھی منہ فق سورج میں ڈوبا دیکھتی تو اسے مجھ پر بڑا ترس آتا۔

"اے بہن دیوانی ہو جگنو بھائی سے شادی کیوں نہیں کر لیتی"۔

"ارے ہٹاؤ تمہیں شادی کی پڑی ہوئی ہے۔ میں یہ تین بچے کیسے سنبھالوں گی"۔

کیوں لے آئیں انہیں، اور اس گھٹنو چلتی مینو کو لانے کا کیوں شوق چرایا؟"

"بس تم تو جانتی ہو میں تھوڑی سی پاگل ہوں"۔

"دلہن ممانی اور ماموں جان کیوں نہیں آئے؟"

اُف کمینی! جی چاہا ایک گھونسا لگاؤں مگر ضبط کر گئی۔

"انہیں چھٹی نہیں ملی۔ ہاں تمہارے دولہا میاں آ گئے؟"

"آ گئے۔ نیرؔ شرمائی "کہتے ہیں ساتھ لندن لے جائیں گے"۔ مخمل کی واسکٹ پر سلمے کے پھول ٹانکتے ہوئے کہا۔ اور آنکھوں سے لڑیاں بہنے لگیں۔

"کیوں، لندن جانا نہیں چاہتیں؟"

"تو جانا کوئی اپنے بس کی بات ہے"۔

"کیوں تم انکار کر دو۔ دو سال بعد تو آ ہی جائے گا"۔

"ان کا وہاں اکیلے دل نہیں کرتا اس لئے تو بیچ پڑھائی میں شادی کر رہے ہیں"۔

"تم خود بھی جانا چاہتی ہو۔ ارے مزے رہیں گے۔

"پھر تو بی۔ اسے کرہی ڈالو۔ تمہاری سسرال میں سبھی لڑکیاں تعلیم یافتہ ہیں۔ رشتہ کی بہن بی ٹی ہیں۔ سگی بہنیں تو بس گھر میں ہی پڑھیں۔ اور انہیں زیادہ پڑھی لکھی لڑکیاں پسند بھی نہیں"۔

"کیوں"

"وہ بس کہتے ہیں، کوئی نوکری تو نہیں کرنا"۔

"مگر بدر النساء باجی اور......"

" وہ ان کی ددھیال والیاں ہیں۔ ننھیال میں بس گھر ملو تعلیم امور خانہ داری سلینا پرونا بس بہت ہوتا ہے"۔

"چڑیل تو اتنی ذہین ہے۔ تھوڑے ہی نمبروں سے تو تھرڈ پوزیشن میٹرک میں سے آئی تھی پوری یونیورسٹی میں رضی کو تو فخر کرنا چاہیئے اُسے تو کبھی فرسٹ ڈویژن بھی نہ ملی ہو گی۔ مت کر پاجی سے شادی"۔

"اے بس لگیں ہانکنے خدا کے لئے منہ سے بھی یہ بات نہ نکالنا۔ ولایت پاس اور پھر ماں باپ کا اکلوتا بیٹا اتنی بڑی جائیداد کا مالک لاکھوں میں ایک ہے اور مجھ میں کیا دھرا ہے۔ ایک لڑکی خاندان میں آس لگائے بیٹھی ہے"۔

نیرؔ بے حد جاذب نظر چمپئی رنگ نازک نقشہ معصومیت کا مجسمہ نازک دبلی پتلی جو کپڑا پہن لیتی کھل اٹھتا، وہ سب کچھ تھی جو میری تمنا تھی کہ میں ہوتی۔

اور پھر کتنی فرماں بردار، بزرگوں کے آگے سر جھکانے والی۔ کھانا پکانے میں مشاق سینے پرونے میں اُس کا جواب نہیں۔ کس قدر جاں فشانی سے اس نے اپنا جہیز سنوارا تھا، ایسا کارچوب کا مدانی اور کڑھائی کا کام کہ بڑے بڑے کاریگر عش عش کر اٹھیں، جو دیکھتا تھا اُس کے سگھڑاپے کے گن گانے لگتا۔ سارے محلے میں اس کے سگھڑاپے کی دھوم مچی تھی مجھ پر ایک دم احساس کمتری پہاڑ بن کر ڈھے پڑا۔

"تم کب کروگی شادی؟" اس نے میرا اترا منہ دیکھ کر بڑی نرمی سے پوچھا جی چاہا بتا دوں اگر سر میں کیڑے نہ بھرے ہوتے تو آج شاید اس وقت میں لال جوڑا پہنے گھونگٹ نکالے بال بال موتی پروئے کبوتر کے انڈے برابر ہیرے کا جگنو پہنے اپنے نواب دولہا کے قدموں کی آہٹ پر کان لگائے بیٹھی ہوتی۔

مگر مجھے ایک دم ہنسی آگئی، میرا اور گھونگٹ کا کیا جوڑ۔ میں نے بات کا رُخ موڑا۔

"آپا نے لکھا تھا یہاں کوئی مسلم اسکول ہے لڑکیوں کا وہاں ہیڈ مسٹریس کی ضرورت ہے۔"

"اے ہے پھر نوکری کی جھک سوار ہوگئی، شادی نہیں کروگی؟"

"کروں گی بھئی۔"

"کب؟"

"بس تمہارے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں تو چٹ اپنی برات چڑھوا لوں گی۔"

نیر کا منہ پھول گیا۔ اماں ٹھیک کہتی ہیں۔ بے انتہا بیکار ہوں۔ اس نے گھڑی دیکھی اور مغرب کی نماز کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں بالشت سے مخمل کی صدری ناپنے لگی۔

کتنی پتلی تھی نیر کی کمر۔۔۔۔

دوسرے دن باجی بڑے دولہا بھائی اور مدحت آگئے۔ اور تیسرے دن ممانی جان معہ اختر جمیلہ کے آگئیں۔ اُسی شام کو اماں بھابی وسیم بھائی اور ان کا بچہ حکم آگئے۔

اماں نے کھاجانے والی نظروں سے مجھے گھورا اور میری سٹی گم ہوگئی۔

"نامراد بجو پھپا کو چھوڑ کے آگئی" انہوں نے اکیلے میں پکڑ ہی لیا۔

"اماں کسی سے کہنا نہیں، سرفراز چچا ملے تو وہ تمہیں بتائیں گے۔ نواب صاحب منے بھائی کی جان کے دشمن ہو رہے تھے۔"

"اے کیا بک رہی ہے۔"

"قسم سے سرفراز چچا نے چپکے سے بتایا۔ اور۔ نزہت کو حرم میں ڈالنے والے تھے اور مجھے بھی۔"

"اے موئے نواب کو باؤلے کتے نے کاٹا ہے۔ جو تجھے حرم میں ڈال کے عذاب مول لیتا، میری بات یاد رکھو تیری بڑی مٹی خراب ہوگی۔"

"خاندان کی ناک کٹے گی۔"

"ابا گئے، بڑے ابا بھی رخصت ہوئے پھوپھی بادشاہی سے جھگڑا ہے، خاندان میں اب ناک کون سی بچی ہے۔"

"ماموں کسی گنتی میں نہیں؟"

"ارے ماموں سینکڑوں میل دور جودھپور میں اُن کی ناکیں میری چھچھوریوں تک کہاں پہنچیں گی ہاں اماں منے بھائی کے بارے میں آپا کو نہ بتانا۔"

"ارے میں کوئی دیوانی ہوں۔"

نیر کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ آپا نے نزہت مکھن اور مینو کے جوڑے راتوں رات سی ڈالے۔ میں نے ایک سفید شفون کی ساڑھی خرید کے اس پر چھپا چھپ نیر سے ٹھپا اور کرن ٹنکوائی۔ شادی میں بڑے مزے آئے۔ میں قطعی ساس بننے کے موڈ میں نہیں تھی۔ ویسے اختر جمیلہ بھی ساس ہی تھیں۔ سالیوں میں مرگھلی سی نزہت اور تنفیا مرچ آٹھ برس کی مدحت تھی۔ لہٰذا ہم نے قطعی سالیوں کا رول سنبھال لیا۔ اور دولہا والوں کی خوب خبر لی۔ رضی کو بھی ناکوں چنے چبوا دیئے۔ سمدھنوں کے ساتھ سمدھن ہی جلتے اور دولہا اور

اس کی بہنوں کے ساتھ سالیاں بن کے ناطقہ بند کرتے ۔نیر کے بھائی مجیب جمیلہ پر نہ جانے کب سے دانت لگائے بیٹھے تھے دھینسٹ میں ہم نے لڑکوں کو بھی اندر بلالیا، جھوٹ بول کر کے اجازت ہے ۔ ویسے خاندان کا معاملہ تھا ۔زیادہ پردے کا سوال نہیں تھا پھر تو بہت سے لڑکے دَر آئے ایلٹن اس شان سے کھیلا گیا کہ جواب نہیں اور چوتھی کے دن تو ہاتھ پیروں کی خیر منانی پڑی بزرگوں کی ڈانٹ ڈپٹ سننے کی نہ فرصت اور نہ ارادہ بڑی بوڑھیاں بے حد خفا۔ مگر یہ ایک قطعی بزرگوں کے بس میں رہنے کو تیار نہ تھی ۔جب سکون ہوا اور مہمان رخصت ہو گئے تو الزام میرے سر تھوپنے کی کوشش کی گئی ۔مگر گذشتہ رات اور دن اودھم میں ایسا گذرا تھا کہ ڈانٹ نے لوری کا کام کیا اور ذرا ستانے کو گاؤ تکیے پر سر ٹکایا تھا کہ بے ہوشی طاری ہو گئی

شادی میں گرلز اسکول کے منیجر کی بیگم بھی ملیں ۔انہوں نے کہا مہینہ بھر سے اسکول کھلا ہوا ہے ۔ مگر ہیڈ مسٹریس کا تقرر نہیں ہوا ہے ۔لوگوں کا تقاضا ہے کہ مسلمان ہیڈ مسٹرس رکھی جائے ۔اس لئے بس شادی کا ہنگامہ ختم ہوتے ہی آجایئے ۔

تیسرے دن خود منیجر صاحب آئے اور بات طے ہو گئی ۔ سو روپیہ مہینہ کوٹھی میں جتنے کمرے چاہوں لے سکتی ہوں ملا ہوا اسکول ہے دو قدم پر بس بیچ میں ایک دیوار ہے میں نے اسی دن جا کر چارج لے لیا۔ ہاں ایک اور مصیبت ٹوٹ پڑی ۔چوتھی کے دوسرے دن بھابی نے ایک عدد بچی دے ڈالی ۔ہم لوگ جاگے تو معلوم ہوا بچی پیدا ہو گئی ۔ بھابی نے چوں بھی آواز نہ نکالی ۔۔ اُف بھابی نری گائے ہے ۔ نہیں گاؤں تو بہت اڑاتی ہے جب تک مہمان رہے میں اسکول سے سیدھی گھر آجاتی ۔ چادر ے کے اسکول کی اور بات تھی ۔یہاں باقاعدہ آٹھویں تک اسکول تھا۔ میں نے نزہت کو ساتویں میں داخل کر لیا۔ اور مکھن کو پہلی میں دو چار اور چھوٹے لڑکے بھی آتے تھے ۔

نزہت اور مکھن نے ایک دفعہ بھی نہ پوچھا کہ ماں باپ کہاں ہیں اور مینو تو بولنا ہی نہیں جانتی تھی ۔میں چھٹیاں عظیم بھائی کے ہاں ہی گذارتی اور پھر چادرہ میں ساتھ رہا تھا۔ بچے میرے

کمرے میں ہی سوتے تھے ۔ باپ ہمیشہ کے بیمار اور ماں تیماردار۔ بچے ماں باپ سے زیادہ میرے قریب تھے ۔

کبھی سوتے میں مکھن چونک کر "دادی" کو پکارنے لگتا ۔ ماں کو دلہن امی کہتا تھا ۔ میرا دل کانپ اٹھتا ۔ مگر کیا کر سکتی تھی ۔اماں نے نزہت کو لے جانا چاہا تو میں نے انکار کر دیا اور جھوٹ بول دیا کہ منے بھائی نے کہا ہے ۔اس کی پڑھائی کا نقصان ہو گا ۔

"تین بچوں کو سنبھال لو گی" میرا خیال تھا وہ مینو اور مکھن کو لے جائیں گی۔

"میں نے کہا ہاں"

"پھر بیچ میں واویلا نہ مچانا ۔ میں کسی کو لینے نہیں بھیجوں گی"

"نہیں اس کی ضرورت نہیں پڑے گی ۔اگر پڑی تو میں خود ہی پہنچا جاؤں گی۔ منے بھائی تو اچھے ہو کر آجائیں"

شادی کا ہنگامہ ختم ہو گیا مہمان رخصت ہو گئے ۔آپا نے کھانا پکانے کے لئے ایک لڑکا دے دیا۔

بریلی میں کس بلا کی غربت تھی ۔کوڑیوں میں نوکر ملتے تھے ۔ دن میں تین چار بابا باورچی دفتر میں حاضری دیتے ۔ مگر اسکول کی ایک غریب مائی تھی میں نے اُسے کوٹھی میں جگہ دے دی ۔مہتر وغیرہ تو تھے ہی ۔ایک چپراسی بھی تھا۔

مجیب اور حبیب بھی واپس واپس علی گڑھ جا چکے تھے ۔نیر کی خوب دعوتیں ہوئیں اور وہ بھی آنسو بہاتی انگلینڈ سدھاری ۔میں نے آپا سے کہا ۔

"میرے پاس آجاؤ آپا ۔یہاں بس منا (یعنی ان کی ساس) ہیں ۔جو صبح برقعہ سر پہ ڈال کے پڑوس میں نکل جاتی ہیں ۔ سارا دن اکیلی رہتی ہوں"

پہلے تو ٹال گئیں پھر میں نے نزہت کو لگا دیا ۔ان کے پیچھے وہ نزہت کو بہت چاہتی تھیں ۔ دلہن بھابی تو نادان تھیں ۔آپا اور اماں نے نزہت کو پالا تھا۔ آپا راضی ہو گئیں ۔ کچھ بستر ساتھ تھے میں نے اور خریدنا چاہے مگر آپا کے پاس درجنوں دریاں اور چادریں تھیں ۔

سارے برتن بھی انہیں نے دیئے میں تنخواہ انہیں دے دیتی ضرورت ہوتی ان سے پیسے مانگ لیتی۔ وہ ضرور اپنے پاس سے بھی خرچ کرتی ہوں گی۔ مہینے کے آخر میں جیب میں نئی تنخواہ دیتی تو وہ کچھ بچے ہوئے روپے پکڑا دیتیں۔ جو بہت ہوتے تھے۔ اور میں ادھر اُدھر خرچ کر دیتی۔ خرچ کی مجھے زیادہ عادت ہی نہیں تھی۔ پاس ہی ایک سینما ہال تھا کافی اچھا والا۔ مینجر کی لڑکی اسکول میں پڑھتی تھی۔ بہت منع کرنے پر بھی وہ ہر نئی فلم کے ٹکٹ بھجوا دیتے تھے۔ سو روپے بہت ہوتے تھے۔

مجھ سے پہلے جو ہیڈ مسٹرس تھیں وہ کافی بزرگ اور تجربہ کار تھیں حالانکہ انٹر پاس تھیں لیکن بہت سال کا تجربہ تھا۔ انہوں نے ابتدا میں اسکول کی بنیاد ڈالی تھی۔ مینجر صاحب نے انھیں اسکول نہیں چھوڑنے دیا۔ مسز مارکس بڑی سخت تھیں۔ اور مجھے ہیڈ مسٹرس صرف اس لئے بنانا پڑا تھا کہ اسکول کو چندہ دینے والوں کا اصرار تھا۔ مینجر صاحب نے مجھے بتا دیا تھا۔

"مسز مارکس بہت خفا ہیں ذرا اُن سے ہوشیار رہیئے گا۔ انسپکٹریس آف اسکولز مس فلپ سے اُن کے بڑے گہرے تعلقات ہیں، عیسائی ہیں نا۔"

نہ جانے میں سے کون سی رگ ٹیڑھی ہے کہ کوئی مذہب کا اڑنگا لگائے تو بہت جی جلتا ہے۔ قاعدہ سے اسکول کی بہتری کے لئے مسز مارکس کو ہیڈ مسٹرس ہونا چاہئے تھا، مگر وہ عیسائی تھیں۔

عجب ضدی طبیعت ہے بدقسمتی سے کہیں کوئی اچھی رائے بھی دے تو اس کا الٹا کرتی ہوں، خدا جانے کیوں؟ میں نے مسز مارکس سے چوکس رہنے کے بجائے ان سے بجد آداب سے بات کی۔ وہ آئیں تو میں کھڑی ہو گئی وہ گھبرا گئیں۔ سمجھیں شاید میں غصہ میں کھڑی ہو گئی ہوں۔ اور اب ان پر رعب جماؤں گی۔ "بیٹھئے" میں نے کہا۔

وہ منہ پھیلائے بیٹھ گئیں۔

"مسز مارکس، آپ جانتی ہیں نہ مجھے ہیڈ مسٹرس بننے کا تجربہ ہے نہ میں آفس رولز سمجھتی ہوں۔ آپ کی اور میری تنخواہ برابر ہے یہ زیادتی ہے خیر آپ کا قد ٹھ جمع ہے اور

میں یہاں مستقل رہنے والی نہیں ہوں۔ میرے پیر میں چکر ہے۔ میرا ارادہ اگلے سال ٹریننگ کے لئے باہر جانے کا ہے یہ اسکول آپ کا ہے آپ نے اسے زندگی دی ہے آپ سب کچھ جانتی ہیں۔ میں کچھ نہیں جانتی۔ میں جھوٹی شان کی قائل نہیں اور میں نے خود کو کبھی مغالطے میں نہیں رکھا۔ اگر آپ پوری مدد نہیں کریں گی تو یہ اسکول نہیں چل سکے گا اور میں استعفیٰ دے کر چل دوں گی۔ جودھپور میں میرا خاندان ہے مجھے خوشی سے قبول کر لے گا۔ اور کوئی دروازہ نہ ملا تو شادی بھی خاندان میں کر لوں گی۔ مگر میں اپنی زندگی فی الحال اپنی مرضی سے گذارنا چاہتی ہوں۔ میں گئی تو دوسری مسلمان ہیڈ مسٹرس آ جائے گی۔ آپ کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

مسز مارکس سناٹے میں رہ گئیں۔ میری آواز میں خوشامد یا زی کے بجائے تھوڑی سی دھمکی شامل تھی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آیا میں کیا بک رہی ہوں۔

"کسی نے میرے خلاف کان بھرے ہیں آپ کے۔" وہ ذرا اکھڑی آواز میں بولیں۔

"مسز مارکس اگر میرے کان کسی کا کہا سننے کے عادی ہوتے تو آج میں یہاں نہ ہوتی میں اپنی رائے خود قائم کرنے کی عادی ہوں۔"

"سنا ہے آپ کافی تجربہ کار اور غصہ ور ہیں۔ ہیڈ مسٹرس رہ چکی ہیں کسی ریاست میں؟"

"ہیڈ مسٹرس اور ریاست کے گرلز اسکول میں، ایک سال سے بھی کم۔"

"مجھے اس اسکول سے لگاؤ ہے ...... لڑکیوں کی تعلیم کی میں شدت سے حامی ہوں۔"

خاص طور سے مسلمان لڑکیوں سے تو آپ زیادہ ہی ہمدردی ہو گی کیونکہ وہ ہر قوم سے پیچھے ہیں۔"

"یہاں کرسچین لڑکیاں بھی پڑھتی ہیں۔"

مسز مارکس کم سے کم ہم عورتوں کو یہ ہندو مسلم کرسچین کے چکر میں نہیں پڑنا چاہئیے۔ ہم نے جو بھی علم حاصل کیا ہے وہ کرسچین ٹیچرس نے ہی بخشا ہمارے ملک کے زیادہ تر اسکول

کی بنیاد عیسائی استادوں نے رکھی۔ اور میرے استادوں نے کبھی میرے ساتھ دوسرے فرقہ کی طالبات سے مختلف برتاؤ روا نہیں رکھا۔ علم کی دولت بانٹتے وقت انہوں نے مجھے صرف طالب علم سمجھا۔ اس اسکول میں بھی زیادہ عیسائی استاد ہیں دو ہندو ہیں اور دو مسلمان، ایک میں اور ایک رضیہ بیگم جو سلائی وغیرہ سکھاتی ہیں۔"

اتنے میں اسکول کی گھنٹی بج گئی۔ دوسری استانیوں سے میرا مینجر صاحب نے تعارف کرا دیا تھا۔ اس دن ہم سب نے مل کر ساتھ کھانا کھایا۔ میں نے اپنا کھانا گھر سے نہیں منگوایا۔ سب کے کھانے چکھے۔

"آپ تو بالکل ہیڈ مسٹرس نہیں لگتیں"، مس لال جو سب سے کم سن اور بے تکی تھی بولی۔

"مینجر صاحب اور چپراسی کے سامنے فرسٹ کلاس ہیڈ مسٹرس لگتی ہوں۔ اور ہاں لڑکیوں کے سامنے میں کچھ لگنے کی کوشش نہیں کرتی۔"

"بہت ڈرتی ہیں آپ سے لڑکیاں۔"

"سچی بات تو یہ ہے کہ میں لڑکیوں سے ڈرتی ہوں۔ اس لئے چہرے پر رعب طاری کر لیتی ہوں سیلف ڈیفنس میں۔ یہاں کی اور بات ہے سب کے سامنے میں آپ سے بھی ڈروں گی۔ اور رعب طاری کر لوں گی ورنہ بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ کاش میں معائنہ کرنے آؤں تو ذرا ہوشیار رہیئے گا۔ اگر آپ اسی طرح ہنس دیں تو شامت آجائے گی۔" مس لال بڑی طرح ہنس رہی تھی، چپ ہو گئی۔ اس دن سے مسز مارکس نے مجھے تمام رجسٹروں کا اندراج سمجھایا۔ مجھ سے زیادہ تو دوسری ٹیچر جانتی تھیں چادر سے ایک رجسٹر تھا۔ اس میں لڑکیوں کے نام لکھے تھے۔ دو کمرے تھے۔ ایک میں سب چھوٹی بڑی امیرزادیاں اور کچھ افسروں کی بیٹیاں، صاحبزادیاں بنچوں پر بیٹھی تھیں جنہیں ایک میز کے پیچھے کرسی پر میں بیٹھتی تھی۔ دوسرے درجے میں نیچے کلاس کے کلرکوں وغیرہ کی نسبتاً غریب لڑکیاں بیٹھتی تھیں، جنہیں ایک بڑی بی قرآن کی تعلیم دیا کرتی تھیں۔

عجیب مسخرہ طریقہ تھا تعلیم کا۔ کچھ کو انگریزی حروف یاد تھے۔ کچھ لکھنا بھی جانتی تھیں کچھ تھوڑے انگریزی کے جملے بھی بول لیتی تھیں۔ ایک ہندو لڑکی چھٹی جماعت کا کورس پڑھ رہی تھی دو عیسائی لڑکیاں تیسری چوتھی کی پرائمر لاتی تھیں۔ میری سٹی گم ہو جاتی تھی کسی کو گنتی بھی نہیں آتی تھی۔

مگر سب کو انگریزی بولنے کا شوق تھا۔ تو بس میں انگریزی بولنا سکھاتی تھی۔ نہایت بدشوق اور کند ذہن لڑکیاں تھیں۔ صرف ایک لڑکی بلا کی ذہین اور طرار تھی۔ شہزادی بیگم بڑی ہنس مکھ، کلی کی طرح کھلتی ہوئی شکل۔ بے حد سج دھج کے آتی تھی۔ خوب گوٹے کے کپڑے جھمکے گلوبند، جو وہ ہر وقت پہننے کی عادی تھی۔ زیادہ تر کی منگنیاں ہو گئی تھیں چند کے نکاح بھی ہو گئے تھے۔ رخصت کی منتظر تھیں۔

شکر خدا کا کہ مجھ سے بہت ڈرتی تھیں۔

بریلی کی لڑکیاں ان سے لاکھ درجہ بہتر تھیں۔ اور انہیں پڑھنے کا بھی شوق تھا۔ مجھے پڑھانے سے ہمیشہ دلچسپی رہی۔

مینجر صاحب بھی میری کافی مدد کرتے تھے۔ اور پاس ہی جو لڑکیوں کا اسکول تھا اس کے ہیڈ ماسٹر صاحب بہت ہی خلیق انسان تھے۔ انہوں نے مجھے ایجوکیشن پر بہت سی کتابیں پڑھنے کو دیں۔

ایک دن مینجر صاحب نے کہا انسپکٹرس مس فلپس معائنہ کرنے آرہی ہیں۔

میں قطعی متاثر نہ ہوئی تو جل کر بولے۔

"میں نے کیا عرض کیا آپ نے سنا۔" وہ جب غصہ میں ہوتے تھے تو بڑے ادب سے بولنے لگتے تھے۔

"سوچ رہی ہوں مجھے کیا کرنا ہوگا۔" میں نے نہایت ٹھس انداز میں کہا۔

"ارے صاحب انسپکٹرس آرہی ہے اور آپ ......" مارے غصہ کے

وہ نیلے پڑ گئے۔

"تو آنے دیجئے"

"بس! آپ بھی حد کرتی ہیں!"

"آپ اطمینان رکھئے۔۔۔۔"

"خاک اطمینان رکھوں۔ اور اگر گرانٹ بند ہوگئی تو۔۔۔۔"

"منیجر صاحب کیا اسکول میں آپ نے کچھ بد انتظامی دیکھی، کلاسوں میں غسل کوڑا کرکٹ۔ لڑکیوں کی تعداد پہلے سے بڑھ گئی ہے ایک بنچ پر دو کو بٹھانا پڑتا ہے گھڑوں میں خود روز پانی بدلواتی ہوں"

"یہ کم بخت دفتر۔۔۔۔"

"کیا برائی پیدا کر دی میں نے دفتر میں"

"اوہ آپ سمجھتی نہیں۔ آپ کے پاس کچھ تصویریں ہیں"

"نمائش میں کھنچوائی تھیں"

"اوفوہ وہ آٹھ آنے کی چار والی دوا نچی نہیں۔ کچھ سنیریاں کیلنڈر اچھا آپ فکر نہ کیجئے میں بھجوا دوں گا۔ اور گلدان وغیرہ"

"یہاں بھی پھول بہت کھلتے ہیں جو گلدان ہوں گے آپ سے مالی کے لئے کہا"

"مالی!۔۔۔۔ یعنی مالی! آپ کو معلوم ہے یہ اسکول کیسے چلا رہا ہوں اس کے پیچھے میری وکالت ٹھپ ہوگئی۔ در در بھیک مانگوں یا موکلوں سے سر ماروں میری بیوی الگ میرا بھیجا چاٹتی ہے"

"تو پھر آپ نے رضیہ بیگم کو بیکار اسکول میں کیوں ٹھونس رکھا ہے۔ وہ کرتی کیا ہیں سر پکڑے بیٹھی رہتی ہیں"

"آپ۔۔۔۔ آپ بھی رضیہ بیگم کا طعنہ دے رہی ہیں۔ مجھے آپ سے یہ امید

نہ تھی۔ میرا خیال تھا تعلیم یافتہ عورتوں کو خبر جانے دیجئے جو جی چاہے کہئے میں نے جرم کیا۔ رضیہ کے میاں کے اولاد نہیں ہوئی تو کم بخت کو طلاق دے دی۔ کیا اسے رنڈی بن جانے دیتا۔ آپ ہی بتائیے اس کا کہاں ٹھکانہ ہے۔ کوٹھی کے ایک کونے میں پڑی ہے۔۔۔۔ پچیس روپیہ مہینہ میں اپنی جیب سے بھرتا ہوں۔ بیوی ہزاروں گالیاں دیتی ہے۔ محلہ والے ناک میں دم کرتے ہیں، وہ بدبخت سر پکڑ کے نہ بیٹھے گی تو کیا اس رچائے گی" ان کی بڑی بڑی خوفناک آنکھوں میں آنسو چھلک آئے" اور لوگ کہتے ہیں۔ وہ بدکار ہے۔ آپ کے ساتھ ہی رہتی ہے۔ آپ کہہ سکتی ہیں کہ وہ بدکار ہے اس کے پاس مرد آتے ہیں۔ میں چھپ چھپ کر آتا ہوں"

میرا دم گھٹنے لگا۔

"منیجر صاحب ایک بار مجھ پر بھروسہ کیجئے مس فلپس کو آنے دیجئے اس کے بعد یہ معاہدہ سال بھر کا۔۔۔۔ (میں نے دراز سے اپنا تقرری کاغذ نکال کر ان کے سامنے رکھ دیا) اپنے پاس رکھئے اسے پھاڑ دیجئے گا۔

منیجر صاحب کے جانے کے بعد مجھے رضیہ بیگم کا خیال ستانے لگا۔ ہندوستان کی تمام رضیہ بیگمیں میری نظروں کے سامنے گھوم گئیں۔ میرا خون کھولنے لگا در و دیوار پر غصہ آنے لگا۔

یہ وکیلوں کو گرلز اسکول بنانے کا خبط کیوں ہوتا ہے۔ پاپا میاں (شیخ عبداللہ بانی علی گڑھ گرلز کالج) نے بھی اپنی زندگی کا یہ سرمایہ گرلز اسکول کے پیچھے لگا دیا۔ اب یہ عبدالشکور کو بھی وہی مرض لاحق ہوگیا۔ انہیں انعام میں لعنت اور پھٹکار کے سوا کیا ملتا ہے یہی ایک طریقہ قوم کو ان کا احساس ماننے کا آتا ہے۔

میں نے ہیڈ ماسٹر صاحب کو لکھا کہ آج جمعہ ہے آدھے دن اسکول ہوگا۔ بڑا کرم ہو گا جو دس منٹ کے لئے مل جائیے۔ بے چارے فوراً آگئے۔ انہوں نے مالی کو حکم دیا کہ

بیس پچیس اچھے پھولوں والے گملے لاکر دو رویہ سجا دو چھ سات گلدانوں میں پھول لگا
کر کل صبح ہی سب کلاسوں میں پہنچا دینا۔ اور اسٹور سے کچھ نقشے کچھ سینریاں لاکر دفتر
میں ابھی سجا دو اور ہاں ایک اچھا سا قلمدان بھی لیتے آنا۔ اور میز پوش بھی ہرا والا یہاں ان
میز پر لگا دینا۔ یہ کام تو ابھی کردو۔ مالی اور چپراسی کے جانے کے بعد بولے۔

"ایک دستہ براؤن پیپر کا منگا کے ان رجسٹروں پر چڑھوا دیجئے۔ بہت بدرنگ
ہو رہے ہیں۔ کوئی فکر کی بات نہیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

سب ٹیچرز جٹ گئیں۔ مسز مارکس رجسٹر چیک کرنے لگیں کہ خانہ پری ہیں تو کہیں لڑائی
نہیں ہوئی۔ آفس خوب ٹھاٹ دار لگنے لگا۔ کلاسوں پر بھی رونق آگئی۔ اور پھولوں کے
گملوں سے تو بہار آگئی۔

مس فلپس نہایت سانولی پر بے انتہا سیکسی بھرے بھرے جسم کی گُرد بار خاتون تھیں
ناک نقشہ نہایت سبک اور آنکھیں بے انتہا ذہین اور جگمگاتی ہوئی۔ انہیں دیکھ کر نہ
جانے کیوں اجنتا کی بلیک پرنسس یاد آنے لگی۔ میرا دل بھرا ہوا تھا میں نے اسکول کی ابتر
حالت منیجر صاحب کی جدوجہد مسز مارکس اور ٹیچرز کے خلوص لڑکیوں کی تعلیم سے دلچسپی
اور ان کی مجبوریاں دل کھول کر ان کے سامنے رکھ دیں۔ میں نے اس وقت باقاعدہ لکھنا
شروع نہیں کیا تھا۔ مگر زبان ہمیشہ سے چلتی تھی۔

جب مس فلپس جانے لگیں تو آہستہ سے مجھے قریب بلا کر کہا۔

"آج شام کو میرے ہاں ایک پارٹی ہے، آنا پسند کریں گی"

"ضرور......"

"میں سید سے کہوں گی وہ آپ کو لیتے آئیں گے۔ یہی کوئی پانچ بجے۔"

سید صاحب ہمارے گھر کے قریب ہی رہتے تھے۔ ایک دن میں نے ہیڈ
ماسٹر صاحب سے کوئی کتاب منگوائی انہوں نے کہا ان کے پاس نہیں لائبریری میں

ملے گی۔ میں لائبریری کا ممبر نہیں سید صاحب جو آپ کے پڑوس میں رہتے ہیں ان
سے کہیئے وہ آپ کو بھی ممبر بنوا دیں گے۔

میں نے چپراسی کو پرچہ دے کر سید صاحب کے پاس بھیجا وہ خود ہی چلے آئے۔
نہایت رومانٹک شکل کے انگلینڈ ریٹرنڈ یاد نہیں کسی اچھے عہدے پر تھے
ان کی بیوی چھوٹی بی بے حد بھولی سی صورت کی بڑی ہنس مکھ بیوی تھیں دو چار ملاقاتوں
کے بعد وہ اکثر آنے لگے۔ بے حد گپیں مارتے۔ ہم دونوں قریب پارک میں ٹہلنے
بھی جاتے۔ ولایت میں کسی لڑکی سے عشق ہو گیا تھا۔ اس نے دل توڑ دیا، بے حد
غمگین اشعار یاد تھے۔ آنکھوں میں رس بھر کے عجیب طرح سے شعر پڑھتے تھے
کہ لگتا تھا مجھے مخاطب کر رہے ہیں۔ کبھی رومینٹک سا ظالم ڈرامہ چیکا کر کہہ جاتے۔
میں نے قطعی نوٹس نہیں لیا کیونکہ اول تو مجھے ان سے عشق عاشقی کا رشتہ جوڑنے سے
دلچسپی نہیں تھی، دوسرے مجھے آہیں بھر بھر کے شعر پڑھنے میٹھی میٹھی نگاہوں سے دیکھنے
عاشق مزاج لوگ زہر لگتے ہیں۔ ہمارے خاندان میں جب عشق چلتا تھا تو ایک دوسرے
کی ٹانگ کھینچنے میں سبقت لے جانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ اور شعر تو میں نے
اپنے ماموں چچا اور بھائیوں کو پڑھتے ہی نہیں سنا۔ ہاں بڑے ابا خود شاعر تھے
ہم تو سمجھتے نہیں تھے، ان کی موجودگی میں تو ہمارے ابا جان ان کے شعر کان دبا کر
سن لیتے تھے۔ ان کے جانے کے بعد اطمینان کا سانس لیتے تھے۔

"بہت بور کرتے ہیں بھائی صاحب اور وزن سے گرے ہوئے غلط شعر کہتے
ہیں" بس بڑے ابا کے بعد سب شاعروں کو انہیں کی صف میں کھڑا کر دیا گیا۔

ایک دن بولے۔

"کبھی کسی سے عشق کیا ہے؟"

"سینکڑوں دفعہ" میں ڈینگ ماری۔

"ایں۔۔۔۔۔؟"

"کیوں کیا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ آپ نے جو کیا؟"

"ایک لڑکی سے کیا۔ زندگی میں ایک بار۔"

"بس، ایک دفعہ؟ پھر اور عشق نہیں کئے؟"

"کمال ہے۔ سچا عشق زندگی میں ایک ہی بار کیا جاتا ہے۔۔۔۔ محترمہ!"

"کیا سچ زندگی میں صرف ایک بار ہی بولا جاتا ہے؟"

"کیا الٹی بحث کرتی ہو۔ اُف سارا موڈ خراب کر دیا

"سوری!"

اتنے میں نوکر نے آکر کہا کھانا تیار ہے، بیوی بلاتی ہیں۔

"چلو آج تمہاری پسند کا گوبھی گوشت پکا ہے تم بھی چلو۔"

"نہیں آپا انتظار کریں گی۔"

"بھولا اُن سے کہہ آئے گا کہ ہمارے ہاں کھاؤ گی۔" بھولا میرے گھر کی طرف چل دیا۔

"مجھے بھی ایک بے حد زناٹے کا عشق ہو گیا تھا۔"

"اچھا۔ کب؟"

"کوئی دس گیارہ برس کی عمر میں۔"

"اوہ پپی لو۔"

"ارے نہیں تیرہ چودہ برس کی عمر تک چلا۔"

"اچھا، اُف کیا حالت ہوتی تھی۔"

"نہ پوچھیئے۔ شعر تو سمجھ میں آتے نہیں تھے۔ پر جو شعر ابھی آپ پڑھ رہے تھے وہی دل پر بیتتی تھی۔"

"اور محبوب؟"

"بائیس تئیس برس کا تھا۔ مغل شہزادہ بے حد سجیلا سنہری بال گچھے کے گچھے نیلی آنکھیں اتھاہ جھیلیں کہ انہیں جھانکنے والا بس ڈوبتا ہی چلا جائے۔ کیا گھوڑے پرتن کے بیٹھتا تھا اور باڑہ پھلانگتا تو کلیجہ منہ کو آجائے۔ ایک بات بتاؤں، کسی سے کہیں گے تو نہیں۔۔۔۔؟"

"لیکن؟"

"میں اسے دیکھ دیکھ کر گھنٹوں رویا کرتی تھی۔ دل دھائیں دھائیں دھڑکتا تھا۔"

"اور اس کا کیا حال تھا؟"

"اُسے خبر بھی نہیں تھی۔"

"ستیاناس یتری کی، لعنت ہے۔ تم نے حالِ دل کہا کیوں نہیں؟"

"ارے بڑا غصیل تھا۔ مجھ سے بارہ پندرہ برس بڑا چپتیں لگایا کرتا تھا۔"

"بھلے مانس اظہارِ عشق تو کیا ہوتا۔"

"ارے آپ نہیں جانتے ایسا جناتی غصہ تھا ہم سب بچے اس سے کانپتے تھے۔ اظہارِ عشق، بنہ وہ زور کا جھانپڑ مارتا کہ دانت حلق میں جا گرتے۔ ویسے خوابوں میں بڑا نرم ہو جاتا تھا، ٹھنڈی آہیں بھرتا کبھی میرا گھونگٹ اٹھاتا، کتنی بار آرسی مصحف کے وقت بیچ میں قرآن رکھا ہوتا۔ اور آئینے میں اس کی نیلی نیلی آنکھیں مسکرائیں اُف سارا جسم پسینے میں ڈوب جاتا۔

"پھر؟"

"پھر وہ چوتھی بار جب میٹرک میں فیل ہوا تو مبئی بھاگ گیا۔ سنا کسی ہیروئن سے شادی کر لی۔"

"کیا نام تھا؟"

"۔۔۔۔ادہ میرزادا ڈ دبیگ برلاس!"

"پھر ملاقات ہوئی؟"

"نہیں، ابھی تک تو نہیں ہوئی، مگر میرا دل کہتا ہے مرنے سے پہلے ایک بار ضرور وہ گہری گہری نیلی جھیلیں وہ ریشمی بال، وہ چوڑا سینہ۔ بس ایک بار اس کے شانے پر سر رکھ کر صرف دو آنسو بہا دوں گی اور کہوں گی۔ ارے کیا کہہ سکوں گی؟"

"قبلہ بھائی صاحب، چلیئے کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

اس دن سے سید صاحب مجھے ہمیشہ بھائی صاحب کہتے تھے۔

جب گھر پہنچے تو سید صاحب ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔ مجھے روکا مگر میں باورچی خانہ میں چلی گئی۔ چھوٹی بی چولہے کے پاس جھکی کچھ کر رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر کچھ بوکھلا گئیں۔ چمٹا میں کچھ پکڑے تھیں، وہ جلدی سے چھپا دیا۔ میں نے سلام کیا تو روکھا سا جواب دے کر منہ پھیر لیا۔

میں سمجھ گئی ان پر کیا بیت رہی ہے میں ان کے شوہر کے ساتھ پارک میں گھوم کر قہقہے لگاتی چلی آ رہی ہوں۔

"چھوٹی بی" میں نے پاس پیڑھی پر بیٹھ کر پکارا "وہ منہ موڑے رہیں "ارے ہو۔ آج آپ میرا بہت ادب کر رہی ہیں۔ وہ کچھ نہ بولیں" یہ چمٹے میں پکڑے کیا جلا رہی تھیں؟"

"کچھ ۔۔۔ کچھ نہیں" "چھوٹی بی۔ ایک راز کی بات ہے۔ کسی سے کہیں تو نہیں"

"راز کی بات۔ کیسا راز؟" "آپ کے میاں کو عشق ہو گیا ہے!"

وہ چونک کر میرا منہ تکنے لگیں۔

"اور آپ کچھ نہیں کہتیں؟"

"کیا کہہ سکتی ہوں میں کو ان سے کہہ چکی ہوں دوسری شادی کر لیں۔ بچہ میرے

نصیب میں نہیں"

مگر آپ کے بچہ ہوا تو تھا۔ جیا نہیں تو اس میں آپ کا کیا قصور آپ بانجھ نہیں مجھے اُن عورتوں سے سخت نفرت ہے جو پتی ورتا بن کر میاں کی شادی کرا دیتی ہیں۔ میری باجی کے بھی بچہ نہیں نہیں ہوا۔ انہوں نے بھتیجی گود لے لی۔ آپ کوئی بچہ کیا گود نہیں لے لیتی" "لیکن اگر انہیں کوئی دوسری پسند آ گئی ہے تو"

"تو آپ ان سے طلاق لے لیجیے" "ہائے اللہ، کیا دیوانوں جیسی باتیں کرتی ہو"

"اگر عورت ایک مرد سے زیادہ شوہر نہیں رکھ سکتی تو مرد کو بھی ایک سے زیادہ عورت رکھنا حرام ہے۔"

"کیا جہالت کی باتیں کر رہی ہو۔ مردوں کو چار ۔۔۔؟"

"میں اپنے میاں کو ہرگز چار نہیں کرنے دوں گی۔ فوراً طلاق لے لوں گی"

"اس کی پہلی بیوی ۔۔۔" وہ ہکلائیں۔

"جس کے پہلی بیوی ہو گی اس سے شادی کرنا میں بہت بُرا سمجھتی ہوں"

"مگر انہیں جو اس سے محبت ہے۔ میں انہیں دُکھی نہیں دیکھ سکتی"

"اُف جی چاہتا ہے تمہارا منہ توڑ دوں، کیا پرانی سڑی باتیں کر رہی ہو۔ اگر تم کسی اور مرد پر عاشق نہیں ۔۔۔" چھوٹی بی غصہ سے لال ہو گئیں "تو طلاق لے لو"

"تاکہ وہ اطمینان سے شادی کر سکیں"

"اُف یہ کیا کہہ گئی ہیں۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے لپک کر چمٹا اٹھایا اور اس میں چپکا تعویز لے کر آگ پر رکھ دیا" مولوی صاحب نے یہی کہا ہو گا کہ جوں ہی تعویز جلے گا۔ آپ کی نامراد رقیب بھسم ہو جائے گی"

تعویز جل کر راکھ ہو گیا اور میں بھسم نہیں ہوئی۔

"دیکھا چھوٹی بی بھسم نہیں ہوئی"

"تعویز گنڈے والے ٹھگ ہوتے ہیں"

"نہیں، یہ بہت پہنچا ہُوا معلوم ہوتا ہے۔ چھوٹی بی کیا تم مجھے اتنا بیوقوف سمجھتی ہو۔ کیا میں اندھی ہوں۔ تم مجھ سے اتنے پیار سے بولتی ہو، میرے لئے خربوزے کی برف بناتی ہو۔ آج میری پسند کے دہی کے بھندے بنائے ہیں۔ سچ بتاؤ کیا یہ اپنے میاں پر احسان کرنے کے لئے کرتی ہو یا......" مجھے غصہ آنے لگا۔

"اگر میں کسی مرد سے کھلے دل سے ملتی ہوں قہقہے لگاتی ہوں تو وہ مجھے ایسے کیوں دیکھنے لگتا ہے جیسے...... جیسے۔ اوہ تمہیں کیا بتاؤں۔ مجھے مردوں سے بے تکلفی سے ہنسنے بولنے میں کوئی عار محسوس نہیں ہوتا۔ میرا اتنا بڑا خاندان ہے۔ بہت سے نوجوان لڑکے ہیں، ہم آپس میں لڑتے ہیں جھگڑتے ہیں، بحثیں کرتے ہیں۔ اسی لئے یہ تو میری عادت ہے مجھے ذہین حاضر جواب دلچسپ مرد بہت پسند ہیں۔ تیز طرار منہ پھٹ لڑکیوں سے بھی میری بڑی گاڑھی چھنتی ہے۔ مس فلپس کے بوائے فرینڈ پرتھوی سنگھ سے میری جملہ بازی چلتی ہے۔ وہ میری لیگ پلنگ کرتا ہے میں اس کی۔ مس فلپس قہقہے لگاتی ہے۔ ان سے میری ایک دن پرتھوی سنگھ کے بارے میں بات ہوئی کہنے لگیں "بڑی پتی ورتا اور اَن پڑھ بے زبان عورت ہے پرتھوی بڑا دلچسپ قسم کی دوستی ہے۔ لوگ جو چاہیں سمجھیں میں پروا نہیں کرتی۔"

"ارے مس فلپس تو اس کے سنگ سوتی ہے"

"اُونھ آپ کی بلا سے آپ کے سنگ تو نہیں سوتی۔ اور چھوٹی بی کیا ثبوت ہے جب سید صاحب چلے جاتے ہیں تو آپ چھوٹے خال کے ساتھ...."

انہوں نے چولہے میں سے چیلا اٹھایا، اور ہم دونوں ہنسنے لگے۔

"ارے بھئی کیا آج بھوکا ہی مارنے کا ارادہ ہے" سید صاحب نے ہانک لگائی

کھانا بے حد مزے کا تھا۔ میرے دماغ میں خاندانی بدذاتی کا کیڑا رینگا۔

"ارے سید صاحب آپ کو معلوم ہے پرنسپل صاحب بیچارے۔ چہ چہ"

"کیا ہُوا انہیں؟"

"بال بچوں والا آدمی، بیوی کا پاؤں بھر بھاری ہے۔ اور بیچارا.... چہ چہ.... سمجھ میں نہیں آتا کیا ہوگا۔ غریب روز میرے پاس آکر روتا ہے"

"کون صدیقی، کیا باتیں کر رہی ہو۔ وہ تو.... مگر روتا کیوں ہے"

"آپ کو نہیں معلوم.... مگر آپ کو معلوم بھی ہو تو، خدا قسم کیا جگر ہے۔ آپ رہ ہی کیا سکتے ہیں"

"کیا بکواس کر رہی ہو جانے"

"آپ بنیے مت جیسے آپ کو پتہ ہی نہیں۔ عشق اور مشک، کہیں چھپتا ہے۔ مگر یہ محترمہ دیکھنے میں کیا بھولی شکل کی تو یہ۔ مگر سینے میں دل نہیں پتھر" میں نے تنکا پتا چھوٹی بی کو گھورا وہ ہکا بکا رہ گئیں۔

"تم.... تمہارا دماغ تو سلامت ہے رہیں...." چھوٹی بی غصہ سے آگ بگولہ ہو گئیں۔

"اُفوہ تو تمہارا کیا قصور تمہاری صورت کسی کو لوٹ لے گی۔ تو اس میں تمہارا کیا قصور اور ستم یہ کہ تمہیں پتہ بھی نہیں کہ صدیقی صاحب نیم پاگل ہو رہے ہیں"

"کس نے کہا؟" سید صاحب کے حلق میں نوالہ اٹکنے لگا۔

"بیچارے نے خود روز حالِ دل سنانے آتے ہیں۔ دیکھیے سید صاحب شریف آدمی ہے۔ زبان سے یا اشارے کنایہ سے کبھی کسی کو پتہ چلنے نہ دیا۔ وہ ایک نیک پارسا اور مقدس خاتون کو بدنام نہیں کرنا چاہتے"

"تم سے خود صدیقی نے کہا"

"ہاں، روز آتے ہیں شام کو" بیچارے مجھے ایجوکیشن کے متعلق مختلف نوٹس

دینے آتے تھے۔

"ہاں دیکھا تو ہے کئی بار۔ مگر۔ ۔ ۔ ۔" وہ بھنّائے۔

"دیکھئے سید صاحب وہ شریف آدمی ہیں۔ اگر آپ غنڈہ گردی پر اُتر آئے تو معاملہ بگڑ جائے گا۔"

"مگر آپ گواہ ہیں۔"

"میں؟ ۔ ۔ ۔ ۔ بھئی میں صاف مکر جاؤں گی۔ اگر آپ نے پوچھ گچھ کی حماقت کی تو فساد کھڑا ہو جائے گا۔ میں تو چھٹیاں ہوتے ہی اُڑ جاؤں گی۔ اگر بات پھیلی تو آپ کی ہی بدنامی ہوگی۔"

سید صاحب کا منہ فق تھا۔ مگر چھوٹی بی کے چہرے پر ناگواری کے بجائے عجیب سا تاثر تھا۔ کچھ حیرت کچھ بناوٹی غصہ!

اس دن کے بعد نہ جانے کیا بات تھی کہ سید صاحب میں اور چھوٹی بی زیادہ وقت ساتھ ہی گذارتے ہم دونوں بکواس کرتے رہتے وہ ہماری خاطر میں کرتی رہتیں آپا بھی جب وہ اکیلے آتے تھے تو بے حد کھڑی باتیں کرتی تھیں۔ چھوٹی بی کے ساتھ آنے لگے تو بے حد نرم پڑ گئیں۔

میں جب بریلی سے علی گڑھ جانے لگی تو خوب دعوتیں ہوئیں۔ جن میں صدیقی صاحب اور چھوٹی بی شریک ہوئے۔ میں نے کبھی کسی کو اس پھلجھڑی کی تفصیل نہیں بتائی جو میں نے بغیر کسی پلان کے بے ساختہ چھوڑ دی تھی۔"

میری ضیاء سے ملاقات عجیب افسانوی انداز میں ہوئی جبکہ اس قسم کے افسانوں کی حد دن کو میں اپنی دانست میں پار کر چکی تھی۔ ظفر قریشی جن سے یوں ہی اچٹتی ہوئی ملاقات شاہد احمد دہلوی کے ہاں ہوئی تھی۔ جو دھپور جانے کے دنوں میں پہلے علی گڑھ پھر وہاں سے دہلی جاتی۔ دو چار دن وہاں رہ کر جودھپور روانہ ہو جاتی۔ انہیں معلوم تھا کہ میں لکھنؤ میں پڑھ رہی ہوں۔ وہ اکثر کتابیں بھیجا کرتے کسی اچھے مضمون کا تراشہ بھی بھیجا

کرتے۔ انہوں نے میرا پتہ نہ جانے کسی انگریزی میگزین میں چھپوا دیا۔

میرے پاس بہت سے خط آنے لگے۔ نہایت واہیات قسم کی تصویریں اور مغلظات ہیں تے انہیں ڈانٹ بتائی کہ میرا پتہ فوراً بدلوائیں۔ اور کوئی جھوٹا پتہ لکھ دیں پھر میں نے خود ہی اس میگزین کو اپنا نہایت پیچ دار غلط سلط پتہ بھیج دیا۔ اس طرح ان خطوط سے میرا پیچھا چھوٹا۔ اور ظفر قریشی سے بھی خط و کتابت بند ہو گئی۔

اس بات کو سال سے زیادہ گزر گیا میں جاورہ سے بریلی آ گئی تھی کہ ایک دن مجھے ایک نہایت خوبصورت لفافہ میں بے حد عمدہ ٹائپ کیا ہوا بڑا مہذب سا خط ملا۔ میں نے جواب نہیں دیا تو شعلہ طور کی ایک جلد ملی۔ میں نے شکریہ کا خط لکھ دیا۔ ضیاء کے خط روز آنے لگے۔ ان میں شاعروں کا ذکر ہوتا۔ خاص طور پر جگر مراد آبادی اور مجاز کا کہ وہ ان کے بڑے عزیز دوست ہیں اور جگر صاحب پیر و مرشد۔ پھر انگارے کے بارے میں ہماری خط و کتابت ہوتی رہی۔

میں بھی ہفتہ میں دو خط لکھنے لگی۔ ہماری خط و کتابت انگریزی میں چلتی رہی کچھ دن بعد انہوں نے لکھا کہ انہیں بریلی میں کچھ کام ہے دو دن ٹھہریں گے۔ اگر میں انہیں اسٹیشن پر مل جاؤں تو ساتھ لنچ کھائیں گے۔ مگر ہم ایک دوسرے کو پہچانیں گے کیسے!

ضیاء نے بڑی سادگی سے لکھا کہ وہ گیارہ بجے کی گاڑی سے پہنچیں گے اور فرسٹ کلاس کے ڈبہ سے سرمئی سوٹ میں اتریں گے۔ ان کے ہاتھ میں اخبار ہوگا۔ اور میرے ہاتھ میں گلاب کا پھول ہوگا اور میں فیروزی ساڑھی پہنے ہوں گی تو ہم ایک دوسرے کو پہچان لیں گے۔

میں نے اسی سال اپنا پہلا ڈرامہ "فسادی" لکھا تھا جو ساقی کے سالنامے میں خاصے اہتمام سے چھپا تھا اور ایک کہانی "نیرا" بھیج چکی تھی ساقی کے لئے تیسری کہانی "گیندا" قریب ختم تھی نہ جانے میں نے کیوں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اور سمجھتی تھی کہ شاہد صاحب

چونکہ عظیم بھائی کے دوست تھے، مروت میں چھاپ دیتے ہیں۔ لیکن جب ان کے تقاضے کے خط آئے تو میں نے اور لکھنے کی کوشش کی اور چونکہ "گیندا" میں نے "نئے ادب" کو بھیج دی تھی۔ جو ان دنوں شاید لکھنؤ سے نکلتا تھا۔

ایک تو کام کی ذمہ داریاں پھر پارٹیاں، دعوتیں، سینما، کتنے ہی چکر تھے۔ پھر پڑھنے کی عادت کہ رات کو بغیر کتاب ہاتھ میں پکڑے نیند ہی نہیں آتی۔ آج بھی میں خواہ رات کے کتنے بج جائیں، خواہ لکھنے کا کام جاری ہو سونے سے پہلے دانت مانجھ کر کوئی کتاب ضرور پڑھتی ہوں۔ چاہے وہ میرے نواسے کی کامکس ہی کیوں نہ ہو۔

پھر بھی مجھے لکھنے میں ایسا ہی لطف آنے لگا جیسے پڑھنے میں آتا ہے۔ ہمارا سارا خاندان ہی باتونی ہے اور میرا نمبر کچھ زیادہ بولنے والوں میں آتا ہے۔ لکھتے وقت مجھے ایسا لگتا جیسے پڑھنے والے سامنے بیٹھے ہیں۔ ان سے باتیں کر رہی ہوں اور وہ سن رہے ہیں۔ کچھ میرے ہم خیال ہیں، کچھ معترض ہیں، کچھ مسکرا رہے ہیں۔ کچھ غصہ ہو رہے ہیں۔ کچھ واقعی جی جل رہا ہے۔ اب بھی میں لکھتی ہوں تو یہی احساس چھایا رہتا ہے کہ باتیں کر رہی ہوں۔ لوگ باتوں میں قصے سناتے ہیں ویسے میں بھی کسی واقعہ کو سنا رہی ہوں جیسے لوگ ساتھ میں اپنی رائے بھی چپکاتے جاتے ہیں، ویسے میں بھی کہانی کے کردار اور واقعات پر رائے زنی کرتی جاتی ہوں۔

یہ لیجئے بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ میرے پاس کوئی نیلی ساڑھی نہیں تھی اور صرف شناخت کے لئے نئی ساڑھی خریدنا حماقت معلوم ہوا۔ اور گلاب کے پھول اسکول کے باغیچہ میں نہایت بھسنڈی قسم کے کھلے تھے۔ پھول پکڑے ملکہ نور جہاں تک احمق لگتی۔ اور گیندے کے پھولوں کی خوشبو سے سر میں درد ہونے لگتا تھا۔ آپا کی کیاریاں بڑی سیوا کے بعد دو مرگھلے بیمارسے کاسنی رنگ کے کسی انگریزی نسل کے پھول کھلے تھے۔ اول تو انہیں توڑنا جان پر کھیلنے سے کم نہ تھا۔ آپا صبح شام ان کو وضو کا متبرک پانی پلاتی تھیں۔ دوسرے وہ توڑنے کے بعد اگر گلدستے میں پانی ڈال کر نہ سجائے جائیں تو دو

منٹ میں نڈھال ہو کر گردن ڈال دیتے تھے۔ اب میں اتنی بھی نٹنے میں چور نہ تھی کہ گلدان لے کر ہیرو کی جستجو میں اسٹیشن کا پلیٹ فارم ناپتی۔ مگر فرسٹ کلاس سے جو سرمئی سوٹ پہنے اخبار ہاتھ میں لئے اترا۔ اسے دیکھ کر میں نمک کا کھمبا بن گئی۔ بالکل ہو بہو جگنو، وہی بے حد گھونگر والے ڈھیروں بال مچی مچی سی آنکھیں کھلا دہانہ گورا گندمی رنگ۔ پر آخری بار جگنو کو دیکھا تھا تو دبلے تھے بس جسم بھر گیا تھا۔ بے حد سلیقے سے۔

میں ایسے سناٹے میں انہیں دیکھ رہی تھی کہ ضیاء مسکراتے ہوئے سیدھے میری طرف بڑھے۔ "آداب عرض"

"آداب عرض"۔ نہیں یہ جگنو نہیں ضیاء تھے۔ جن کی مسکراہٹ میں غضب نہیں اعتماد تھا ہم دونوں فوراً بے تکلفی سے باتیں کرتے ویٹنگ روم کی طرف بڑھ گئے۔ میں نے نیلی ساڑھی اور گلاب کے پھول کی روداد سنائی تو ضیاء نے اتنی زور سے قہقہے لگائے کہ پلیٹ فارم پر لوگ چونک پڑے۔ اتنے اونچے قہقہے صرف ابا میاں کی محفلوں میں ان کے دوست احباب لگایا کرتے تھے، یا بہت سال ہوئے ایسا قہقہہ میں نے اپنے باورچی خانہ میں سالن بھونتے ہوئے سنا تھا اور یہ قہقہہ نمبر ۵ انڈس کورٹ سے آ رہا تھا جس کے باورچی خانہ کی کھڑکی میرے سامنے تھی۔ اس قہقہہ نے کتنی پرانی یادیں جگا دیں۔ بمبئی میں لوگ دل کھول کر اس دھماکے سے نہیں ہنستے کہ پڑوسی چونک پڑیں۔

مجھے تجسس نے بہت اکسایا تو نمبر ۵ جس میں راج بیدی رہتے ہیں جانا پڑا۔

"ارے بھئی راج یہ تمہارے ہاں کون اتنے جاندار قہقہے لگا رہا ہے"۔ میں نے بولے سے پوچھا۔

اور قہقہہ میرے سامنے کھڑا تھا۔ گورا چٹا، گھنے سیاہ بال، بھرا ہوا جسم" یہ موہن راکیش ہیں" ساریکا کے ایڈیٹر۔

"خوب اپنی آمد کی اطلاع آپ پاس پڑوس والوں کو اس انداز سے دیتے ہیں"

اور موہن زاکینی نے پھر شاہی قہقہہ لگایا۔ ایسا لگا میں انہیں برسوں سے جانتی ہوں۔

اُف میں ضیاء کے ذکر پر تو یوں کتنی کیوں کاٹنے لگتی ہوں۔

لنچ ہم نے اسٹیشن کے ریسٹوران میں کھایا، پھر تانگہ میں بیٹھ کر اِدھر اُدھر گھومتے رہے۔ لائبریری میں جا بیٹھے۔ ضیاء کو ہزاروں شعر ازبر تھے۔ میر۔ ذوق۔ غالب۔ سودا۔ اقبال۔ جوش۔ جگر۔ اختر شیرانی۔ مجاز کے اشعار مجھے نہایت معمولی باتیں حرف بہ حرف یاد رہتی ہیں۔ خصوصاً مکالمے بار بار کان میں گونجا کرتے ہیں لیکن اشعار بڑی مشکل سے یاد رہتے ہیں۔ ان کے معنی یاد رہ جاتے ہیں، میں انہیں معنی یاد دلاتی۔

"وہ کیا شعر ہے غالب کا، ہوتا ہے تماشا ۔۔۔۔؟"

بازیچۂ اطفال ہے دنیا میرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشہ میرے آگے

ضیاء، فوراً شعر ہی نہیں پوری غزل سنا دیتے۔

"اور وہ مریم کا بیٹا، کیا ہے وہ ۔۔۔۔۔" میں نہایت غیر شاعرانہ انداز میں پوچھتی۔

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی

"اور وہ جنت سے نکالے جانے پر ۔۔۔۔۔۔۔" میں نہایت پھوہڑپن سے پوچھتی۔

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بڑے بے آبرو ہو کر ۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

"ترے کوچے سے ہم نکلے۔" میں نے اپنی یادداشت پر خود کو شاباش دی۔

"اسکول کالج میں بیت بازی میں کوئی پارٹی مجھے لینے پر ہنسی خوشی راضی نہیں ہوتی تھی کیونکہ مجھ پر آ کر ہمیشہ پارٹی کی ہار ہوتی تھی۔

"آپ نے کبھی عشق کیا ہے؟" وہی ترپ کا اکّا۔ جی چاہا وہی جواب دوں۔ ہاں ہزاروں

مرتبہ، میں بے انتہا زود اثر ہوں۔ بڑی شدت سے حملہ ہوتا ہے۔ چند گھنٹوں کی صحبت میں ہی ایسا لگ رہا تھا برسوں سے ضیاء کو جانتی ہوں اور اس جنم بھر میں جانتی رہوں گی اگلے جنم کا کیا بھروسہ۔ خاندان والوں اور دوست احباب کا اندازہ ہے کہ موجودہ جنم کے اطوار دیکھتے ہوئے بندر یا بلّی کے روپ میں اگلا جنم ہوگا۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں مجھے ان دونوں جانوروں سے ہمیشہ انس رہا ہے۔ اور زمانہ کا مقابلہ کرنے کے لئے ان کی کچھ صفات کام آجاتی ہیں۔ بندر کی چالاکی اور بلّی کا اندازِ مدافعت میں نے یونہی داؤ دیہاتی کا ذکر کیا۔

"بچالو" انہوں نے حقارت سے ٹھکرا دیا۔

"بالکل یہی رائے سید صاحب کی ہے۔"

"کون سید صاحب وہ ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ میں ڈپٹی انسپکٹر؟"

"آپ جانتے ہیں؟"

"ہاں بہت اچھا گاتے ہیں۔"

"تو بس یہاں کا کھانا ان کے یہاں؟"

"نہیں، آج کا ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا جائے گا۔ ہاں تو بس اور کوئی بھرپور محبت کوئی دل کا داغ، کچھ ٹھنڈی آہیں۔ وہ آپ کے کزن جن کا آپ نے کئی خطوں میں ذکر کیا۔ وہ بمبئی میں ڈاکٹر ہیں" "اوہ جگنو۔"

ہاں ہاں۔ ان سے تو بچپن سے لیلیٰ مجنوں والا معاملہ رہا ہوگا۔

"خاک" "اندھیرے اجالے پکڑ دھکڑ، دو چار میٹھے پیار؟"

"کبھی نہیں۔"

"آپ کے چہرے کا رنگ کہہ رہا ہے کہ جھوٹ بول رہی ہیں۔"

"نہیں، اس وقت جھوٹ کا موڈ نہیں بلکہ مجھے تو شکایت ہے۔"

"بڑا بدمذاق آدمی ہے۔ آپ کو اس سے محبت ہے؟"

"یہ بھی پتہ نہیں۔ میں آج کل سائیکالوجی پر بہت پڑھ رہی ہوں اور خود اپنی اینالسس کر رہی ہوں۔ یہ کچھ پتہ چلا"

"یہی کہ بہت بچپن سے دماغ میں یہ بیٹھ گیا کہ جسمانی پیار گندہ ہے۔" "اوفوہ مگر اب تو بچپن گیا، اور ۔ ۔ ۔ ۔"

"پھر ایک اور بھوت سوار ہو گیا کہ سب کہتے ہیں تعلیم پا کر لڑکیاں آوارہ ہو جاتی ہیں میں یہ ثابت کرنے کی دُھن میں لگی ہوں کہ یہ غلط ہے۔" "اور ذہنی چوکیدار بٹھا دیئے ہیں"

"ہاں اور ان کو بڑی تنخواہ دے رہی ہوں"

"آپ کو کبھی کسی نے پیار نہیں کیا"

"ایک دفعہ ایک چھوٹے سے بدذات کزن نے کیا تھا"

"گال پر" "نہیں ہونٹوں پر" "کیا محسوس ہوا"

"سناٹے میں رہ گئی ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اُف مجھے اس سے ڈر لگنے لگا تھا"

"پکڑ لیا۔ ہاتھ ملاؤ" "کیا پکڑ لیا؟"

"یہ ڈرامر فسادی جھوٹ بولنے سے کوئی فائدہ نہیں۔

"مکر و مت" "میں کہاں مکر رہی ہوں"

"کیا اب بھی جسمانی پیار کو گندہ سمجھتی ہو"

"نہیں بلکہ اسے ایک ذہنی بیماری سمجھتی ہوں جو ماحول کی پیداوار ہے میں نے بہت عورتوں سے پڑھنے کے بعد تجربہ کے لئے سوال کئے۔ آج تک مجھے کوئی ایسی عورت نہیں ملی جس نے اقرار کیا ہو کہ جسمانی ملاپ میں اسے لذت ملتی ہے۔ سب یہی کہتی ہیں کہ ان کے شوہر ان کی جان کو لگے رہتے ہیں"

"بدنصیب شوہر" ایک دم ضیاد کا چہرہ اُتر گیا۔ "پھر اگر شوہر دوسری عورتوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو ان کا کیا قصور، ایسی بیویوں سے تو رنڈیاں اچھی"۔

"مگر مجھے ایک رنڈی نے بتایا کہ اسے اس فعل سے گھن آتی ہے۔ گاہک کو لبھانے

کے لئے وہ ایکٹنگ کرتی ہے۔"

ضیاد اٹھ کر بے چینی سے ٹہلنے لگے۔

"خدا کے لئے یہاں سے چلو ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔"

ہم باہر نکلے تو ایک دم موڈ بدل گیا۔ فٹ پاتھ پر ایک مداری کھڑا دونوں ہاتھوں میں دو گڑیاں پکڑے تماشہ دکھا رہا تھا۔

"اختو نے پکائیں بڑیاں بجنو نے پکائی دال"

"اختو کی بڑیاں جل گئیں بجنو کا بڑا احوال۔ جنگے لال لڑیں گے جن کے لال"

وہ دونوں گڑیوں کو آپس میں لڑانے لگا۔ چاروں طرف کھڑے بچے کلکاریاں مارنے لگے۔ ہمیں بھی بے اختیار ہنسی آگئی۔ وہ بار بار دہراتا اور گڑیوں کی اتنی دلچسپ کشتی دکھاتا کہ دیکھنے والے لوٹ پوٹ ہو جاتے۔

ضیاد نے جیب سے پانچ روپیہ کا نوٹ نکالا اور بازیگر کو دے کر جلدی سے مجھے گھسیٹ کر قریب کھڑے تانگے میں بیٹھ گئے۔ بازیگر ہکا بکا کبھی نوٹ کو کبھی ضیاد کو دیکھتا رہ گیا۔

ہم ایک سینما گھر میں گھس گئے۔ انگریزی کی کوئی فلم تھی۔ یاد نہیں کون سی تھی۔ ضیاد کا ہاتھ بار بار کرسی کے ہتھے پر رکھے ہوئے میرے ہاتھ سے چھو جاتا۔ اور پردہ سیمیں پر دھند چھا جاتی۔ ضیا کے ہاتھ بہت خوبصورت تھے۔ ملائم لمبی لمبی انگلیاں سڈول بادامی ناخون میں نے اتنے خوبصورت ہاتھ صرف ایک انسان کے دیکھے تھے، جگنو کے۔

"تم ڈاکٹر کیوں نہیں بنے" میں نے ضیاد سے پوچھا۔

"بس بنتے بنتے رہ گیا۔ شاعری کے چکر میں سائنس چھوڑ کر آرٹس لے لیا"

"ڈاکٹروں کی انگلیاں لمبی ہونا چاہئیں، اپریشن میں سہولت ہوتی ہے" "کیا جگنو کی انگلیاں لمبی ہیں"

"تمہیں کیسے معلوم؟" ہم نہ جانے کیسے ایک ہی دن میں آپ سے تم پر اتر آئے تھے۔

"تم نے۔"

"ارے میں نے تو جگنو کا ذکر بھی نہیں کیا۔"

پھر میرے ہاتھ دیکھ کر ڈاکٹر کیوں یاد آئے؟ تمہارے اوپر جگنو سوار ہے۔"

"اُفوہ قطعی نہیں، ہم ساتھ پلے بڑھے۔ بچپن میں میں اسے اپنا ساتواں بھائی سمجھتی تھی۔ بہت دن بعد معلوم ہوا کہ بڑے ماموں کا لڑکا ہے۔"

"یہ بھائی بنانے والی عادت نہایت فرسودہ ہے۔ جو عورتیں مردوں کو بہت بھلا بھائی کہتی ہیں، سخت آوارہ ہوتی ہیں۔" "میں نے تمہیں تو بھائی نہیں کہا۔"

"ذرا بھائی کہہ کے تو دیکھو۔" ضیاء نے میرے گلے پر پنجہ جما کر آہستہ سے دبا دیا، پھر ہاتھ سرک کر گال پر آ گیا۔

"شی" کسی نے ہماری کھسر پھسر سے چڑھ کر کہا اور ہم فرمان بردار بچوں کی طرح فلم دیکھنے لگے جس کا آگا پیچھا غلط ملط ہو گیا تھا۔

فلم کے بعد ایک ہوٹل میں کھانا کھانے لگے۔ بریلی کا بہترین ہوٹل، نہ جانے کیا نام تھا۔

کھانے کے بعد سیاست چھڑ گئی۔ ضیاء پکے پاکستانی میں کھری کانگریسی کچھ ہلکا گلابی رنگ بھی رشیدہ آپا کی صحبت میں جھلکنے لگا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ملک آزاد تھا تب کانگریس کمیونزم ہی لاگو کرے گی۔ کیونکہ گاندھی جی تو عام انسان کے رہنما ہیں۔ وہ ہریجنوں کو جینے کا حق دلائیں گے۔ سُنا ہے انہوں نے بھنگیوں کی بستی میں سب کے ساتھ کھانا کھایا، ان کے ساتھ بڑے لیڈر تھے۔ یہ انگریز چلے گئے تو ہندوستان بہشت بریں کا نمونہ بن جائے گا۔ قائد اعظمؒ ملک کا بٹوارہ کرنا چاہتے تھے۔ مسلم لیگ کا زور بڑھتا جا رہا ہے۔ بڑے بڑے تعلقدار اور نواب ان کے ہم نوا ہیں، لکھنؤ میں جب سے گاندھی جی کے درشن کئے تھے بیرونی مال استعمال کرنا چھوڑ دیا تھا۔ میری کھدر کی ساڑھیاں لکا

ریشم کی لگتی تھیں۔ مگر چار دن ہی میں بہتی جا سکتی تھیں ملک کے بٹوارے کا خیال انتہائی عجیب و غریب لگتا تھا کسی طرح یقین ہی نہیں آتا تھا کہ ایسا ہو سکتا تھا۔ لیکن دُبلے پتلے قائد اعظمؒ نے یہ کارنامہ کر دکھایا۔

ضیاء مجھے عجیب نظروں سے دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

"کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ غلط احساس نہیں کہ میں تمہیں بہت دن سے جانتا ہوں۔"

"کیسے جانتے ہو؟"

"مجاز نے ذکر کیا تھا۔ تم اس سے ملنے گئی تھیں اور کافی متاثر ہوئی تھیں۔"

"اُفوہ، ہاں تین سال ہوئے جب میں علی گڑھ میں تھی تو صفیہ کے ساتھ ملی تھی۔"

"بہت پسند ہے مجاز؟"

"بہت۔"

"شادی کا ارادہ ہے؟"

"کیا جسے پسند کیا جائے اس سے شادی بھی کی جائے؟ مجھے تو جگر صاحب بھی بے انتہا پسند۔ نیاز فتح پوری سے بے انتہا عقیدت ہے۔ پطرس میری جان ہیں۔"

"اور جگنو؟"

"جگنو بھی۔"

"جان ہیں؟"

"یہ تو ان کی شان میں گستاخی ہوگی۔ نہیں جگنو کے لئے دل میں الگ ہی خانہ ہے۔"

"دل ہے کہ کبوتروں کی کابک ہے۔"

"ہر دل کبوتروں کی کابک ہوتا ہے۔ مختلف خانوں میں ماں، باپ، بہن بھائی، یار دوست، استاد، ادیب، اور شاعر۔ میرے دل میں تو ایک خانہ اداکاروں کا یعنی ہمارے

پرانے باورچی کے لئے بھی ہے جب چھوٹی تھی تو باورچی خانہ میں ان کے پاس گھس
کر بیٹھ جاتی تھی۔ وہ ہانڈی بھونتے۔ اس میں سے گردہ نکال کر مجھے کھلاتے تھے چھوٹی
چھوٹی ٹکیاں گھی اور نمک ڈال کر میرے لئے پکاتے تھے اور دوسرے بچوں سے چھپا
کر مجھے کھلاتے تھے۔ سب بھائی بہنوں، رشتہ داروں کے لئے الگ ڈبے تھے
کوئی نیچے کوئی اوپر۔ اور کافی اوپر ایک خانہ میری پہلی سہیلی منگیا، کوچوان کی بیٹی کے لئے تھا۔

"تھا سے کیا مطلب؟"

"اس کا بیاہ ہو گیا تو بہت دور ہو گئی، پھر مجھے کچھ بیچ سمجھتی تھی۔ بڑی بہنوں سے
کھسر پھسر کرتی تھی۔ کہتی تھی تم کنواری ہو تم سے کیا بات کریں۔ بڑی اکڑتی تھی۔"

ضیا مسکرانے لگے۔

"ذرا سوچا ان سب سے شادی کر سکتی ہوں، اور خدا جانے ابھی کتنے نئے خانے
پیدا ہوں گے، کون کون آن بسے گا۔"

"اس کا مطلب ہے ابھی گنجائش ہے؟"

"قطعی۔"

"باقاعدہ عرضی دینی پڑے گی؟"

"نہیں، اور ہو سکتا ہے کہ عرضی نامنظور ہو جائے۔ کوئی رشوت سفارش کا دخل نہیں۔"

"خیر گنجائش تو ہے، اس لئے ناامید نہ ہونا چاہیئے۔ اوپر کے خانے میں یا نیچے۔"

"بیچ میں بھی۔ ہاں تو مجاز نے ذکر کیا تھا میرا؟"

"اس کے علاوہ تمہارے بھائی عظیم بیگ چغتائی کے ذریعہ سے بھی۔"

"ارے آپ ان سے مل چکے ہیں کہاں؟ دہلی میں۔"

ملاقات نہیں ہوئی۔ دراصل ایسا ہوا کہ ایک دفعہ یعنی چند مہینے ہوئے میرے والد
نے شادی کے لئے اشتہار دیا تھا تو چغتائی صاحب کا بھی خط آیا تھا۔ تم اس وقت
ان کے پاس ہی تھیں۔

"اوہ تو وہ جناب تھے۔ ہاں مجھ سے بھی انہوں نے ڈپٹی کلکٹر کا ذکر کیا تھا نام
نہیں بتایا تھا۔"

"اشتہار میں نام تھوڑی تھا۔ بڑے بڑے تعلقداروں کے خط آئے۔"

"دولہا دلہن کی اتنی قلت ہے ہندوستان میں اور پھر ڈپٹی کلکٹر تو راجہ ہوتا ہے
اگر رشوت لے تو کیا کہنے ہیں، رشوت لیتے ہو؟"

"ابھی تک تو موقع نہیں ملا۔"

"رشوت مت لینا۔"

"اگر کسی نوابزادی سے پالا پڑا تو ٹھاٹ باٹ کیسے بھگتے جائیں گے۔"

"بس تو گھر داماد بن جانا۔"

"اس کے بیٹے ۔۔۔۔"

"ارے کسی اچھے سے تھانیدار سے پار لگوا دینا۔ کسی ڈاکو کو چھوڑ دینا صفایا کر
دیں گے۔"

"تمہارے والد ڈپٹی کلکٹر تھے۔"

"بقول تمیم میرے والد اس معاملہ میں نہایت نکمے تھے۔"

"یہ تمیم صاحب؟"

"قطعی صاحب نہیں مجھ سے ڈیڑھ سال بڑے نہایت مزیدار انسان ہیں میرے
نمبر پانچ بھائی۔ چار دفعہ میٹرک کا امتحان دیا۔ محکمہ تعلیم کی بدقسمتی اور بے ایمانی سے
کامیاب نہ ہو سکے۔ اکثر کسی لکھ پتی کی اکلوتی بیٹی کو اغوا کرنے کے پلان بناتے رہتے
ہیں۔ فی الحال تو ناکامی سے ہی سابقہ پڑ رہا ہے۔ ہاں تو منے بھائی نے خط لکھا تھا۔"

"کہ وہ خود جج ہیں جاورہ اسٹیٹ میں، بڑے بھائی ریونیو سیکرٹری ہیں اور نواب صاحب
سے کچھ دور کا رشتہ ہے۔ ان کی عنایات شامل حال رہیں گی۔"

"نواب صاحب کی عنایات سے جان بچا کر میں جاورہ سے فرار ہوئی۔ پچھلے چند مہینوں میں بس تختہ لوٹ گیا۔ ننھے بھائی کو چوبیس گھنٹے کے اندر ریاست چھوڑ دینے کا حکم ملا۔ اور بڑے معتبر ذرائع سے پتہ چلا کہ منے بھائی کو ڈاکٹر غلط دوائیں دے رہا تھا۔ وہ میرج ٹی بی ہسپتال بھاگ گئے اور استعفا دے کر اب جودھپور آ گئے ہیں۔ بالکل بستر سے لگ گئے ہیں۔

"ایسی صورت میں تمہارا وہاں رہنا......"

"صورت کچھ زیادہ ہی مکروہ ہونے لگی۔ نواب صاحب نے مجھے اور میری گیارہ برس کی بھتیجی کو اپنی بیوی بنانے کا فیصلہ صادر کیا۔"

"او ہو تو یہ ٹھاٹ ہیں آپ کے! مگر........ نواب صاحب کی بہو"

"ہی اور یکی اور نہ سہی۔ یعنی ڈیڑھ عدد بیوی وہاں سے اسی رات سر پر پیر رکھ کر بھاگیں اور یہاں آ کر سورگ باش ہوئیں۔ لوگ مرنے کو سورگ باش کیوں کہتے ہیں حالانکہ بارہا انسان سورگ باش ہونے کے زرین مواقع پا سکتا ہے۔"

"ہندی کے الفاظ بہت زبان پر چڑھ گئے ہیں۔"

"آج کل میرے ایک مہربان آذنگا رناتھ شرما مجھے ہندو مائی تھولوجی پڑھا رہے ہیں۔"

"بڑے میاں تمہیں ہندو بنانے کے چکر میں ہوں گے۔"

"بڑے میاں نہیں نوجوان ہیں۔ کافی ہینڈسم، مجھے تو ڈر ہے کہ مجھے ہندو بنانے کے بجائے وہی نہ مشرف بہ اسلام ہو جائیں۔ پتہ ہے وہ میرے ہاتھ کا چھوا بڑے مزے سے کھا لیتے ہیں۔ بے حد روشن خیال ہیں۔ گوشت نہیں کھاتے مگر دستر خوان پر رکھا تو چھوت نہیں کرتے۔ بس ایک دن ایک نوالہ حلق سے اتار لیں تو کلیان ہو جائے۔"

"کچھ چکر معلوم ہوتا ہے۔"

"کسی بھی مرد سے دو باتیں کر لو، وہ چکر چلانے پہ مُصر ہو جاتا ہے۔ نہ جانے کیوں مرد عورت کا صرف ایک ہی استعمال جانتے ہیں؟"

"یعنی جنسی ملاپ۔"

"ہاں بس گھوم پھر کر کھونٹے پر لوٹ آتے ہیں۔"

"فرائیڈ کو پڑھا ہے؟"

"مگر مکمل ایمان نہ لا سکی کچھ فراڈ بھی ہے فرائیڈ میں ایک کج ہے میرے ذہن میں کتنا بھی عظیم انٹلکچوئل ہو، میں آنکھ موند کر ایمان لانے کی قائل نہیں۔ نہ جانے کیا عادتِ بد ہے کہ سب سے پہلے ان کے قول میں LOOP HOLE تلاش کرتی ہوں۔ موافقت سے پہلے ساری مخالفت کی دیکھ دیکھ کر لینا چاہیئے میں کسی بھی مقولے پر دھڑ سے ایمان لانے کی قائل نہیں پہلا لفظ میری زبان سے شاید کیوں۔ نکلا ہوگا۔ حالانکہ اس کیوں نے مجھے بڑی مار کھلائی ہے۔"

"کیا نکاح کے دو بول اتنے اہم ہیں؟"

"قطعی نہیں، خود میرے ابا نے جو اماں کے دیوانے تھے نہ جانے کس پیاس کی طلب میں ایک خاتون سے شادی کر لی تھی، شاید اس لئے کہ وہ اماں سے بالکل مختلف ہوں گی۔ صدیوں سے مرد نئے نئے ذائقوں کا مزہ لینے کا عادی بن چکا ہے۔ وہ تو میری بھولی بھالی جاہل ماں لوہے کی لاٹ ثابت ہوئیں اور سارے خاندان کو رشوت دے کر بھڑکا لیا۔ سب نے مل کر میرے سورما ابا کو چت کر دیا اور انہوں نے مہینہ بھر کے اندر طلاق دے دی۔ مگر میرے آوارہ دس نمبری چچا میاں ایک دھوبن بھگا لائے تھے۔ خاندان میں اسے کوئی مرتبہ نہ مل سکا۔ جبینہ زمین پر یا پیڑھی پر ذرا فاصلہ پر بیٹھتی تھی۔ چچا میاں کے علاوہ سب ہی کی چاکری کرتی تھی۔ اس کے بیٹے کے نام انہوں نے اپنا آبائی مکان کر دیا۔ اور اس کو لانے کے بعد کبھی کسی دوسری عورت کے پاس نہیں گئے۔ ایک دفعہ مزیدار

کھانا لگا نے پر خوش ہو کر بولے "بدھیا ننگ کیا مانگتی ہے۔ آج دریائے رحمت جوش میں ہے"۔ بدھیا نے لجاجت سے کہا "میاں جی نکاح کرلو یہ حرام نہیں جھیلا جاتا" بس چچا میاں نے جوتا اتار کر بلیتھن نکال دیا "حرامزادی ہم جنتا ہیں، نیچ دھوبن سے نکاح کر کے خاندان کو رسوا کر کے گئے"۔ میرے دل میں ان کی کوتاہ نظری کو چھوڑ کر اس قدر کی بڑی عزت ہے جو دراصل انہوں نے بدھیا کی جب کہ نکاح کر کے بھی بے وفائی کرنا مرد کا حق سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ مردانگی۔

"تمہیں ایسی محبت دینے والا ملے تو؟"

"تو زندگی چھلک اٹھے گی۔

ضیاء مجھے عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ یقینی میں نہایت جوش و خروش سے انہیں دعوت دے رہی تھی۔ خدا سمجھے میری زبان کو واقعی لگام نہیں۔

"دیوالی کی تین دن کی چھٹی ہے"

ہاں، سوچ رہی ہوں دو دن کی اور چھٹی لے لوں پھر اتوار پڑتا ہے۔ چھ دن کے لئے علی گڑھ کا چکر لگا آؤں"۔ بہت جی چاہ رہا ہے"

"لکھنؤ چلو نا"

"لکھنؤ" کالج چھوڑنے کے بعد لکھنؤ جانا ہی نہ ہو سکا تھا

ہاں بس دو دنوں کے لئے"

"خیال بُرا نہیں۔ آئی۔ ٹی کالج کی اکثر یاد ستاتی ہے"

"تو پھر طے ہے"

"قطعی"

"اسی طرح بارہ بجے کی گاڑی سے آؤں گا"

"میں اسٹیشن پہنچ جاؤں گی۔ سامان رکھ کر کہیں گھومنے چل دیں گے"

"اور شام کی گاڑی سے لکھنؤ واپسی میں مجھے بھی ایک دن کے لئے بریلی آنا ہے"

رات کو ہوٹل میں کھانا کھایا۔ باتوں میں دس بج گئے۔

"بہت دیر ہو گئی۔ آپا پریشان ہوں گی" میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ارے ابھی تو شام شروع ہوئی ہے"

"تم نہیں جانتے آپا کو ہول سوار ہو جاتے ہیں۔ سید صاحب اور منیجر صاحب کے پاس آدمی دوڑائیں گی۔ بریلی شہر میں میری ڈھنڈیا پڑ جائے گی۔ ویسے ہی تمہارے ساتھ گھومنے پھرنے پر چہ میگوئیاں ہو رہی ہوں گی"

"لوگوں کی بکواس کی پرواہ کرتی ہو؟"

"میں شہر کے اکلوتے مسلم گرلز اسکول کی ہیڈ مسٹرس ہوں میرے چال چلن رکھ رکھاؤ پر کتنی نظریں جمی ہوئی ہیں۔ میں نیم پاگل ہو سکتی ہوں مگر غیر ذمہ داری سے مجھے گھن آتی ہے۔ میں جانتی ہوں مسلم اسکول کن مشکلات کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اور مسلمان تعلیم یافتہ لڑکیوں پر قوم کی نظر کس امید میں پڑتی ہے کہ یہ ایک ٹیڑھا قدم اٹھائے تو پیروں تلے سے فرش کھینچ لو، میں قوم کی خصلت چٹکی بجانے میں نہ بدل سکتی ہوں نہ امید کرتی ہوں۔ ایک زمانہ چاہئے"

"رشید جہاں کو تو گرو مانتی ہو"

"ہاں مگر گرو کی ہر بات کی تقلید آنکھیں بند کر کے نہیں کرتی۔ میں اپنی عقل کے مطابق خود فیصلہ کرتی ہوں اور اسے گرو سے بغاوت کا نام نہیں دیتی میں بے حد جاہل تنگ خیال انسان کے وجود پر بھی شدت سے احتجاج نہیں کرتی۔ ہر انسان اپنے ماحول کا عکس ہوتا ہے۔ آخر ماحول کی گرفت میں قید ہوتا ہے۔ اسے دھکے دے کر گھسیٹ کر نہیں نکالا جا سکتا"

"روس کے کمیونزم کی بھی قائل ہو، مذہب پر جبریہ پابندی اور منہ پر تالے ڈالنے کی بھی قائل، تمہاری باتوں میں بڑا تضاد ہے"

"تضاد تو زندگی کی نشانی ہے۔ میں پیغمبر کا تاج محل تو ہوں نہیں کہ بس توازن ہی توازن ہو؟

میرے دماغ میں ان گنت سوالات آپس میں جوتم پیزار کرتے رہتے ہیں۔ انہیں سلجھانا الجھانا اور پھر سلجھانا ہی تو زندگی ہے۔ مجھے کھانے کپڑے کی فکر نہیں، آپا اتنی سلیقہ مند ہیں، وہ سب سنبھال لیتی بچپن میں بھی سو سو پیسے پر مار ا کرتی تھیں۔ اب بڑبڑاتی ہیں۔ کبھی ان سے نفرت تھی اور دعا مانگا کرتی تھی کہ اللہ کرے مر جائیں۔ اب سوچتی ہوں بریلی میں آپا نہ ہوتیں تو کیسے گذرتی ہوتی۔ دن بدن آپا کی قدر دل میں بڑھتی جا رہی ہے۔ ایک دن بولیں۔

تمہاری حرکتوں پر خون کھولتا ہے، مگر ٹال جاتی ہوں کہ بڑی استانی ہو۔ لڑکیوں کے سامنے بے عزتی سے رعب نہ رہے گا۔ ورنہ اب بھی تم نے جوتیاں کھانے کی باتیں نہیں چھوڑیں۔"

تعلیمِ نسواں، ایک وبال

پہلا گھنٹہ میں دفتر کے کام میں صرف کرتی دوسرا آٹھویں جماعت کو انگریزی پڑھانے میں تیسرا گھنٹہ حساب کا لینے کے بعد رضیہ بیگم کو قرآن اور دینیات کے لئے سپرد کر کے پھر آفس میں کلرک کو ضروری خطوں کے جواب دینے میں گزر جاتا۔

دفتر میں داخل ہوئی تو منیجر صاحب کو دیکھ کر دل دھک سے رہ گیا۔

پھر ایک دم غصہ چڑھنے لگا۔ میری نجی زندگی میں دخل انداز ہونے کا انہیں کوئی حق نہیں۔ میں قطعی جھگڑنے کے موڈ میں آ گئی۔

"آداب عرض" میں نے نہایت مصنوعی خوش مزاجی سے کہا۔

جواب ندارد۔

میں نے کتابیں میز پر پھینک دیں۔ منیجر صاحب نے چونک کر میری طرف دیکھا ان کے چہرے پر حسب دستور بارہ بج رہے تھے۔ وحشت زدہ آنکھیں کرش دامنز زبان پر کونین کی گولی رول رہے ہوں۔

"منیجر صاحب معاہدہ جب چاہیں توڑ سکتے ہیں، میں قطعی احتجاج نہیں کروں گی۔"

"جی!" انہوں نے جیسے کونین کی تہہ سے ابھرتے ہوئے کہا۔

"میں نے تو آپ سے کہہ دیا تھا میں ناتجربہ کار ہوں، اسکول ......"

"اوہ ...... مگر ...... مجھے آپ سے یہ امید نہیں تھی، میں سمجھتا تھا آپ مختلف ......"

"کیا، یعنی مختلف سے آپ کا مطلب ......؟"

"دیکھئے، میں بہت پریشان ہوں، میں آپ سے یہ کہنے آیا تھا، کہ اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو زاہدہ اور عابدہ کو، آپ اپنے ساتھ رکھ لیجئے۔"

"مگر یعنی، بات کیا ہے منیجر صاحب" میں ششدر رہ گئی میں قطعی اپنے چال چلن پر منیجر صاحب کا لیکچر سننے سے پہلے ہی اعلانِ جنگ کرنے کا ارادہ کر چکی تھی۔"

"سارا بریلی جانتا ہے تو آپ سے بھی میری بیگم صاحبہ نے دکھڑا رو دیا ہو گا۔"

"وہ بات یہ ہے کہ منیجر صاحب مجھے گھریلو جھگڑوں کی ایسی عادت سی پڑ چکی ہے کہ ایک آدھ بار کے بعد اگر وہی ریں ریں دہرائی جائے تو میں ایک دم بالکل اپنا سوئچ آف کر دیتی ہوں۔ بظاہرہ معلوم ہوتا ہے بڑے غور سے سن رہی ہوں۔ باقاعدہ چرچا اور تو بہ تو بہ کہتی ہوں مگر مقصد کچھ نہیں ہوتا۔ مگر مقصد کچھ نہیں ہوتا۔ بیگم صاحب اڑاتی رہتی ہیں کبوتریں نہ جانے کیا سوچتی رہتی ہوں مگر لڑکیوں کو میرے ہاں رکھنے کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔"

"میں اپنی بیٹیوں کو اعلیٰ تعلیم دینا چاہتا ہوں۔"

"آپ کی دونوں بیٹیاں نہایت ذہین اور پڑھنے کی شوقین ہیں کون روکتا ہے پڑھانے سے ...... ؟"

"مگر میری بیوی چاہتی ہیں کہ ان کی تعلیم میں روڑا اٹکانا تو مجھے کو دقت ہو گی۔"

"اوہ سمجھی، یعنی وہ بلیک میل کر رہی ہیں؟"

”ابھی ایک سرے سے پڑھانے کے ہی خلاف ہیں“

”آپ کا ہی چلانے کو کہتی ہوں گی۔ میں نے انہیں رضیہ بیگم کے بارے میں بہت سمجھایا۔ میرے خیال میں وہ رضیہ بیگم کو صرف آپ کو جلانے کے لئے بیچ میں لاتی ہیں اصل وجہ کچھ اور ہے“

”وجہ پیسہ ہے۔ یعنی پیسہ نہیں ہے، بس یہ شکایت ہے کہ اسکول کے پیچھے میں نے اپنی روزی کا خون کر دیا“

”مگر آپ اپنا سارا وقت تو اسکول میں نہیں صرف کرتے۔ میرے خیال میں آپ کو اتنی فکر نہ کرنا چاہیئے“

”فکر نہ کروں؟ آپ کو پتہ ہے۔ میرے اسکول کو آگ لگانے کی دھمکیاں دی جا رہی ہیں! لیز پر لی ہے یہ کوٹھی اور ملحقہ اسکول کی عمارت، ابھی تک فرنیچر کی قسطیں بھر رہا ہوں۔ پوچھئے کیسے؟“

میرے پوچھے بغیر وہ بولے۔

”میں نے محکمہ تعلیمات کو تمام خرچ پیش کر کے اسکول کے لئے گرانٹ لی۔ قرض کا ذکر نہیں کیا۔ مالک مکان، فرنیچر والے سے پوری رسیدیں لے کر نتھی کر دیں۔ تین ماہ کی تنخواہ کی رسیدیں اساتذہ سے پیشگی لے لیں“

”یعنی بغیر ادائیگی کئے“

”جی! اور یہ جرم ہے۔ فراڈ ہے۔ مگر مسز مارکس نے میری بڑی مدد کی۔ انہوں نے ہی تمام استانیاں مقرر کیں۔ بغیر تنخواہ تین مہینہ کام کرنے پر تیار کیا۔ اس کے بعد گھر گھر ہم لوگ چندہ مانگنے گئے اور کسی نہ کسی طرح سے گرانٹ بھی مل گئی اور اسکول چلنے لگا لیکن رجسٹر میں دکھائی ہوئی کافی رقم کی ادائیگی نہیں ہو پائی ہے۔ اف میں آپ کو کیسے بتاؤں کیا چکر ہے۔ آپ نہیں سمجھیں گی“ واقعی میں نہیں سمجھی منیجر صاحب نے خاصی بے ایمانی کر ڈالی۔ سارے رجسٹر رسیدیں جھوٹی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں وہ چندہ جمع کر کے کھا گئے

میری جی اُلجھنے لگا۔

”مگر لڑکیوں کو وہ یہاں رکھنے دیں گی“

”یہاں نہ رہ سکیں تو انہیں کہیں اور بھیجوں گا۔ وہ انہیں ہر وقت ڈانٹتی ہیں پڑھنے نہیں دیتیں۔ ہمارے لڑائی جھگڑوں سے بھی بچیاں پریشان ہوتی ہیں۔ چھوٹا ہے ہمارا گھر“

”آپ بچیوں کو بھیج دیں، آج ہی“

”بلکہ ابھی، ہاں میں فی بچی آپ کو تین روپیہ مہینہ دے دیا کروں گا“

تین روپیہ فی لڑکی! یعنی بورڈنگ میں تین روپیہ مہینہ! علی گڑھ میں تو سترہ روپیہ فیس تھی اور آئی۔ ٹی کالج میں سب ملا کر بیس روپیہ ہو جاتے تھے۔

”کیوں کیا کم ہے؟“

”منیجر صاحب تین روپیہ!“

”حساب لگا لیجئے۔ ایک روپیہ کا بیس سیر آٹا، دس سیر فی لڑکی بہت ہوگا۔ اور چھ پیسے سیر بڑے کا گوشت ہے۔ اگر پاؤ بھر بھی دونوں نے کھایا تو۔۔۔۔“

ڈیڑھ پیسہ روز“

”رہا گھی تو میری بچیوں کو تیل کی عادت ہے۔ دو سیر کھایا تو بھی کتنے کا ہوا“

”بارہ آنے کا گھی تیل کا بھاؤ مجھے معلوم تھا۔

”پاؤ بھر دودھ نہیں، بس چھٹانک بھر کافی ہوگا۔ چائے دیجیئے گا۔ اور پیسے کے دو بسکٹ دونوں کے لئے کافی پیٹ بھرا ہوتے یا باسی روٹی دے دیجئے گا“

”مگر پھر تو مجھے منافع ہی منافع ہو جائے گا“

”نہیں، لالٹین کا تیل، لکڑی کوئلہ میں اگلے مہینے سے بڑھا دوں گا، یہ پانچ روپیہ رکھئے شام کو ایک روپیہ بھجوا دوں گا“

”لکڑی ان کے لئے الگ سے تو جلے گی نہیں اور لالٹین بھی“

”بغیر بھی“

”یہ روپیہ آپ رکھئے۔ منیجر صاحب بچیاں بہت ذہین اور پیاری ہیں“

"خیر شام کو یا کل بھجوا دوں گا۔ تو انہیں ذرا بلا دیجئے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ انہیں آج ہی سے رکھ لیجئے، سامان بھجوا دوں گا۔ بستر کپڑے وغیرہ۔"

"مگر ایک شرط ہے مینجر صاحب۔"

"کیا؟ اور کوئی شرطیں باقی ہیں۔"

"جی ہاں، میں بچیوں کو رکھوں گی مگر پیسے نہیں لوں گی۔"

"نہیں، پیسے آپ کو لینا ہوں گے میں اپنی بچیوں کا بار آپ پر نہیں ڈال سکتا۔"

"مینجر صاحب دُنیا میں کوئی بچہ نہیں جو کسی بار ثابت ہو۔"

"نہیں ...... میں۔"

"مینجر صاحب آپ مجھے بہت تنخواہ دیں اور میں ٹرینڈ بھی نہیں۔ سو روپیہ بہت ہوتے ہیں، اور پھر مجھے آپ بڑی پابندی سے دیتے ہیں۔ ہاں تو طے ہے۔"

"مگر۔"

"دیکھئے، فضول بحث سے فائدہ نہیں۔ چھ روپیہ پورے خرچ نہیں ہوتے اور میں آپ سے منافع لینے کے لئے تیار نہیں۔"

"آپ مجھے شرمندہ کر رہی ہیں" ان کے چہرے پر کرب طاری ہو گیا۔ میرا بھی گلا بھر آیا۔ میں نے گھنٹی بجائی۔ ماما آئی تو میں نے کہا "زاہدہ، عابدہ کو بھیج دو اور تم ذرا جا کر میری آپا سے کہو ایک کیتلی چائے اور بسکٹ بھیج دیں۔"

بچیاں آئیں۔ عابدہ تو ذرا ہمت والی تھی۔ مگر زاہدہ کا تو میری صورت سے دم نکلتا تھا۔ دونوں چوہیوں کی طرح سہمی ہوئی آئیں۔

"میں ابھی آئی" میں اٹھ کر کلاسوں کا چکر لگانے لگی۔ نہیں چاہتی تھی کہ باپ بیٹیوں کے درمیان ہونے والی باتیں سنوں، شاید بچیاں رو پیٹیں۔ زاہدہ روں روں کر رہی تھی ماما چائے کی ٹرے لے کر آئی تو میں اس کے ساتھ دفتر میں داخل ہوئی۔ بچیاں کھلکھلا کر ہنس رہی تھیں مجھے دیکھ کر ایک دم چپ ہو گئیں۔

"جاؤ اپنی کلاس میں" مینجر صاحب نے پیار سے دونوں کو دروازے کی طرف دھکیلا وہ گرتی پڑتی بھاگیں۔

"آپ سے بہت ڈرتی ہیں۔ خدا کے لئے ان کے دل سے ڈر نکال لیجئے" مینجر صاحب پھر زبان پر کونین کی گولی رولنے لگے۔

"ساتھ رہیں گی تو ڈر نکل جائے گا۔"

"میں نے سنا ہے آپ سے سب لڑکیاں ڈرتی ہیں۔"

"اچھا؟ مجھے پتہ بھی نہیں، مگر کلاس میں تو بڑی اچھی طرح سے کام کرتی ہیں۔ خاص طور پر عابدہ، ماشاء اللہ بہت تیز ہے وہ قطعی نہیں ڈرتی۔ بلکہ اسے تو میں ڈانٹتی بھی ہوں۔ ہر سوال کا جواب پٹاپٹ دینے لگتی ہے۔ کسی کو بولنے ہی نہیں دیتی۔"

"زاہدہ تو لرز رہی تھی، مجھے بڑی تکلیف ہوئی۔"

"اب میں کیا کروں میری شکل ہی بھیانک ہے۔"

"اگر ایسی بات ہوتی تو مس داس کو دیکھ کر تو ہارٹ فیل ہو جانا چاہیئے تھا۔ واقعی بے چاری جی بھر کے ڈراؤنی ہے۔ پڑھاتی بھی ٹھیک سے نہیں اور بچوں کو مارتی ہے۔"

"اس کی کلاس میں لڑکیاں قہقہے لگاتی ہیں۔"

"مگر آپ جاتی ہوں گی تو سانپ سونگھ جاتا ہوگا۔"

"پتہ نہیں کیوں؟"

"آپ ذرا گرم GRIM رہتی ہوں گی۔"

"شاید!"

"حسیب کو بھی آپ سے شکایت ہے۔"

"اچھا!" میں بھول ہی گئی تھی۔ حسیب ان کے چھوٹے بھائی تھے۔ سال بھر کی بچی چھوڑ کر ان کی جوان بیوی مر گئی تھی۔

"ہینڈسم لڑکا ہے۔ میرا بھائی نہیں لگتا۔ اس کا رنگ اہل جاپان کی طرح صاف ہے۔"

مینیجر صاحب کئی بار حسیب کے حسن اور اس کی مرحوم بیوی کا ذکر کر چکے تھے۔ ٹھنڈی سانس بھر کے بولے۔

"میرا خیال تھا آپ اسے پسند کریں گی۔ مگر آپ بڑی رکھائی سے ملیں۔"

"مینیجر صاحب ذرا یاد کیجئے آپ نے جب آئی تھی تو کیا کہا تھا کہ مسلمانوں کا اسکول ہے لوگ بڑے پیرو ہائیڈ ٹیڈ ہیں۔"

"مگر حسیب تو نہایت شریف لڑکا ہے۔"

مجھے تو کوئی یہاں ابھی تک رذیل نہیں ملا۔ صدیقی صاحب شنکر جی، اور شرما جی، مسٹر جیکب اور اس دن مسٹر مارکس آئے تھے۔ بڑے ہی بھلے آدمی ہیں۔"

"وہ تو مشنری ہے آپ کو عیسائی بنانے کی کوشش نہیں کی؟ تمام بھنگیوں، چماروں کو عیسائی بناتا پھرتا ہے۔"

"بدقسمتی سے میں بھنگی، چمار نہیں۔"

"اُہو، میرا یہ مطلب تو ہرگز نہیں۔ آپ اچھے خاندان کی ہیں۔ آپ خدا نہ کرے کیوں ....."

"اچھے بُرے خاندان اور مذہب سے کیا واسطہ؟"

"واسطہ تو ہے۔ سُنا ہے شرما جی بہت گیتا رامائن سنا رہے ہیں آج کل۔"

"ہاں شاید وہ مجھے ہندو کرنا چاہتے ہوں گے۔"

"قطعی پکا اکٹر آریہ سماجی ہے۔"

"آپ بھی تو کٹر مسلمان ہیں۔"

"بحمد اللہ۔"

"آپ شاید مجھے مسلمان کرنے پر تلے ہوئے ہوں گے۔"

"کیا، یعنی کیا مطلب۔ آپ ماشاء اللہ مسلمان ہیں۔"

"مگر مجھے عیسائی مذہب سے بڑی دلچسپی ہے اور اب ہندو ازم کے بارے میں اتنی تفصیل سے پڑھ رہی ہوں تو...... مگر آپ فکر نہ کیجئے، میری ذات پر نہ اسلام کو فخر ہے اور نہ کسی مذہب کو فخر کرنے کا موقع ملے گا۔ معاف کیجئے گا مینیجر صاحب نعرے بازی اور چیز ہے اور صحیح معنوں میں مسلمان ہندو یا عیسائی ہونا مشکل ہے مجھے تو سوائے دو ایک کے کوئی نہیں آیا۔ آپ نماز پڑھتے ہیں میرا مطلب ہے عید بقر عید اور کبھی کبھی جمعہ کے علاوہ؟"

"نماز نہ پڑھنا بے شک۔"

"اور روزہ؟"

"مگر اس سے یہ تو مطلب نہیں کہ مجھے خدا کے وجود سے توبہ توبہ انکار ہے یا میں منکر یا مشرک ہوں۔"

"آپ بڑے پکے مسلمان ہیں۔ مسلم گرلز سکول چلا رہے ہیں۔ فکر نہ کیجئے آپ کو ضرور جنت میں زمرد کا محل ملے گا۔"

"لاحول ولا قوۃ، میں یہ گرلز اسکول قطعی کسی جزا کی امید میں نہیں چلا رہا ہوں۔ آپ ..... میرا مطلب ہے ....."

میں ہنسنے لگی۔ جانتی ہوں آپ کو لڑکیوں کی تعلیم سے دلچسپی ہے۔ اور بخدا مذاق نہیں، مجھے یقین ہے خدا آپ سے خوش ہوگا۔ کیونکہ مس فلپس نے مجھ سے کہا ہے کہ اگر میں الہ آباد چلی جاؤں تو بہت جلدی کام بن جائے گا۔ اور بورڈنگ کے لئے گرانٹ ..... مگر مینیجر صاحب بورڈنگ تو ہے ہی نہیں۔ مس فلپس بولیں وہ ایک دن بورڈنگ کا معائنہ کرنے آئیں گی۔"

"اُوہ مائی گوڈ۔ میں نے کافی دن ہوئے بورڈنگ کے لئے علیحدہ گرانٹ کی عرضی دیدی ہے آپ کو بتانا ہی بھول گیا وہ فائیل بھی میرے گھر پڑی ہے آپ نے ....

ان سے کچھ کہا تو نہیں۔"

"نہیں، میں سمجھ گئی آپ نے کوئی بورڈنگ کا چکر چلایا ہوگا۔ مگر مجھے بتا تو دیا ہوتا جو پھٹ سے منہ سے نکل جاتا تو۔"

"میری مٹی پلید ہو جاتی۔ اچھا تو میں چلا، ہاں! بچیوں کا سامان بھیج دوں گا۔ فیل تو بہت مچائے گی۔ خیر شام کو حسیب سامان پہنچا دے گا۔"

پھر چلتے چلتے بڑی مسکین صورت بنا کر بولے۔

"ذرا ٹھیک سے بات چیت کر لیجیے گا۔ بڑا دکھی بچہ ہے۔"

"میں کچھ کم دکھی بچی ہوں۔"

"یہ تو نہ کہیئے" وہ ذرا تلخی سے بولے "پھول کھل رہے ہیں آپ کے چہرے پر۔"

"آپ کے جاسوسوں نے ایک ایک پل کی خبر دی ہوگی۔"

"کمال کرتی ہیں۔ میں جاسوس لگاؤں گا آپ کے پیچھے، اجی یہ شہر بریلی ہے۔ یہاں لوگوں کو سب کی فکر لگی رہتی ہے۔"

"سوائے اپنے گریبان کے۔"

"مگر وہ نفتنگا مجھے قطعی پسند نہیں۔ وہ کیا نام سید۔ آپ اس سے زیادہ میل جول نہ بڑھائیں تو اچھا ہے۔"

اسکول چھوٹ گیا تھا۔ ماما دو، دفعہ دور سے اشارہ کر چکی تھی کہ آپا بلا رہی ہیں۔ میں نے جلدی سے وعدہ کر لیا۔

"قطعی نہیں بڑھاؤں گی۔" اگر میں کسی بات پر بغیر بحث کئے راضی ہو جاؤں تو اس کا مطلب بالکل الٹا ہوتا ہے۔ مجھے کہنا چاہیے تھا "قطعی میل بڑھاؤں گی۔ کسی کی مجال ہے جو مجھے روکے۔ مگر انہیں دوسرے سے میل جول پر کیوں اعتراض نہیں فوراً ہی ڈھیلا ہو گئی۔"

"وہاں ضیا صاحب کا بڑا رسوخ ہے۔ سرکاری آدمی ہیں۔ ان سے کہیئے الٰہ آباد میں ذرا ہمارا کیس آگے بڑھوائیں۔"

"ضرور لکھوں گی۔" میں نے جل کر کہا اور ان کے باہر جانے سے پہلے ہی گھر کی طرف چل دی۔ گھر پہنچی تو میری چیخ نکل گئی۔

"باجی!"

"بھنو کتنی دیر سے بلوا رہے ہیں، آتی ہی نہیں۔" باجی نے میری پیٹھ پر دو گھونسے جمائے۔ ہائے میری باجی کے پیارے گھونسے اور میٹھی میٹھی چٹکیاں۔

مدحت دروازے میں سے جھانک رہی تھی، تھوڑی دیر شرمائی پھر بھاگی آئی اور دھڑ سے میرے اوپر گر گئی۔

کھانے کی میز پر زاہدہ، عابدہ سہمی ہوئی چڑیوں کی طرح بیٹھی کن انکھیوں سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ باجی کے گھونسے میری پیٹھ پر پڑتے دیکھ کر کچھ حیرت زدہ تھیں۔ کچھ مطمئن! میں انہیں کم کٹکھنی لگ رہی تھی۔

باجی کو میں نے لکھا تھا کہ مدحت مولوی سے کیسے پڑھ رہی ہوگی۔ اسے میرے پاس بھیج دیجیے۔ دولہا بھائی نے بہت مخالفت کی۔ مگر وہ باجی کی ہر ضد پوری کرتے تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے کہا میں نے بھائی کی بچی لی ہے بڑی بہن چھوٹی ہے۔ اگر چھوٹی جاہل رہ گئی تو مجھے کوسے گی۔ اس کے والدین کو بھی دکھ ہوگا۔ اگر پڑھوانے نہیں دو گے، تو میں بچی واپس اس کے ماں باپ کو دے دوں گی۔

دولہا بھائی مدحت پر جان چھڑکتے تھے۔ سالے کی بچی ہی نہیں ان کی بھتیجی کی بیٹی تھی۔ رام پور میں چھٹی جماعت تک اسکول تھا۔ اس کے بعد دو سال سے وہ گھر پر ہی پڑھ رہی تھی، گیارہ برس کی تھی۔ گیارہ حد ذہین تھی۔ نزہت کی صحت بھی خراب رہتی۔ وہ موٹی تازی تھی۔ نزہت آٹھویں میں تھی اور وہ ساتویں میں داخل ہو گئی۔

میں نے مکھن کو بھی داخل کر لیا تھا۔ بچیوں کی کلاس میں آپا بھی ہوم ورک میں مدد کرتی تھیں اب چار لڑکیاں ہو گئیں تو واقعی بورڈنگ کی بنیاد سی پڑ گئی۔ میں نے ایک بڑے سے کمرے میں چاروں کو بھر دیا۔ باجی کو بغیر مدحت کے نیند نہیں آتی تھی، مگر وہ "بورڈنگ" میں رہنے پر مصر تھی۔ باجی ہفتہ بھر رہیں پھر مدحت کو چھوڑ کر چلی گئیں۔

نزہت بڑی مسکین تھی۔ میرے ساتھ بریلی آکر تو بالکل سناٹے میں گنگ ہو گئی تھی۔ ہر وقت سہمی سی رہتی۔ آپا کا ہاتھ بٹاتی۔ چھوٹے بہن بھائی پر ہر وقت نظر رکھتی۔

مدحت بڑے لاڈوں کی پالی تھی۔ منہ زور اور بے انتہا شریر پہلے مجھے باجی کے رشتے سے خالہ جان کہتی تھی۔ بریلی آکر پھوپھی جان کہنے لگی۔ میں نے وجہ پوچھی تو بولی۔

"آپ ہماری پھوپھی ہیں خالہ تھوڑی ہیں، ہمیں خالائیں بُری لگتی ہیں۔"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"ہر وقت ملع کرتی ہیں۔ سلیقہ سے چلو۔ بھاگنے بھی نہیں دیتیں، اور بُری بُری باتیں کرتی ہیں۔"

"کیا بُری بُری باتیں!!"

"ہر وقت شادی شادی لگائے رکھتی ہیں۔"

"شادی میں کیا بُرائی ہے۔"

"ہم شادی نہیں کریں گے، ہم نے امی سے کہدیا ہے۔"

"وہ کیا بولیں۔"

"کچھ بھی نہیں، وہ تو بس نہ پڑھنے پر مارتی ہیں۔"

نزہت ہماری پہلی بھتیجی تھی اس لئے سب ہی کو پیاری تھی اور اماں ابا کی تو بے انتہا لاڈلی تھی۔ آپا بھی بہت چاہتی تھیں وہ جانتے کیوں اتنی اداس اور پریشان رہتی تھی کہ سب ہی کو اس کی فکر رہتی تھی۔ کبھی میں اسے کھویا دیکھ کر اپنے پاس لٹا لیتی

تو مدحت فوراً آچڑھ بیٹھتی اور موقع بے موقع نزہت کو پیٹ بھی دیتی میں بہت کہتی نزہت اس چڑیل کو مار مگر وہ مارنا جانتی ہی نہیں تھی مجبوراً مجھے مدحت کی ٹھکائی کرنی پڑتی مگر وہ بلا کی ڈھیٹ تھی۔ بجائے دکھی ہونے کے مجھ سے لپٹ جاتی اسے کسی نے نہیں مارا تھا۔ وہ اس مار کو بھی ترستی تھی۔ اتنے لاڈ کئے گئے تھے کہ اُوب گئی تھی۔

"بورڈنگ" میں بڑا سا صحن تھا۔ کھیل کود کے لئے خوب جگہ تھی۔ مگر زاہدہ عابدہ بلا کی شرمیلی اور نزہت مرگھلی۔ اونچ نیچ آنکھ مچولی۔ کسی کھیل میں بھی جان نہ پڑ پاتی۔ صرف مدحت اودھم مچا کر سب کو چت کر دیتی۔ میں نے گیل اور گلی ڈنڈا بھی سکھایا جس پر مینجر صاحب بڑے پریشان ہوئے۔

"سارے شہر میں خبر پھیل رہی ہے آپ لڑکیوں کو لڑکوں کے کھیل سکھا رہی ہیں۔"

"سب کھیل بچوں کے ہوتے ہیں ان کی کوئی جنس نہیں ہوتی۔ میں نے بحث شروع کر دی۔ آخر کون سے کھیل سکھاؤں ..... بیڈمنٹن کے لئے آپ سے کہا آپ ٹال گئے۔ پھر بتائیے بچیوں کو کب تک آنکھ مچولی کھلاتی رہوں۔"

نزہت ہر کھیل میں پیچھے رہتی مگر نہ جانے کیسے وہ مدحت پر گُلی ڈنڈے میں سبقت لے گئی۔ مدحت ہار کی عادی نہیں تھی۔ کبھی ایک دم بگڑ کے نزہت کو مارنے لگتی۔ ایک قیامت تھی۔ ان دونوں بہنوں کے درمیان سمجھوتہ کرنا، نزہت شرکا بیٹا بھی نہیں کرتی جس پر مجھے بہت غصہ آتا۔ گھر میں ایک جنادری املی کا پیڑ تھا۔ میں نے بچیوں کو پیڑ پر چڑھنا بھی سکھانا شروع کیا جس پر بڑی لے دے ہوئی، مگر لڑکیاں میری شہ پا کر کسی کی نہیں سنتی تھیں۔ بلکہ وقفہ میں اسکول کی لڑکیاں بھی آکر گلی ڈنڈا کھیلتیں اور پیڑ پر چڑھتیں۔ بے حد قابلِ اعتراض بات سمجھی جاتی۔ اس لئے لڑکیاں سمجھتیں وہ بڑا ایڈونچر مار رہی ہیں، اور ضد میں قابلِ اعتراض کھیلتیں۔

مینجر صاحب بے حد دکھی ہو جاتے۔

"خدا کے لیے، یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟ میرے کیے دھرے پر پانی پھر جائے گا"

آپ کو معلوم ہے کہ اسکول میں لڑکیوں کی تعداد دن بدن بڑھ رہی ہے ہمارے پاس جگہ بھی نہیں رہی ہے۔ ایک بنچ پر دو دو لڑکیوں کو بیٹھانا پڑتا ہے۔ تین لڑکیاں تو گورنمنٹ اسکول سے آگئیں کہ ان کا گھر ہمارے اسکول کے پچھواڑے ہے۔ ہم نے کہہ دیا تھا، جگہ نہیں کچھ دن چٹائی پر بیٹھنا ہو گا"

"مگر...... وہ قدیر صاحب کہہ رہے تھے بچیوں کو ہوم ورک بہت ملتا ہے اگر نہیں کریں تو سختی ہوتی ہے"

"یہ والدین ہوم ورک اور اسکول کے ڈسپلن میں دخل دینے والے کون ہوتے ہیں اور یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ مار پیٹ پر اس دن سے سخت روک لگا دی ہے جس دن ایک ٹیچر نے لڑکی کو مارا تو خون جاری ہو گیا۔ کسی طرح بند نہیں ہوا تو مجھے ہسپتال لے جانا پڑا"

"ان کا کہنا ہے کہ آپ نے جان بوجھ کر بات کو بڑھا دیا۔ مجھ سے تو پوچھ لیا ہوتا"

"اگر بچی کو کچھ ہو جاتا تو کیا ذمہ داری آپ لیتے۔ میں جو سمجھوں گی ٹھیک، وہی کروں گی۔ آپ کی اجازت لینے نہیں جا سکوں گی کہ اتنے میں لڑکی مر جائے۔ بچوں کو مارنے کی میں قائل نہیں اور مارنا بھی کس طرح کا ہوتا ہے۔ مجھے استادوں کی سادیت قطعی گوارا نہیں ہے"

"اس دن بیچاری بہت پریشان تھیں"

"اگر کسی استانی کا شوہر یڈ دسن سے پینگ بڑھائے تو اس کا غصہ بچے کی جان پر؟"

"ارے آہستہ بولیئے بیچاری بڑی دکھی ہے۔ وہ کمینہ گھر خرچ کے لئے کوڑی نہیں دیتا۔ چھ بچے ......"

"تو کس نے کہا تھا کہ چھ بچے پیدا کرے۔ اور اب جو ساتواں اٹھائے پھر رہی ہیں۔ میں نے بہت کہا ایک ڈاکٹرنی میری دوست ہے آپ ......"

"خدا کے لئے آپ لوگوں کو ایسی خوفناک رائے نہ دیجیے اسقاط حمل جرم ہے"

"ضرورت سے زیادہ بچے پیدا کرنا اس سے بڑا جرم ہے۔ کیا حال ہے ان کے بچوں کا۔ بڑی لڑکی نہ جانے کس کے ساتھ بھاگ گئی۔ واپس آئی تو وہ اس کا گلا گھونٹنے پر تل گئیں وہ میرے پاس کانپتی تھرتھراتی آئی۔ میں نے اسے پناہ دی تو کونسا جرم کیا"

"خواہ مخواہ آپ کو کسی کے معاملے میں دخل دینے کی کیا ضرورت ہے۔ پتہ ہے کیا افواہیں اڑ رہی ہیں کہ بورڈنگ کی ایک لڑکی حاملہ ہو گئی اور ......"

"افواہ فرزانہ حاملہ قطعی نہیں ہوئی اور نہ میں نے اس کا ابارشن کروایا۔ اور رہا خواہ مخواہ کسی کے معاملے میں دخل دینے کا سوال تو، دنیا کا ہر معاملہ ہر انسان کا نجی معاملہ ہے۔ میں ایک لڑکی کی زندگی سے کھیلنے والوں سے قطعی ہمدردی نہیں رکھتی"

"مگر دردسر مول لینے سے فائدہ؟"

"قطعی کوئی دردسر نہیں۔ مجھے کوئی ذہنی یا جسمانی کوفت نہیں اٹھانی پڑی۔ مینیجر صاحب اعتراض کرنے والے اس سے زیادہ کیا کر سکتے ہیں کہ مجھے نکال دیا جائے۔ تو قبلہ۔

ملک خدا تنگ نیست   پائے مرا لنگ نیست

"آپ کو بدنامی کا خوف نہیں؟"

"میں صرف اس فعل کو گھناؤنا سمجھتی ہوں جسے میرا ضمیر قبول نہ کرے۔ زندگی میں اب تک جو بھی قدم اٹھایا ہے غلط ثابت نہیں ہوا"

"مگر رسک لینے سے فائدہ؟"

"یوں تو زندگی کے ہر قدم کو رسک سمجھ لیا جائے تو انسان مٹی کا تودا بن جائے۔ مینیجر صاحب آپ سے پہلے بھی عرض کر چکی ہوں کہ معاہدہ آپ نے کیا ہے۔ میں تو بکے

کاغذ کو کوئی اہمیت نہیں دیتی۔ پکے، کاغذ کے باوجود اسے کچا بنایا جا سکتا ہے۔ میرے والد جج تھے اور میرے دو بھائی وکیل ہیں۔ میں نے کوئی ایسا قدم کبھی نہیں اٹھایا کہ قانون کی حدوں سے باہر ہو۔ صرف آپ کی مرضی سے یہاں تقرر ہوا ہے اور آپ کی مرضی.....»

«میری مرضی آپ کو معلوم ہے، میں نے اپنی بیٹیاں آپ کے سپرد کی ہیں۔ مگر اس دنیا کو کیا کروں۔»

«ایسا کیجئے خود کو ہر جرم سے بری الذمہ سمجھ کر مجھے آگے کر دیجئے۔»

«لاحول ولا قوۃ آپ نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے۔ میں اتنا بزدل بھی نہیں۔»

«یہ تو میں جانتی ہوں کہ آپ نے یہ اسکول کھولا اور چلا رہے ہیں۔ آپ کے علاوہ پاپا میاں یعنی علی گڑھ گرلز کالج کے بانی سے ان کے تجربات سے بھی اندازہ ہوا۔ گرلز اسکول اور وہ بھی مسلمانوں کے لئے بیٹھے بٹھائے جان پر عذاب نازل کرتا ہے۔ لیکن جو لڑکیاں یہاں سے تعلیم پا کر جائیں گی۔ وہ آپ کی قربانیوں کو یاد رکھیں گی۔ ذرا سوچئے کتنے گھروں میں اس کا یہ ننھا سا دیا روشنی پہنچاسکے گا۔»

«بدنامی کیا ہے؟ یہی نا کہ جو لوگ آپ کی مرضی سے زندگی گزارنے پر تیار نہیں۔ اپنی مرضی سے جیتے اور مرتے ہیں! وہ آپ کو برے لگتے ہیں اور جو آپ کے یقین پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ اچھے لگتے ہیں۔ مجھے اچھا یا برا لگنے کی پرواہ ہے نہ ضرورت۔ میں اپنی زندگی میں کسی کو ٹانگ نہیں اڑانے دوں گی۔»

«زندگی تنہا بڑی کٹھن گزرے گی۔»

«جھیل جاؤں گی۔ کیونکہ اپنے گن داور ثواب کا الزام کسی پر نہ تھوپ سکوں گی۔ رہا تنہائی کا سوال تو میں کبھی تنہا نہیں رہتی ہزاروں یادیں ان گنت خیالات ہنگامہ برپا کئے رہتے ہیں ـــ»

«آپ کو کسی کی ضرورت نہیں۔»

رہے۔ بے انتہا ہے۔ مجھے ہر ایک کی ضرورت ہے کسی کو نہیں کھو سکتی۔»

«ہوں، یہ آپ کے دوست میرا مطلب ہے وہ صاحب جو آپ کو روزانہ خط لکھتے ہیں، بلکہ کسی روز، دو، دو خط روانہ فرماتے ہیں، بہت اچھے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔»

ڈاک منیجر صاحب کا چپراسی یعنی اسکول کا چپراسی ان کا خان ساماں تھا جو اسکول کی ڈیوٹی ختم کرنے کے بعد ان کے گھر کا بھی کام کرتا تھا۔ وہی روزانہ ڈاک لاتا تھا۔ اور پہلے منیجر صاحب اس پر نظر ڈالتے تھے بلکہ شاید سنسر کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ شہر کے لفنگے اسکول کی ٹیچروں نے لڑکیوں اور بیہودہ خط لکھتے ہیں۔ اس لئے وہ محتاط رہتے ہیں......

میں سناٹے میں رہ گئی، اگر منیجر صاحب نے خط سنسر کئے ہیں تو بس قیامت ہی ٹوٹی سمجھو، ضیاء کے خط بے حد خوبصورت شعروں سے سجے اور عشق کے فلسفہ میں ڈوبے بے حد نشہ آور ہوا کرتے تھے۔ وہ دو بار اور بریلی آ چکے تھے۔ صبح آتے ہم دن بھر ساتھ رہتے، شام کو چلے جاتے، پچھلی بار کار سے آئے تھے اور ہم نہ جانے کہاں کہاں گھومتے پھرے تھے۔

منیجر صاحب کی حرکت پر میرا جی تو بہت جلا مگر میں نے اپنے چہرے سے نہ ظاہر ہونے دیا۔ میں نہایت ڈھیٹ ہوں۔

اس سے پہلے کہ بات بڑھتی سید صاحب آ گئے۔

«بھائی صاحب، ملکۂ عالم نے آپ کو طلب فرمایا ہے۔

ان کے میکے سے امرودوں کا پارسل آیا ہے۔ کچالو بنائے گئے ہیں۔ آپا اور بچوں کے لئے بھیج بھیج دیئے ہیں امرود۔»

«اچھا میں چلتا ہوں۔» منیجر صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔

«اب خشک چہرہ بناتا ہے مجھے دیکھ کر جیسے میں اس کی ملٹی کا اعتوار کرنے

آیا ہوں"

"حالانکہ آپ ملکۂ عالم ٹی کی آرڈر فوراً لے لیتے ہیں۔ پھر بھی اور نیت میں کھوٹ بھی نہیں"

"کیا کھوٹے کھرے کی بڑی پرواہ ہے؟"

"روپیہ کھوٹا ہو تو گھاٹے کا امکان ہو سکتا ہے۔ صرف نیت کا کھوٹ تو...."

"درغلا نہیں سکتا"

"کیا صرف درغلانے سے بھی قوت مردمی میں اضافہ ہوتا ہے"

"اُفوہ، بڑے بھائی صاحب آپ تو ہر بات کا تنگڑ بنا دیتی ہیں۔ اس وقت دل بہت اُداس ہے"

"کیوں کیا کوئی نئے تعویذ سلگائے جا رہے ہیں؟"

"پتہ نہیں ہو سکتا ہے۔ پتہ ہے میں ان تعویذوں سے کچھ ڈرنے لگا ہوں"

"کچھ کیا کافی ڈرنے لگے ہیں، یہ سعادت مندی کا ثبوت ہے اور آپ کافی تپنی ورتا ہوتے جا رہے ہیں۔ آپ کا اُدش کلیان ہو گا بچہ!"

"یہ پنڈا آپ پر بڑا حاوی ہوتا جا رہا ہے۔ کیا بیہودہ کہانی چھپی ہے آپ کی سالی میں"

"کافر؟ کیوں کیا بُری ہے"

"لاحول ولا قوت، نہایت بیہودہ خیالات ہیں آپ کے۔ منیجر صاحب کو شکر ہے کہ پڑھنے کی فرصت نہیں ورنہ شامت آجاتی"

"کیا شامت آسکتی ہے یہی ناکہ نکال دی جاؤں گی۔ بیک پنی دو گوش تو دیسے بھی میں سال کے آخر میں جا رہی ہوں۔ دو مہینہ کی تو بات ہی ہے۔ مگر کہانی پر آپ کو ذاتی طور پر کیا اعتراض ہے، کوئی نئی بات تو نہیں کہی۔ آپ خود ایک عیسائی لڑکی سے شادی کرنے پر تلے ہوئے تھے وہی اڑ گئی کہ چھوٹی بی بی کو طلاق دو اور کتنی ہندو مسلم شادیاں ہوتی ہیں۔ اس موضوع پر کہانیاں بھی بہت لکھی گئی ہیں اور کسی زمانے میں تو اکثر رومانٹک کہانیوں کی ہیروئن پارسی حسینہ ہوا کرتی تھی"

"وہ قطعی اور بات تھی"

"وہ کیسے؟"

"ہندو عیسائی پارسی لڑکی۔ یعنی محبوبہ ہو سکتی ہے"

"اور ہندو عیسائی یا پارسی ہیرو نہیں ہو سکتا"

"بھئی میں چلا۔ بھاڑ کا کانٹا بن جاتی ہو۔ اچھا تو امرود کے کچالو"

"بھاڑ میں جائیں امرود کے کچالو"

"دیکھو، تمہارے ہی بھلے کے لئے کہتا ہوں یہ پہیلی ہے اور یاد ہے، وہ اصغری بیگم کا قصہ"

"ہاں یاد ہے، بھلا کوئی بھول سکتا ہے . . ."

"تو پھر چلو"

"بس یہ دو خطوں کا جواب لکھ کر آتی ہوں"

اصغری بیگم!

سوامی شردھانند کا قتل!

ان کے قاتل عبدالرشید کو پھانسی!

جاورہ میں عظیم بھائی کے پاس اصغری بیگم کا خط آیا تھا۔ ان دنوں ان پر ایک آفت ٹوٹی تھی۔ شاہد احمد دہلوی کے والد نے ایک کتاب "امت کی مائیں" لکھی جس پر مسلمانوں نے اعتراض کیا۔ اور وہ کتاب بین ہو گئی۔ شاہد صاحب کو نہ جانے کیا سوجھی اسے پھر میدان میں لے آئے۔ اس پر احتجاج ہوا تو عظیم بھائی نے انہیں لکھا کہ کتابیں انہیں بھیج دی جائیں۔ ریاست جاورہ خود مختار ہے۔ اور برٹش سرکار کی لگائی ہوئی بندش پر یہاں عمل نہیں کیا جا سکتا۔ میں اس کتاب کی حفاظت کروں گا۔ دیکھتا ہوں مجھے کون روکتا ہے۔

"یہ خط فوراً اخبار میں چھپ گیا۔ عظیم بھائی خود کو محفوظ سمجھنے لگے۔ اور کتابوں کا پارسل وصول کرنے کی خبر بھی چھپوا دی۔

عظیم بھائی تانگہ میں کچہری چلے جاتے تھے ایک دن تانگہ تو موجود ہے مگر تانگہ والا کوئی نیا ہے۔ اس سے پوچھا تو بولا میرا بھائی بیمار ہے۔ میں اس کی جگہ دو چار دن تانگہ چلاؤں گا عظیم بھائی بیٹھ گئے۔ تھوڑی دور چلے تھے کہ دو آدمیوں نے تانگہ رکوایا۔

"ہم بھی کچہری جا رہے ہیں۔ کوئی سواری نہیں مل رہی ہے۔ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو ......"

"بیٹھیے، مجھے کوئی اعتراض نہیں"

تانگہ والا ایک سنسان جگہ تانگہ لے گیا۔ روک کر دونوں آدمی اترے اور عظیم بھائی پر لکڑیوں کی بارش کر دی۔ دھان پان سے آدمی پہلی چوٹ میں ہی ڈھیر ہو گئے۔ دو چار اور لگا کر وہ لوگ غائب ہو گئے مع تانگہ والے کے۔

عظیم بھائی کو ہوش آیا تو بڑی مشکل سے سڑک پہ پہنچے تانگہ لیا اور گھر آئے۔

"تانگہ الٹ گیا" انہوں نے سب کو یہی بتایا۔ مگر اسحاق بھائی سب انسپکٹر تھے وہ ان کے جھانسے میں نہیں آئے، کیونکہ تانگہ سے گرنے کی چوٹیں پٹیوں کی مار سے مختلف ہوتی ہیں۔

"کتنے آدمی تھے؟" انہوں نے چپکے سے پوچھا۔

"دو اور تانگہ والا" عظیم بھائی قبول دیئے۔

دوسرے دن اخبار میں نکلا کہ جودھپور میں برٹش قانون نہ چل سکے لیکن اسلام جودھپور میں بھی زندہ ہے اور مسلمانوں نے ابھی چوڑیاں نہیں پہنی ہیں۔

دوسرے دن اسحاق بھائی بڑے ماموں چھوٹے ماموں جمع ہوئے اور جودھپور کے مسلمانوں کی شرائط پیش کیں۔

عظیم بیگ بھائی کا بخار اتر گیا تھا۔ مگر بغیر سہارے چل نہیں پاتے تھے۔ نہا دھو کر بڑے ماموں کی موٹر میں مسجد گئے نماز پڑھی توبہ کی۔ معافی مانگی اور مسجد کی سیڑھیوں کے نیچے کتابوں کے ڈھیر کو آگ لگائی۔

مسلمانوں نے بڑی دریا دلی سے معاف کر دیا اور خوب گلے ملے جس پر عظیم کا خیال تھا کہ اتنی زور زور سے بھینچنے کے بجائے دو چار جوتے مار لیتے تو بہتر ہوتا۔

اس واقعہ کی تفصیل چھپی تو ان کے پاس سینکڑوں خط آئے۔ کچھ شاباشی کے کچھ احتجاج کے۔ ان میں ایک خط اصغری بیگم کا بھی تھا۔ عظیم بھائی نے جن خطوں کے جواب دیئے ان میں سے ایک خط اصغری بیگم کا بھی تھا۔ ان کی کافی خط و کتابت چلتی رہی۔ ایک خط کے ساتھ انہوں نے اپنی زندگی کی داستان بھیجی جو کہیں شائع نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ نئے سرے سے لوگوں میں اشتعال پیدا ہونے کا اندیشہ تھا عظیم بھائی ہمیشہ مجھے اپنی دلچسپ ڈاک پڑھنے کو دیتے تھے۔

اصغری بیگم کی داستان حیات نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ میں نے اس کا خلاصہ اپنی ڈائری میں لکھ لیا تھا۔ آج وہ ڈائری میری رہنمائی کا کام انجام دے رہی ہے۔ اور میرا قلم وہ امرت اور زہر اگل رہا ہے۔

اصغری بیگم بے انتہا ذہین اور حسین خاتون تھیں۔ انہوں نے زندگی کا بڑی ہمت سے مقابلہ کیا تھا۔ بمبئی سے وہ ایک رسالہ "تنویر" بھی نکالتی تھیں۔ نظم و نثر دونوں پر دسترس حاصل تھی۔ مجھے ان کی جد و جہد نے بے انتہا متاثر کیا۔

میں نے سید صاحب کو ان کی شخصیت کے متعلق بتایا ڈائری میں سے کچھ حصے پڑھ کر سنائے میں رہ گئے۔ اکتا کر بولے۔

"بھئی میں کسی ایسے فضیحتے میں ٹانگ نہیں اڑاتا جس میں جھگڑے کا امکان ہو اور تمہیں بھی یہی رائے دوں گا کہ خواہ مخواہ صرف کسی کے جذبات کو ٹھیس لگا کر چٹخارے لینا حماقت ہے۔ لوگوں کا مضحکہ اڑا کر چڑھا کر ہم خیال نہیں بنایا جا سکتا۔ فرد کی آزادی

پر ایمان رکھتی ہو؟"

"قطعی"

"تو پھر کوئی کیا سوچتا ہے۔ کیا کرنا اسے اس کے حال پر چھوڑ نے پر بھی ایمان لانا چاہیئے۔ تمہیں کسی پر اعتراض کرنے کا کیا حق ہے؟"

"اور وہ لوگ جو پڑھی لکھی لڑکیوں کو گالیاں دیتے ہیں۔ کیا وہ مجھ پر نہیں جیکتیں مجھے جواب دینے کا بھی حق ہے! جو پابندیاں میرا دم گھونٹتی ہیں۔ جنہوں نے بہت سی زندگیوں کو مسخ کر رکھا ہے۔ میرا جی جلتا ہے تو ....."

"جلیے پھپھو سے بھپوڑنے لگتی ہو"

"اور کیا ان پر انگارڈال دوں"

"بڑے بھائی صاحب برادر خورد معافی چاہتا ہے۔ آتی کڑوی باتیں کر کے منہ کا مزہ خراب ہو گیا امرودوں کے کچالو کا ایک دور ہو جائے پھر چاہے نمکولیاں پیس کے حلق میں انڈیل دیتا"

مگر ہم ان جانے طور پر اصغری بیگم کا ذکر کرتے رہے۔

کچالو ہی نہیں۔ دوپہر کا کھانا بھی کھایا۔ آپا کھانا لے کر بچوں سمیت آگئیں زاہدہ عابدہ اپنے گھر گئی ہوئی تھی۔ چھوٹی بی بچوں پر قربان ہوتی رہیں۔

یہ کیا زیادتی ہے اللہ میاں۔ کہیں بچوں کی کیچڑ کہیں کسی گود میں ریت کے گولے! مگر چھوٹی بی کوئی بچہ گود کیوں نہیں لے لیتیں؟ کوئی کیا چاہیں تو گھر بھر سکتی ہیں۔ ہندوستان کے تو ہر خاک کے ذرہ کے ساتھ جھول رہا ہے۔

لاڈلی بیٹی خاصی لاڈلی بیوی۔ ان کی زندگی کا المیہ ہے کہ ان کی گود سونی ہے مٹھی میں! اور اصغری بیگم کو گود میں تو بس انگارے ہی انگارے تھے۔

اصغری بیگم کی جھولی کے انگارے پھول پھول بن گئے! ان کی ہمت اور جرأت

نے انہیں عذاب دوزخ سے نکال کر جنت اراضی بخش دی۔

انہوں نے عظیم بھائی کے نام ایک خط لکھا۔ خط تو بس نام کو تھا پورا ناولٹ تھا۔ انہوں نے وہ مجھے پڑھنے کو دیا۔ میں اصغری بیگم سے بے انتہا متاثر ہوئی۔

عام طور پر جب عورت پر برا وقت پڑتا ہے تو وہ کسی مرد کو سہارا بنا کر اس دوزخ سے بھاگتی ہے۔ یہ رواج برسہا برس سے ہر ملک میں چلتا آیا ہے اور آج بھی ہندوستان ہی میں نہیں یورپ اور امریکہ میں بھی نوجوان لڑکے لڑکیاں اپنے گھر سے بھاگ کر غنڈوں کے گروہ کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں اور گمراہی کے راستہ پر پڑ جاتے ہیں۔ آج امریکہ کا یہ سب سے اہم مسئلہ بن چکا ہے۔ پولیس مفلوج ہو چکی ہے۔ کمسن لڑکیاں غربت کی ماری نہیں بلکہ رنگین زندگی کی بھوکی والدین کے ضرورت سے زیادہ پیار سے اکتا کر یا واہیات ادب اور فلموں کے دکھائے گلیمر سے مسحور ہو کر بھاگ نکلتی ہیں بڑے شہروں میں پہنچ جاتی ہیں۔ جہاں بڑے طاقتور گروہ انہیں اپنے شکنجہ میں کس لیتے ہیں انہیں سبز باغ دکھائے جاتے ہیں۔ ماڈل اور فلمی ہیروئن بننے کے، رومان اور جگمگاتی زندگی کے پھر انہیں نشہ کی عادت ڈالی جاتی ہے۔ یہ نشہ جب ان کی رگوں میں سرایت کر جاتا ہے اور اس کے بغیر زندگی دشوار ہو جاتی ہے تو پھر انہیں اس نشہ آور زہر بیچنے اور جسم فروشی اور مختلف جرائم کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

اس بیوپار میں پولیس بھی ان غنڈوں سے ہار جاتی ہے کیونکہ چھوٹے کارندے بڑے زبردست غنڈوں سے وابستہ ہوتے ہیں۔ جو ان سے بھی بڑے غنڈوں کی مٹھی میں ہوتے ہیں جن کی پہنچ پولیس افسروں اور حاکموں تک ہوتی ہے۔ بڑے بڑے عہدے داران کا حکم بجا لانے میں خیریت اور منافع حاصل کرتے ہیں۔ ایماندار انسان کا جینا مشکل ہے اپنی روزی اور اپنے بال بچوں کی زندگی کی خاطر اسے سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے یا زندگی سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ پولیس کتنی بھی ایماندار ہو بے بس ہو جاتی ہے۔ اور سمجھوتے کے سوا کوئی دوسرا راستہ ہی نہیں۔

ہندوستان میں صدیوں سے کمسن لڑکیوں کو بہکا پھسلا کر گمراہ کرنے کا دستور چل رہا ہے۔ سماج سدھار کی کوئی سکیم کامیاب ہوتی نظر نہیں آتی۔ بازار کی زینت کے لئے کمسن لڑکیاں اور زبردست کا راج قائم کرنے کے لئے کارندوں کی ضرورت یہ اغوا کئے جانے والے معصوم بچے ہی پوری کر سکتے ہیں۔ چھوٹے شہروں میں نہایت شاندار پیمانے پر یہ غیر قانونی قانون پھل پھول رہا ہے۔ مغرب سے ہتھیار مشین ہی نہیں خیالات، اصول سوداگری بھی امپورٹ ہوتے ہیں اور بڑے شہروں میں کمسن بچوں کے استعمال میں مغربی ہتھکنڈے بڑے سود مند ثابت ہوتے ہیں۔

آج جب میں ماضی کے گلی کوچوں میں سرگرداں ہوں تو زمانۂ حال میرے سامنے ہے بمبئی، دہلی، لکھنؤ اور کلکتہ میں میں نے کمسن بچوں کی بدحالی کا مطالعہ کیا۔ تین سال ہوئے میں نے گاؤں کا دورہ بھی کیا۔ ان والدین سے بھی ملاقات کی جن کے بچے شہروں میں گم ہو گئے ہیں۔ پھر ان بڑے شہروں میں بازار حسن کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ دلالوں سے ملاقات ہوئی۔ بڑی مشکل سے انہیں نے مجھے اپنا دوست سمجھ کر میری عزت افزائی کی کہ مجھے وہ معلومات پہنچائی جس کی مجھے امید نہ تھی میرے یہاں کتنے ہی لڑکے لڑکیاں آتے ہیں۔ میں انہیں دکھی اور پریشان فنکار کہہ کر لوگوں سے ملاتی ہوں۔ میں انہیں نیچا نہیں سمجھتی بلکہ اس نظام پر لعنت بھیجتی ہوں جو انہیں اس طرح استعمال کر رہا ہے۔

پستی میں گرنے کے ہزاروں قصوں میں چند ایسی بھی داستانیں ہیں جن کے سہارے میرے دل میں انسان کی وقعت زندہ ہے۔ آلر بی، بانیٔ علی گڑھ گرلز کالج نے مجھے کتنے ہی واقعات ایسے بتائے جن سے انہیں زندگی میں صرف کالج کے وجود کی وجہ سے واسطہ پڑا۔ ان واقعات کی تفصیل نہ پاپا میاں یعنی شیخ عبداللہ نے اپنی اور آلر بی کی سوانح عمری میں تحریر کی اور نہ کوئی ان کا اور تحریری ثبوت چھوڑا۔

مگر باتوں باتوں میں وہ ان لڑکیوں کا ذکر کرتی تھیں جو ان کی پناہ میں آئیں۔ تعلیم حاصل کی اور زندگی میں کامیابی حاصل کی۔ ان میں سے ایک لڑکی تھی جس کا میں نام نہیں لوں گی۔ جس

کا میاں اور ساس اسے جسم فروشی پر مجبور کر رہے تھے۔ یہ لڑکی پنجاب کے کسی گاؤں سے بھاگ کر آئی تھی بس گھر سے نکل پڑی تھی۔ اس کے پیٹ میں چند ماہ کا حمل تھا یہ اس کی خوش نصیبی تھی کہ اسے ریل میں بیگم ایسی ہجوی مل گئیں جو علی گڑھ گرلز اسکول اپنی بیٹی کو داخل کرانے لے جا رہی تھیں۔ رحم کھا کر انہوں نے اس بدنصیب کو سہارا دیا اور آلر بی کے سپرد کر دیا۔

آلر بی گھبرا گئیں اسے بورڈنگ میں نہیں رکھ سکتی تھیں۔ اسکول میں بھی داخل نہیں کر سکتی تھیں کیونکہ اُسے الف بے کی بھی پہچان نہیں تھی۔

آلر بی نے اسے اپنی رشتہ کی بھانجی کہہ کر ساتھ رکھا گھر کا انتظام اس کے سپرد کر دیا۔ یہاں تک کہ ان کی بیٹوں کو بھی بڑے ہو کر اصلیت کا پتہ چلا انہوں نے اسے بیوہ مشہور کر رکھا تھا اس کے لڑکا پیدا ہوا جسے سارا گھر بے حد چاہتا تھا اور دوسرے بچوں کی طرح اس کے نام کے ساتھ بھی عبداللہ لگایا جاتا تھا۔ وہ بچہ اچھا لائق نکلا اور پاکستان میں بڑی خوشحال زندگی گزار رہا ہے آلر بی تھیں ایک دن اچانک تین لڑکیاں سیدھی اسٹیشن سے کوٹھی پہنچیں۔ ان میں سے سب سے بڑی اٹھارہ انیس کی تھی۔ دوسری چودہ پندرہ کی اور بچی صرف چار سال کی تھی۔

آلر بی گھبرا گئیں۔ اور بھی کئی لڑکیاں مفت بورڈنگ میں رہتی تھیں نہ جانے کیسے مانگ تانگ کر اپنی ضروریات سے کاٹ کر بورڈنگ کا خرچ چل رہا تھا۔ ایک دم تین لڑکیاں جن میں سے ایک اتنی ذرا سی بچی بورڈنگ تھا یتیم خانہ نہیں کھولا تھا ان کی نیندیں حرام ہو گئیں۔

"اگر آپ نے پناہ نہ دی تو ہم تینوں کپڑوں میں آگ لگا کر بھسم ہو جائیں گے یا کنوئیں میں کود پڑیں گے" بڑی لڑکی نے دھمکی دی اور آلر بی سہم گئیں۔

بورڈنگ میں لڑکی گم ہو سکتی ہے کسی کو پتہ نہیں چل سکتا کہ وہ کہاں گئی۔ ان لڑکیوں کے

والدین بقید حیات تھے۔ بڑی لڑکی کی شادی ایک بڑی عمر کے ٹھیکیدار سے ہوئی تھی
جو پہلے ہی دو بیویوں کا شوہر اور درجن بھر بچوں کا باپ تھا اور بد نصیب لڑکی بالکل نوکرانی
کی طرح سارا کام کرتی پھرتی۔ سوت کے ایک عدد بھائی اس پر ڈورے ڈالنے لگے جب
اس نے احتجاج کیا تو آوارہ اور بد معاش ثابت کر کے چار چوٹ کی مار دی۔ لڑکی قرآن
اور اردو پڑھی تھی۔ کسی رسالے میں علی گڑھ گرلز اسکول کا ذکر پڑھ کر بھاگ نکلی دوسری
لڑکی ایک بوڑھے بد دماغ نانبائی سے بیاہی ہوئی تھی، جو اسے بہت دکھ دیتا ہے اور
مزہ یہ کہ تینوں نہایت گوری نازک نقشے کی حسین لڑکیاں تھیں۔

کبھی ان تینوں بہنوں کا احوال پیش کروں گی کہ کس طرح یہ تینوں تاریکی سے نکل کر
روشنی میں نہایت کامیاب زندگی گزارنے کے قابل ہوئیں۔

اصغری بیگم کے ذکر کے ساتھ ہی تین بہنیں یاد آگئیں جنہیں میں آج تک نہ بھول
سکی ——

باجی کی بارات کو خوش آمدید کہنے میرا بچہ کے روؤسا اور انسر پلز پھول لے کر اسٹیشن
پہنچے۔ کسی نے دولہا کو نہیں دیکھا تھا رات کو نکاح ہوا تھا۔ سب بچے بالے سو رہے
تھے۔ ننھے بھائی ذرا پیچھے رہ گئے ایک وہی پہچانتے تھے۔ ڈبے میں سب سے پہلے
ایک نہایت لمبے چوڑے حسین پینتیس سالہ جوان اترے۔ سبز کمخواب کی شیروانی چست
پاجامہ سبز ہی رامپوری بانکی ٹوپی باقی سب کچھ سرخ کاٹے ملگجے۔

لوگوں نے جلدی جلدی انہیں دولہا سمجھ کر ہار پہنا دیئے۔ انہوں نے ایک گرجدار
قہقہہ لگایا اور بولے۔

"صاحبو میں دولہا کا چچا ہوں۔ سہراب خاں۔ وہ رہے صفدر میاں۔"

صفدر میاں کو دیکھ کر ابا میاں کو پسینہ آگیا جیسے دق کا مریض لمبے بانس کی داڑھی
ماتھے پر شکنیں آنکھوں میں تھکان۔

اتنا یاد ہے چھم چھم کرتی گوری گوری ڈھیر ساری عورتیں جب ڈیوڑھی سے اتریں تو
چھپڑیاں ماری گئیں۔ میں نے ایک نیم کی سونٹی سے سمدھنوں کی پنڈلیاں ادھیڑنا شروع
کیں کہ یہ چڑیلیں میری باجی کو لینے آئی ہیں۔ مجھے کوئی گھسیٹتا کے لے گیا اور میں باجی
کے پاس چپک کر بیٹھ گئی۔ باجی بے حد زور زور سے کھانس رہی تھی۔ دور دور آواز جا رہی تھی۔

بہت دن بعد ایک دن چھوٹی آپا نے بتایا کہ باجی کی پہلے بھی ایک جگہ سے بات
آئی تھی۔ نہایت لفنگا رنڈی باز زمیندار کا لڑکا تھا۔ کوئی خان تھا۔ دو ایک خون بھی
کر چکا تھا۔ ان کے پاس ایک چھوٹی سی جاگیر تھی۔ پڑھا لکھا خاک نہیں تھا مگر ان کے خاندانی
جواہرات اور سونے کی پازیبوں کی بڑی ساکھ بندھی تھی۔ خان کی اماں بیگم جب چند رشتہ دار
بیویوں کے ساتھ لونڈیوں باندیوں کا غول سنبھالے آئیں تو ساتھ میں چاندی کی پندینا
اور خاصدان بھی تھا۔ اور وہ لڑکے کا کم سونے اور موتیوں کا زیادہ ذکر کر رہی تھیں۔

"اللہ جھوٹ نہ بلوائے کان پکڑ کے کہتی ہوں ٹوا پورا پان سیر کا چڑھاوا پچاس
ہزار مہر اور چھوٹی حویلی صاحبزادے کے نام ہے بی اللہ آمین کا ایک ہی بیٹا ہے۔"

جب وہ چلی گئیں تو باجی بھن بھن کرتی پھریں۔

"ہم نہیں کریں گے اس کُتّے سے شادی۔" باجی بڑی منہ پھٹ تھیں۔

"ہٹ ہے چپ نگوڑی۔ خبردار جو میرے سامنے زبان کھولی۔ منہ جھلس دوں
گی۔" اماں نے ڈانٹا۔

"منہ جھلسو تو ذرا۔ سرکار سے کہہ دوں گی کہ"

"غضب خدا کا۔ مُئی۔ تجھے اللہ کو سنوار۔ کسو نے سُن لیا تو؟"

"اُنھ کیا کرے گا کوئی ہمارا۔"

پھر ایک دن اماں گئی ہوئی تھیں حکیموں گلی۔ صفی نانا کے ہاں وہ ان کے خالو تھے
ظہور نانا کے داماد۔ خان کی اماں ایک باندی کے ساتھ آن دھمکیں۔

"ارے بھائی ہمائی سمدھن کہاں ہے۔ اے سمدھن بی سمدھن۔"

"کیا ہے؟" باجی اندر سے نکلیں۔

"اے بی! تیری اماں کہاں ہیں۔ لڑکی ساس سے رتی بھر شرم لحاظ نہیں، چھاتی پہ چڑھی چلی آتی ہو۔"

"تم خان کی ماں ہو؟"

"اری دیدہ تو دیکھو۔" وہ چوکی پر بیٹھ گئیں۔

"ہم تمہارے پاجی لڑکے سے شادی ہرگز نہیں کریں گے۔"

سمدھن کی گھگھی بندھ گئی۔ انہوں نے خواب میں بھی ایسی دیدہ پھٹی نہیں دیکھی تھی۔

"اری تیرا چتیا تو نہیں لگ گیا۔"

"چتیا تو تمہارا چھلا ہے بڑی بی۔"

"توبہ جی ......"

"تمہارا اتنا تو بیہودہ لڑکا ہے۔ لفنگا ....."

"بس بس۔ الٰہی توبہ ــــ اری چل حرام زادی۔" انہوں نے باندی کے دھول جما کر کہا۔ اور سرپٹ بھاگیں بڑبڑاتی۔

"اے غضب خدا کا لڑکی ہے کہ تنتیا مرچ، ارے میرے چاند کو ہزاروں لڑکیاں لوگ تھال میں سجا کر دیں گے۔ تھو ہے، کیا لڑکی اٹھائی ہے نچھو بی نے۔"

اُن کے جانے کے بعد جب اماں آئیں تو انہوں نے سر پیٹ لیا۔ مگر باجی ہنستی رہیں۔

"اب کے آئیں گی تو اللہ قسم ہم اُن کی پٹائی کریں گے۔" باجی دھم دھم کرتی کوٹھے پر چڑھ کر پتنگوں کے پیچ دیکھنے لگی وہ چھپ کر کوٹھے پر خود بھی پتنگ اڑاتی تھی۔ اور ڈور لوٹتی تھی۔ جبھی تو اماں کو اس کی شادی کی اتنی جلدی تھی۔ لڑکیاں ویسے ہی والدین کی چھاتی کا بوجھ ہوتی ہیں۔ پھر باجی جیسی دھواں دھار لڑکی اللہ کسی دشمن کو بھی نہ دے۔

اور ابا کے کانوں میں بھی اُڑتی اڑتی خبر پہنچی، انہوں نے چپ سادھ لی بھلا کیا کہتے اُنہیں بھی خان سے چڑ تھی۔ زمینداروں، تعلقداروں سے دوستی تھی لین دین تھا۔ کوئی بچہ پیدا ہوتا تو دور دور سے مہمان آتے۔ طوائفیں آتیں، دو دو دن خوب اُودھم مچتی ناچ گانے کی محفلیں جمتیں۔ ابا میاں کو گانے ناچ سے بڑی دلچسپی تھی۔ اور بڑی شاندار محفلیں جما کرتیں۔

مگر انہیں رنڈیوں سے تعلقات پیدا کرنے کے رواج سے بڑی نفرت تھی۔ ایک سے زیادہ بیوی کے بھی شدت سے مخالف تھے۔

بہت پہلے جب صرف سات بچے تھے شمیم میں اور چنوں نہیں پیدا ہوئے تھے۔ ابا میاں چھٹی لے کر آگرہ میں مکان بنوا رہے تھے۔ ایک حصہ بالکل تیار تھا وہاں قیام تھا۔ اماں اور بچے نہیں آئے تھے۔

نہ جانے کیوں ایک دم اماں چھوٹے ماموں اور منے بھائی کو لے کر آ گئیں۔ منے بھائی کی کھانسی وبالِ جان ہو گئی تھی۔ کئی مہینے سے چل رہی تھی۔ کچھ آب و ہوا کی تبدیلی کچھ صفی نانا کا علاج افاقہ ہونے لگا۔ اماں زیادہ تر حکیموں کی گلی رہتیں۔ کبھی پنجہ شاہی بھی آ جاتیں۔ محلے میں دعوتیں ہوتیں۔ روز کہیں نہ کہیں جانا ہو جاتا۔

ایک دن بھینس والی بڑی اماں کے یہاں جیبی کے منڈوے کے نیچے کھٹولی ڈالے پڑی تھیں کچھ شوہروں کی محبت اور بے وفائی کے قصے چل رہے تھے۔

"بھئی ہمارے میاں تو بس گؤ ہیں، کیا مجال جو کسی سے آنکھ لڑائیں۔ آئے دن بچوں سے تو ذرا سانس لینے کی مہلت ملے۔"

"اے ہے خدا نہ کرے۔"

"بھئی میں تو کہتی ہوں ایک آدھ اور کر لو۔"

کچھ بولیں، بعض منہ سے نکلی بات پھیل جاتی ہے۔"

"خاک پھیلتی ہے۔"

"ہو تو کچھ بسنت کی بھی خبر ہے۔ میں سوچ رہی تھی تم سے کیسے کہوں۔ میرے تو حواس گم ہو گئے جب سنا تو۔"

"کیا سنا؟" اماں کچھ سمجھ گئیں۔

"سب تمہاری چہیتی تند بادشاہی خانم کا کیا دھرا ہے۔"

"نہ جانے کہاں کی ہانک رہی ہو بڑی آماں۔"

پھر بڑی آماں نے بتایا مکان بنوانے کا تو بہانہ ہے۔ ملبہ اٹھتا رہ گیا ہے مگر مرزا قسیم بیگ آگرہ میں براجمان ہیں۔

"کبھی سوچا کہ کیوں؟" بڑی اماں بولیں۔

"اس میں سوچنے کی کیا بات ہے۔"

پھر بڑی اماں نے بتایا۔

راحت خالہ، بڑے ابا یعنی ابراہیم بیگ چغتائی کی چھوٹی سالی کمسنی میں بیوہ ہو گئی تھیں میاں اچھی خاصی جائیداد چھوڑ گئے تھے اردو فارسی کی اچھی خاصی تعلیم پائی تھی۔ کچھ شعر و شاعری سے بھی دلچسپی تھی۔ اماں سے دو چار سال بڑی ہوں گی۔ اماں تئیس چوبیس کی ہوں گی۔ گول مٹول پیاری رنگت سنہری گھنگریالے بال شربتی آنکھیں پھیلا ہوا نقشہ۔

اور راحت خالہ کے لمبے سیاہ ریشمی بال دراز قد دبلی پتلی۔ حزن ملال کی پتلی۔ ترنم سے جب شعر پڑھتیں تو سننے والے جھوم اٹھتے کبھی کوٹھی میں محفل جمتی، ابا میاں بھی کچھ فارسی اور اردو کے شعر کہہ لیتے تھے کسی کو سناتے نہیں تھے۔ یا شاید ان کی صحبت میں رنگ شاعری جاگ اٹھی بچوں کی چل پوں۔ عہدے کی ذمہ داریاں گنتے۔ مرغیاں، گھوڑے، بھینس، بکریاں ایک ہنگامہ، ایک دھواں دھار زندگی! اور پھر آگرہ کی سہانی شامیں گلابی جاڑوں کی بہاریں، پرسکون نیا تعمیر کیا گھر، خوشگوار رومانی سناٹا اور لچکتے ہوئے شعر۔

ابا میاں بھرپور مرد تھے۔ سرپٹ گھوڑا دوڑاتے ٹینس کھیلتے باغبانی کرتے یار دوستوں کی محفلیں، قہقہے ہنگامے۔

پھر راحت خالہ کا حسن سوگوار، تنہا زندگی، انہیں دولت کا لالچ نہیں صرف دو میٹھے بول، مہکتے ہوئے شعر، عمر خیام کی رباعیاں، الوری۔ فانی، حافظ شیرازی، میر اور غالب ذوق، آتش۔

اماں سناٹے میں سانس روکے لیٹی رہیں جیسے انہیں ہلتے جلتے ڈر لگ رہا ہو کہ کہیں بکھر نہ جائیں، پھر ریزہ ریزہ کون چن پائے گا!

واپس آئیں تو میز پر کھانا لگا تھا۔ ابا میاں اخبار پڑھ رہے تھے۔

"کہاں جا کے بیٹھ رہیں، بھوک کے مارے دم نکل رہا ہے۔"

اماں نے ہاتھ مار کر کھانے کی قابیں اچھال دیں۔

"اب بس میری بھی کھا تا!"

"بیگم!" ابا میاں نے اماں کا یہ روپ کبھی نہ دیکھا تھا۔ سہم کے رہ گئے دل میں چور جو تھا۔

آج یہ الفاظ لکھ رہی ہوں تو میرا قلم ڈگمگا رہا ہے۔ وہ ہستی جس کو ہم خدا اور رسولؐ کے بعد سب سے مقدس سب سے معتبر سمجھتے تھے آج میرے قلم کی یہ مجال کہ مرزا قسیم بیگ چغتائی کی اکلوتی بھول، کمزوری اور اصول شکنی پر تنقید کر سکے۔ وہ ہستی جس کی زندگی کا کوئی رخ آلودہ نہ تھا۔ مجھے ان کی کوئی زیادتی کوئی ناانصافی کوئی غلط قدم نہیں یاد میں نے انہیں ہر پہلو سے ایک بھرپور مکمل انسان کی حیثیت سے دیکھا۔

راحت خالہ کا ذکر عموماً مذاق میں ہوا کرتا تھا۔

وہ بڑی محروم، بے انتہا دکھی اور اکیلی اس دنیا سے رخصت ہوئیں۔ شاید میرے آنے سے پہلے ہی وہ چلی گئیں۔

بات یوں نکلی کہ ایک دن شمیم نے اماں کے پان دان سے پیسے جھپٹ لئے، یہ

اس وقت کی بات ہے حبیب میراں اسے کا فلیچہ آگیا تھا اور ابا جو فالج کے بعد بالکل تندرست ہو گئے تھے آرام کرسی پر بیٹھے تھے۔

"ہوں تو تم پاس ہو گئیں" وہ بولے۔

"جی"

"ہوں بیگم دعوت کر دو گی؟"

"اسے ہٹاؤ دعوت اس گرمی میں۔ او کمینے۔ اِدھر لا میرے روپے"

مگر شمیم نے روپیہ جیب میں ڈالے اور دور ٹہل گئے۔

"دیکھ سور روپے واپس رکھ دے نہیں تو کھانا نہیں دوں گی"

"کونسے پکے ہیں اور شکر قند کی کھیر" میں نے اطلاع دی۔

"اور بڑے ماموں کے یہاں سے خشکا اور ماہی قلیہ آیا ہے" بھابی نے تخت پر سے خربوزے کے بیجوں کے چھلکے جھاڑتے ہوئے کہا۔

"کیسی کنجوس ماں ہے۔ ارے ابا میاں راحت خالہ سے خواہ مخواہ کٹی کر لی۔ یہ اماں تو ایسی ظالم ہیں کہ بات بات پر کھانا نہیں دوں گی پانی نہیں دوں گی۔ کیا حضرت عثمانؓ کی کچھ ظالموں سے رشتہ داری تھی" حضرت عثمانؓ سے ہماری ننھیال کا شجرہ شروع ہوتا ہے۔

"اچھا زیادہ بک بک نہ کر، بے حیا کہیں کا، غضب خدا کا چھوٹی بہن بی اے پاس ہو گئی اور نگوڑا دسویں میں مر گیا"

"دیکھئے، ہر وقت جلی کٹی سناتی رہتی ہیں۔ راحت خالہ ہوتیں تو"

"ارے تو کیا ہے، اب بیاہ لا دو نئی نویلی اماں"

"اچھا تو یہ بات ہے" شمیم نے ذرا دور کھمبے کی آڑ لیتے ہوئے کہا۔ میں بھی بیاہ نہ لا کے بٹھا دوں تو میرا نام شمیم بیگ چغتائی نہیں"

شمیم ایسے بھونڈے مذاق کرتا تھا پر نہ جانے کیوں ہنسی نہیں رکی تھی اس نے اتنا

سنجیدہ چہرہ بنا کر دھمکی دی کہ اماں اور ابا دونوں کو ہنسی دبانی مشکل ہو گئی۔ شمیم نے آکر پیچھے سے کہا۔

"دیکھو بڑے میاں کا چہرہ گلنار ہو گیا، دولہا بننے کے ذکر سے کھل اٹھے"

"چل بدتمیز"

"ارے تو کیا میں مذاق کر رہا ہوں۔ قسم خدا کی تھوڑا خضاب لگا لیں تو اب بھی جوان دھرے ہیں۔ نہ چہرے پر جھری نہ ہاتھوں پر بڑھاپا" پھر اونچی آواز سے بولے۔

"شرع میں تو چار کا حکم ہے سچی نئی اماں کچھ تو خیال کرے گی"

اتنے میں ماموں آ گئے اور کھانا لگنے لگا۔

کھانے کے بعد میں نے اماں سے پوچھا۔

"بی یہ راحت خالہ کا کیا قصہ تھا"

تب انہوں نے شروع سے لے کر آخر تک سارا قصہ سنایا۔

کھانا الٹ کر اماں رونے بیٹھ گئیں۔

ابا خاموش سر جھکائے بیٹھے رہے پھر بولے۔

بیگم ہم تمہارے مجرم ہیں۔ ہم سے غلطی ہو گئی۔ ہم نے نکاح کر لیا"

"مجھے معلوم ہے"

"تم جو سزا دو ہمیں منظور ہے"

"میرے بچے بلوا دو۔ میں آگرہ میں رہوں گی"

"یہ کیا کہہ رہی ہو بیگم، ہم تمہارے اور بچوں کے بغیر کیسے جئیں گے"

"تمہاری لاڈلی"

"تم ہو ہماری لاڈلی، ہماری زندگی، ہمارا ماضی اور مستقبل!"

"مگر نکاح کرتے وقت ------؟" اماں کا گلا بند ہونے لگا "سات بچوں کے باپ"

"ہمیں خبر نہیں ہم اس وقت کہاں تھے۔ جب ہمیں ہوش آیا اور نکاح نامہ پر ہم نے دستخط دیکھے تو ہمارے ہوش اُڑ گئے۔ ہم اُسی وقت وہاں سے اُٹھ کر چلے آئے۔"

"پھوپھی بادشاہی کے ہاں ہوا نکاح؟"

"ہاں۔"

"ہوں تو اُن کے دل کی تمنا پوری ہو ہی گئی، میری مانگ اجاڑ کر چین آ گیا۔"

"ابھی تو ہم زندہ ہیں بیگم۔ کاش مر جاتے۔ نہیں ہمیں مرنے کا کوئی حق نہیں ہم جینا چاہتے ہیں۔"

"میں جانتی ہوں بادشاہی خانم نے تمہیں کچھ کھلا دیا ہوگا۔"

"نہیں بادشاہی نے کچھ نہیں کھلایا۔"

"تو پھر اتنے ننھے تو نہیں۔"

اماں نہیں جانتیں انسان کبھی کتنا ننھا ہو جاتا ہے۔ بالکل صفر رہ جاتا ہے۔ مگر ابا میاں جھوٹ نہیں کہہ رہے تھے۔ انسان اپنے بچاؤ کے لئے ذہن میں دیواریں کھڑی کر لیتا ہے۔ جن خواہشوں کے آر پار نہیں دیکھنا چاہتا اُن پر خود فراموشی کے دبیز پردے ڈال لیتا ہے۔ خود اندر گم ہو جاتا ہے اور ڈھونڈ کر ہار جاتا ہے۔ ایک با اصول انسان کے لئے کوئی اصول توڑنا بڑے جوکھم کا کام ہے۔ جاگتے میں خواب کی کیفیت طاری کر لیتا ہے۔ ریشم کے کیڑے کی طرح ایک خول بُن لیتا ہے۔

مجھے طلاق تو نہیں دو گے۔" اماں نے ننھی سی آواز میں پوچھا۔

"طلاق! بیگم۔"

"میرے بچے طلاقن کے بچے کہلائیں گے۔ کوئی میری بیٹیوں کو قبول نہیں کرے گا کہ جیسی ماں ویسی بیٹی، کوئی تو کھوٹ ہوگا کہ قسیم بیگ چغتائی کو طلاق دینا پڑی۔ اچھا میرے سر پر ہاتھ رکھ کے قسم کھاؤ کہ مجھے طلاق نہیں دو گے۔" انہوں نے ابا میاں کا ہاتھ اٹھا کر سر پہ رکھ لیا۔

"ہم نے اُسے ہاتھ نہیں لگایا ہے۔ اور ہم قسم کھاتے ہیں کہ ہم اُسے ہاتھ لگائیں تو ہم کریم بیگ چغتائی کے نطفہ سے نہیں۔"

"ہے ہے نہیں، یہ ...... یہ تو گناہ ہو گا۔"

"ہمارا ضمیر جس بات کو گناہ سمجھتا ہے۔ وہ گناہ ہے۔"

"اللہ کے واسطے یہ دہریہ پن غارت کرو۔ اللہ کا قہر......"

"ہم سہہ لیں گے۔"

"یہ تو کفر ہے، اس کا عذاب بچے بھگتیں گے۔"

"خدا کے ہاں قطعی ایسی اندھادھند نہیں ہوگی۔ یقیناً ہر انسان اپنے اعمال کی سزا اور جزا پائے گا۔"

"سرکار" تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد بولیں۔

"ہاں بیگم۔"

"اب تم ہزار شادیاں بھی کر لو مجھے پروا نہیں۔"

"کیوں کیا اب تمہیں ہم سے محبت نہیں رہی۔"

"یہ بات نہیں۔"

"شریف بیویاں محبت نہیں کرتیں اپنے خدائے مجازی کی پرستش کرتی ہیں۔" بیگم

"پرستش پتھروں کی کی جاتی ہے۔ ہم انسان ہیں تمہارے اپنے۔"

"تو بس آج ہی چلو، خاک ڈالو اس کوٹھی کو تنہا ہو گئی بن جائے گی۔"

اُسی دن اماں ابا میاں کو لے کر کانپور روانہ ہو گئیں۔

کانپور میں فرقہ وارانہ کشیدگی بڑھ رہی تھی۔ ابا میاں کی عجیب پالیسی تھی ویسے تو افسروں اور رئیسوں سے بڑے گہرے تعلقات رکھتے تھے ساتھ ساتھ ہر جمعہ کو نماز پڑھنے شہر کی مختلف مسجدوں میں ضرور جاتے مع بیٹوں کے اور وہاں کے مولویوں اور

بانکے یلاٹکٹ آرہے تھے۔ کاکوری ملیح آباد سے ڈھول تاشے پیٹنے والے پٹہ باز مشعالچی آرہے تھے۔ غرض بڑی دھوم تھی۔ ابا میاں کی نیندیں حرام ہو رہی تھیں انہوں نے اپنے چند مخلص دوستوں سے جو دونوں فرقوں کے مہذب اور صلح پسند مزاج کے تھے یونہی تذکرہ کیا۔ اور باتوں باتوں میں یہ طے پایا کہ سرکار اس فساد کی اہمیت کو نظر انداز کرنا چاہ رہی ہے۔ ابا میاں سرکار کے بڑے فرماں بردار مانے جاتے تھے دلوں میں ان کی عزت بھی تھی اور برٹش راج کے مخالفین کو ان سے نفرت بھی تھی۔ کچھ بھی ہو ابا میاں ہندوستانی ہی تھے، نوکری بھی اہم تھی اور خون خرابے سے بھی خوفزدہ تھے۔

بڑے سوچ بچار کے بعد طے ہوا کہ جتنے لوگ دونوں طرف سے شریک ہو سکتے ہوں، ہوں تکلف نہ کریں کیونکہ جس سڑک سے جلوس تعزیوں کا گذرنے والا تھا سڑک کے کنارے خلقت جمع ہوگی اگر اس بھیڑ میں خود نہ جا سکیں تو کم از کم تگڑے تندرست جوانوں کو تو بھیج ہی دیں۔ نوکروں ہی کو بھیج دیں۔

چند زمینداروں سے ابا میاں نے بات کی انہوں نے بڑے فخر سے اپنے لٹھیت بھیج دیئے جو جلوس والے دن سے پہلے ابا میاں سے دو دو تین تین کی ٹکڑیوں میں ملے اماں کو کچھ خبر نہ تھی نھنے بھائی اسحاق بھائی چھوٹے ماموں اسحاق بھائی کے دو بڑے بھائی شفقت اور مقبول اور ابا کے دوست کے لڑکے ادہم عثمان اور ادہم سلیمان جنہیں انہوں نے چھوٹی سی عمر سے پالا تھا، ان کے علاوہ باورچی بہشتی دربان اور دو تین چوکیدار جو مسلمان تھے مقرر کئے گئے کہ جب محلہ سے تعزیہ گشت کے لئے اٹھے تو ساتھ ہو لیں اور تعزیہ کے آس پاس ہی رہیں۔ موقع ملے تو کندھا بھی دیں۔

پھر مالی دھوبی مہتر کو جو ان گراسکٹ گھوسی اس کا مددگار، اوپر کے کام کے نوکر ہندوؤں کے ساتھ پیڑ کے آس پاس گھومتے رہیں۔

"کیا گولی چلے گی صاحب" انہوں نے پوچھا۔

"نہیں گولی نہیں چلے گی۔ مگر ہمارے ساتھ سپاہی انسپکٹر اور سپرنٹنڈنٹ ہوں گے ہم جلوس کے آس پاس ہی رہیں گے۔ سپاہیوں میں زیادہ مسلمان ہیں اور ان سے ہماری بات نہ ہو سکی۔ ہم نے کسی سرکاری ملازم سے بات نہیں کی ہے۔ ہمارا مقصد فساد کی روک تھام ہے۔"

"مگر سرکار وہاں تو دور دور سے غنڈے بلائے گئے ہیں۔"

"دس بارہ غنڈے بلائے گئے ہوں گے۔ بس اتنے ہی فساد شروع کرنے کے لئے کافی سمجھے جاتے ہیں اور ہم نے گنتی قریب قریب معلوم کر لی ہے ایک دفعہ جھگڑا شروع ہو جائے پھر غنڈے نوجوان بچا کر سرک لیں گے احمق جوشیلے نوجوان گھمسان میں کود پڑیں گے۔"

نھنے بھائی کمسن تھے مگر خوب تگڑے تھے۔ باقی لڑکے بھی کافی چھوٹے تھے مگر عمر کے اس دور سے گذر رہے تھے۔ جب مار پیٹ میں لذت ملتی ہے۔ چند لوگوں نے چاقو لے جانے کی رائے دی ابا نے سختی سے منع کر دیا۔

"لاٹھی بھی نہیں؟"

"تنکا بھی نہیں، ورنہ، جانے کی کوئی ضرورت نہیں، جان پیاری ہے تو گھر میں بیٹھو۔"

اماں بڑی دھوم دھام سے محرم مناتی تھیں۔ چوڑیاں اتار دیتی تھیں سفید دوپٹہ عشرے تک اوڑھتی تھیں پہلی پانچویں ساتویں نویں دسویں کو بے حد شربت شیرمال کباب تر بتر حلوے بانٹے جاتے تھے۔

ابا نے نویں کی رات کو اماں کو بتا دیا کہ فساد کی روک تھام کے لئے ان کی ڈیوٹی لگی ہے اماں نے ماتم شروع کر دیا۔ گریبان میں جھول گئیں۔

"اب تو رات ہو گئی ہم اپنی نوکری سے سبکدوش بھی نہیں ہو سکتے۔ ہم نے غلطی کی تمہیں بتا دیا۔"

"اگر کچھ ہو گیا تو؟"

"ہم کہتے ہیں کچھ نہیں ہو گا۔ ہم نے کبھی تم سے جھوٹ بولا ہے؟"

اماں مرعوب ہو گئیں۔ مگر صبح جب جانے لگے تو صدقے کا بکرا ہیم سے بندھا تھا۔ اماں بار بار بیت الخلا جا رہی تھیں۔ سب لڑکیاں منملا رہیاں اور محلہ کی عورتیں جمع ہو کر قرآن خوانی کر کے اس میلوں دور سڑک کی طرف پھونک رہی تھیں جدھر سے جلوس گذرنے والا تھا اور موت کا فرشتہ منڈلا رہا تھا۔

اماں دروازے تک دوڑتی ساتھ چلیں، چوکھٹ پھلانگنے سے پہلے پکڑ لیا۔ اور واپس لا کر دادی اماں کو سلام کروایا، بڈھی بی یعنی ابا کی پھوپھی اور اماں کی دادی سے دعائیں دلوائیں پھر قبلہ کی طرف بیٹھا کر کہا آیت الکرسی پڑھو۔

"بھئی یاد نہیں، دیر ہو رہی ہے۔ تم پڑھ دو بیگم۔"

اماں کو تو کچھ یاد ہی نہیں رہتا تھا۔ مگر خوب سی دعائیں پڑھ کر پھونکیں اور بچیوں کو قرآن پڑھنے بٹھا دیا۔

درجنوں ڈھول بج رہے تھے جھانجھ کانوں کے پردے پھاڑ دے رہے تھے۔ پیک کمر میں گھنٹیاں ٹھنکاتے بلم بلند کئے بھاگتے نکل جاتے۔ اُف اس موقع پر بچے کہاں سے کلبلا کر نکل پڑتے ہیں۔

سپرنٹنڈنٹ انگریز تھا اس کا منہ چقندر کی طرح لال ہو رہا تھا۔ سپاہیوں کی قطاریں دورویہ پیدل چل رہی تھیں۔ اتنے بڑے جلوس کی نگہداشت صرف لاٹھی بند بارہ سپاہی تھے۔ انسپکٹر ہندو اور سب انسپکٹر مسلمان تھے۔ پوری پولیس فورس میں صرف تین چار ہندو باقی مسلمان اور ایک انگریز تھا۔

وہی ہوا جس کا پلان بنایا گیا تھا۔ تعزیہ صرف چند انچ بڑا تھا۔ کندھا دینے والے پنجوں کے بل چل رہے تھے اور کافی قد آور تھے، پھر بھی چھ سات انچ کا

سوال تھا۔ سوائے کندہ کاٹنے کے اور کوئی چارہ نہیں۔ اور دو چار منچلے لپکے پیڑ پہ چڑھے ہاتھا پائی شروع ہو گئی۔

ابا میاں نے کہا "ٹھہرو" ان کی آواز میں ہاتھی کی چنگھاڑ تھی۔

ابا میاں ٹھیک کندے کے نیچے کھڑے ہو کر اوپر دیکھنے لگے۔

"اگر کندہ نہ کاٹا جائے۔"

"تعزیہ نہیں نکل سکتا۔"

"اگر ....."

"تعزیہ جھکے گا نہیں۔ بے حرمتی ہو گی۔"

"نہیں تعزیہ جھکے گا نہیں مگر نکل جائے گا۔"

"وہ کیسے؟"

ایک دم تین چار آدمی پھاوڑہ لئے بھیڑ سے نکلے۔

"ہم سڑک کھود ڈالیں گے۔"

"مگر سڑک؟ ...... نئی سڑک۔"

"پھر بن جائے گی۔ کنکر ہی تو کٹے ہیں۔" ابا پھاوڑہ چلانے لگے جلدی سے خانساماں نے پھاوڑہ چھین لیا اور جٹ گیا۔ ابا میاں نے دیکھا آس پاس بہت سے اپنے پیارے دوست خدمت گار موجود تھے۔

"وارٹ از دس نان سینس سپوائیلنگ دی نیو روڈ" سپرنٹنڈنٹ بولا۔ اسے سخت غصہ آ رہا تھا۔

مگر دم بھر میں ڈیڑھ گز لمبی چوڑی فٹ بھر گہری قبر سی کھد گئی اور فرقہ ورانہ فساد دفن ہو گیا۔ ابا نے لپک کر تعزیہ کو کندھا دیا۔ ان کا قد چھوٹا تھا دوسری طرف سے بہشتی نے لپک لیا۔ دو چار اور بڑھے باقی کے لوگوں کو تعزیہ کا توازن قائم کرنے کے

لئے گھنٹوں میں جھبول ڈالنا پڑا۔

ابا میاں کی اس پالیسی کا شہر بھر میں غلغلہ مچ گیا۔ فساد پسند تو گنتی کے ہی ہوتے ہیں۔ اکثر تو صلح پسندوں ہی کی ہوتی ہے نہ خون خرابہ ہوا نہ گولی چلی۔

تھوڑی دیر تو انگریز افسر چیں بہ جبیں چلتا رہا۔ پھر اس کے چہرے سے رعونت کی سرخی اترنے لگی۔ اور وہیں اگلے اتوار شکار کا پروگرام بن گیا۔ ابا میاں چٹکیوں میں بڑا دیرپا دوست بنا لیتے تھے۔

لوگوں کا خیال تھا کہ اتنی کامیاب ترکیب پر ابا میاں کو ترقی ملے گی۔ انہیں سیدھا سے کلکٹر بننا چاہیئے تھا، خان بہادر کا خطاب تو سن گیارہ میں مل گیا تھا۔ مگر جب ان پر کمیٹی بیٹھ گئی اور سسپینڈ کر دیے گئے تو سب مبہوت رہ گئے۔

آپ کو معلوم تھا کہ فساد ہوگا۔"

"جی ہاں" ابا میاں نے جواب دیا۔

"کیا آپ بھی شریک تھے؟" "نہیں۔"

"تو پھر اتنی پکی خبر کیسے ملی؟"

"میرا رسوخ ہے۔ شہر کے دونوں فرقوں کے لوگوں سے میرا گہرا تعلق ہے میں کان کھلے رکھتا ہوں اور دماغ حاضر۔"

مگر کمیٹی کے ممبر جو انگریز تھے اور صرف دو ہندو اور مسلمان تھے بالکل گم بیٹھے تھے اور ہر بات پر رضامندی کا اظہار کر دیتے۔

میں نے جو کچھ بھی کیا اس کے نتیجے میں فساد ٹل گیا۔ اور تمام وہ فسادات جو دوسرے شہروں میں یہاں کی خبر سے ہونے والے تھے ماند پڑ گئے۔ ہوئے ہی نہیں اور ہوئے تو بہت کمزور۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔ مگر تم نے سڑک کھودنے کی اجازت نہیں لی تھی۔ اور جو بھی

پلان بنایا تھا اُسے ہمارے سامنے پیش کر کے عمل پیرا ہونے کی اجازت نہیں طلب کی۔ اس سے تمہاری باغیانہ طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ جو حکومت کے لئے بہت بڑا خطرہ بن سکتی ہے۔" پھر ابا میاں کے وکیل بولے۔

ایک شہری کی حیثیت سے میرے مؤکل نے جو قدم اپنی ذمہ داری پر اٹھایا وہ درست ثابت ہوا۔ صرف سڑک کھودنے پر میونسپلٹی باز پرس کر سکتی ہے اور جرمانہ ہو سکتا ہے۔"

"سرکاری افسر کو شہریت کے سوال کو بعد میں لانا ہوگا۔ پہلا سوال ڈیوٹی اور پروٹوکول کا ہے۔ ہر بات قاعدے سے ہونی چاہیئے۔ اصول توڑنا بغاوت کی نشاندہی کرتا ہے۔

CHARGE OF

اور ابا کو وہ انگریزی نظم یاد آ گئی۔ THE LIGHT BRIGADE

THEY,RE NOT TO REASON WHY,

THEY,RE BUT TO DO AND DIE

جب وکیل نے جو بڑے کٹر ہندو تھے یہ نظم دھیمی آواز میں دہرائی تو کمیٹی کے ممبر بے حد بگڑے۔ مگر ابا میاں بالکل مطمئن تھے۔ ان کی ترقی تو نہیں ہوئی معطلی کے احکامات منسوخ ہو کر تبادلہ ہو گیا۔ کیونکہ مسٹر اجی نے لندن تک جانے کی دھمکی دے دی تھی۔ بات رفع دفع ہو گئی۔ اور ابا کالی پور کے دوستوں کو چھوڑ کر لکھنو چلے گئے۔ جہاں ان کا پہلے بھی تقرر ہوا تھا جب چھوٹی آپا پیدا ہوئی تھیں۔

میری یادداشت مجھے پھر واپس لوٹا کر بہرائچ لے جا رہی ہے۔ ہمارا پہلا مکان معمولی سا تھا۔ آس پاس کے مکانات تھے جن سے اماں تو خوش تھیں ابا میاں کو وحشت ہوتی تھی۔ اس گھر کا مجھے املی کا پیڑ یاد ہے جو دیوار کے پیچھے صغریٰ بنوں کے گھر میں تھا۔ مگر آدھا ہمارے آنگن میں جھک آیا تھا۔ قریب نہ کھیت تھے نہ جنگل پھاٹک کے آگے سڑک تھی۔ اس لئے پہرے دار کسی بچے کو باہر نہیں نکلنے دیتا تھا۔ گھوڑے سے صرف د،

رہ گئے تھے۔ وہ بھینس بھی تھیں اور مرغیاں بھی جھابوں میں بھر کے ریل سے آ گئی تھیں۔ احاطہ بہت بڑا نہ تھا مگر دیوار پھاند کر کود جاتے تو ایک پرانی دھندھار کوٹھی تھی۔

گرد کا کہنا تھا وہاں بھوت رہتے ہیں۔ ہماری ننھیال کے لوگ بڑے باتونی تھے اور جگنو بھی بڑی لمبی چوڑی باتیں بگھارا کرتے تھے، وہ جے گڑھ کے بھوتوں، چڑیلوں اور جنوں کے قصے سنا کر روح قبض کیا کرتے تھے۔ بندروں کو ہنومان جی کا رشتہ دار کہہ کر ہمیں انہیں سلام کرنے کی رائے دیتے تھے اور ہم ہنومان جی سے بے حد مرعوب تھے۔ کوچوان جھنگری رام کے پیچھے پڑ کر ہم ان سے رامائن کی کہانیاں سنا کرتے تھے

ہنومان جی کی دم میں آگ لگی تو ساری لنکا پھونک دی بچپن سے میری عادت ہے کہ جو بھی کہانی سنتی تھی تخیل میں وہ سارا ڈرامہ نظر آنے لگتا تھا۔ اب تو فلموں میں دیکھا مگر اس سے پہلے جب بہت چھوٹی تھی جب ہی میں نے کوچوان سے سن کر ہنومان جی کو لنکا پھونکتے دیکھ لیا تھا۔ بندر جو عموماً بے وقوفی کی حرکتیں کرتے ہیں مجھے بے حد ہوشیار نظر آتے تھے جیسے ابھی بول پڑیں گے۔ اور پھر چھنگلی پر پہاڑ اٹھا لانا کمال تھا۔ لکشمن جی گھائل ہو گئے۔ تب سنجیونی بوٹی لانے ہنومان جی چلے بوٹی بہت ڈھونڈی نہ ملی تو پورا پہاڑ اٹھا لائے۔ مجھے بے حد ہوشیاری کی بات لگتی تھی۔ مجھ سے جب کوئی خاص تاگہ یا سوئی منگائی جاتی تو میں بار بار کے چکر اور ڈانٹوں سے بچنے کے لئے پوری قینچی اٹھا لاتی تھی اس پر مجھے ڈانٹ پڑتی تھی کہ کاہل مٹھس ہوں۔ اور میں قینچی واپس رکھتے ہوئے بڑی فکرمندی ہو جاتی کہ ہنومان جی نے بھی پہاڑ واپس لوٹایا ہوگا کہ نہیں۔ کوچوان سے پوچھنا کبھی یاد نہ رہا۔

جب بھی بڑے سُر میں جھوم کر کوچوان کوئی رامائن کی کتھا سناتے آخر میں کہتے۔

"بولو شری رام چندر کی جے"

اور ہم بڑے زور سے جے جے کار کرتے۔ کہانی کا بہترین حصہ گلا پھاڑ کر جے جے کار کرنا ہی لگتا تھا اور کوچوان کا کہنا تھا، جو ایک بار بھی رام نام لے لے اس کا کلیان ہو جاتا ہے۔

لیکن جگنو نے کہا جے جے کار کرنے کے بعد میری زبان دوزخ میں جلے گی۔ مجھے دوزخ سے بہت ڈر لگتا تھا میری سٹی گم ہو گئی۔ دوزخ کے اتنے بھیانک نقشے جگنو نے کھینچے تھے اور میں نے تخیل میں خون پیپ کے پیالے پیتے، آروں سے چیرتے انگاروں پر کباب ہوتے سانپ مُنہ میں گھستے دیکھ کر سوتے میں چیخیں ماری تھیں۔ میں کسی شرط پر دوزخ میں جانے کو تیار نہ تھی۔ اُدھر کوچوان کہتا تھا شری رام چندر کی جے نہ بولی تو نرک میں جاؤں گی نرک کم بخت بھی بے حد خوفناک جگہ ہے وہاں بھی سانپ بچھو انگارے اور جسم کو چیرنے کے اوزار ہیں جن کے خیال سے ہی روح فنا ہوتی ہے۔

میری بڑی مشکل ہے اندرا کہتی ہے اگر میں نے جیسس کرائسٹ کے اسٹیچو کے سامنے گھٹنے ٹیک کر گناہوں سے توبہ نہیں کی تو صفا ہیل میں جاؤں گی۔ میں ان تینوں خوفناک مقامات پر جانے پر راضی نہیں۔ مگر جگنو کہتے ہیں گرز مار مار کر مجھے لے جایا جائیگا۔

"میں کہیں بھاگ جاؤں گی"

"ارے فرشتوں سے کہاں بچ کر بھاگو گی!"

جب باجی تھی تو کوئی مارنے کی دھمکی دیتا تو باجی کی گود میں چھپ جاتی تھی۔ مگر باجی کہاں ہوگی وہ تو اپنے لمبے بانس دولہا کے ساتھ سسرال گئی۔ اور میں دنیا بھر کی سسرالوں کا ماتم کرنے لگتی۔ اُف! الفرت تھی۔ مجھے ان نامعقول سسرالوں سے یہ بھی کوئی چوتھی جگہ ہوگی۔ دوزخ نرک اور ہیل کی رشتہ دار سسرال! ابا بو کے ہاں بڑی زوردار مجلسیں ہوا کرتی تھیں۔ صغریٰ اور بتول بے حد زور کا ماتم کرتی تھیں میں اور بچوں کے ساتھ مجلسوں میں تبرک کی تاک میں جاتی تھی اور مرثیے سن کر بے حد بور ہوتی تھی۔

پھر میں کچھ بڑی ہوئی اور غور سے سننے لگی تب بھی کچھ زیادہ سمجھ میں نہیں آیا۔ مگر ایک دن علی اصغر کی شہادت کا بیان میرے پلے پڑ گیا۔ چھ ماہ کے معصوم بچے کے گلے

میں تو پہلا تیر لگا اور خون میں لت پت ہو گیا۔

سب بیویاں اونچی آواز سے رو رہی تھیں۔ مجھے بھی بہت زور سے رونا آ گیا

بیویاں تو نہایت مہذب انداز سے لے سُر میں رو رہی تھیں، میں بے حساب چنگھاڑنے لگی۔ میری آواز ہمیشہ جملہ رونے والوں سے اونچی جاتی تھی۔ ساتھ ہی میں نے وہیں چاندنی پر مچلنا شروع کر دیا۔ احتجاج کا یہ طریقہ ہمیشہ کامیاب ثابت ہوا کرتا تھا۔

مگر...... مجھے ڈھٹائی سے مچلنے پر گھسیٹ کر مجلس سے باہر کر دیا گیا۔ اور دوسرے بھی میرے ساتھ ہی نکال دیے گئے۔

گھر پہنچ کر بھائیوں نے میری شکایت کی۔

"یہ بھتنی وہاں مچلنے لگی۔ ہم سب کو نکلوا دیا۔ مٹھائی بھی نہیں ملی۔"

"کیوں مچل رہی تھی؟"

"تو کیوں مارا؟"

"کسے؟ ناشدنی"

"چھ مہینے کے بچے کو۔ ذرا سا تھا بے چارا۔"

"اے ہے کس کا بچہ مر گیا؟" خالہ اماں خراٹے روک کر چونکیں۔

"اے دیوانی ہے کم بخت۔"

"تو مارا ہی کیوں؟" میں اڑ گئی۔

"اے نہ جانے کیا بک رہی ہے خرافات چل دور ہو۔"

میں روتی ہوئی لحافوں والی کوٹھی میں میلے گاؤ تکیے سے لگ کر خوب روئی۔

رات کو مجھے اکیلے سوتے ڈر لگ رہا تھا۔

"شیخانی بوا تمہارے پاس آ جاؤں؟"

"آ جاؤ۔" انہوں نے سرک کر مجھے پاس لیا گیا۔ باجی کے بعد جب شیخانی کو

فرصت ملتی تو میری چوٹی نکالتیں۔ پانچ پھول میں تلنے والی شاہزادی کی کہانی سناتیں۔

"پھر بھی ایک روز چھ پھول چڑھ گئے پر پلا نہ جھکا۔"

"کیوں کیا بہت موٹی ہو گئی تھی شہزادی۔ بہت کھاتی تھی؟" میں خود بھی تو بہت کھاتی تھی۔

"ارے ناہیں۔ اُو کا سپنے میں سہجادا دکھائی دے گا۔"

"شہزادے نے اُسے بھادی کر دیا۔"

"ناہیں بھائی، اُو بات ای ہے کہ اُو کا سہجادے سے عسک ہوئی گوا۔"

"عسک کیا ہوتا ہے بوا؟"

"اے بھائی تم تو بھیجا کھائے جات ہو۔ بھاگو ہم نہ سناوب گے کہانی۔"

اُف، یہ میری "کیوں" بڑی بے ڈھب تھی۔ میں نے شیخانی بوا سے پوچھا "علی اصغر کو کیوں مارا؟"

"کا معلوم۔"

"کس نے مارا؟"

"آجید مارس رہے۔"

"کیوں؟"

"ارے بھائی ہم کا جانی۔ اُو کھراب رہے پچھے کا مارڈراس اب سوئی جاؤ۔" اور میں سو گئی تھی۔ مگر رات کو کئی بار چونک کر چیخیں مارتی رہی۔

وہ تو چند سال ہوئے ایک مجلس میں اصغر معصوم کی شہادت کا ذکر سنا تو مجھے یاد آیا کہ وہ حضرت انیس تھے جنہوں نے مجھے بچپن میں جھنجھوڑ ڈالا تھا۔

جب دن میں حسین اصغر بے پر کو لائے — لختِ جگر بانوئے دلگیر کو لائے

جلادوں میں اس صاحبِ توقیر کو لائے — ہاتھوں میں دھرے چاند سی تصویر کو لائے

شبیر نے اس چاند کو ہاتھو پر اُٹھایا
چلّے سے کماں باز نے واں تیر ملایا

تب تم ہو کے اسے مثل کماں شہ نے جھکایا   مانند اجل ظلم و ستم آیا
شبیر چھپا نے رہے نازوں کے پلے کو   بازو پہ لگا توڑ کے ننھے سے گلے کو

دل سہم گیا چونک پڑے اصغر مہ رو
گردن سے لہو بہنے لگا آنکھ سے آنسو

فوارہ چھٹا حلق سے بچے کے لہو کا   سب خون میں تر ہو گیا ننھا سا شلوکہ
دم آکے رکا حلق میں اس تشنہ گلو کا   خوں منہ سے اُگلنے لگا وہ دودھ کا بھوکا

ابا میاں سے میری شکایت کی گئی۔

ابا میاں یہ سو رہا ماتم کرتی ہے۔ شمیم کافی بدذات ہے۔ ہر دم لگائی بجھائی سے کام

"تم ماتم کرتی ہو؟" ابا میاں نے مجھے پاس بلا کر پوچھا میں نے منڈیا ہلا دی۔

"کیسے کرتی ہو؟" میں نے نمونہ پیش کیا۔

"ایسے نہیں" ابا میاں نے میرا ہاتھ پکڑ کر زور زور سے سینے پر مارا "جتنی زور سے ماتم کرو اتنا ہی زیادہ ثواب ملتا ہے۔"

"اوئی یہ کیا کم بخت کو شہ دے رہے ہیں، ویسے ہی دیوانی ہے۔ ماتم کرنا حرام ہے گناہ ہوتا ہے۔" اماں بولیں۔

"یاد ہے تمہاری مینا کو بلی کھا گئی تھی تو کتنا ماتم کیا تھا۔"

"اے واہ میں نے چھاتی تو نہیں کوٹی تھی۔"

"ماتھا تو کوٹا تھا۔"

"اے جب تو نادان تھی۔"

"تو یہ بیچاری کونسی بوڑھی ہو گئی ہے۔ بیگم بھیانک مظالم کے ذکر سے بچے

سہم ہی جاتے ہیں تو کیا گناہگار ہوتے ہیں۔ جبر تم اپنی نذر و نیاز سے اچھا خاصہ ثواب کما لیتی ہو۔ ہم سب کی مغفرت ہو جائے گی۔ اور سنا ہے تم نے ہمارے گردے کے آپریشن کے وقت اجمیر میں چادر چڑھائی اور پھر بھی اطمینان نہ ہوا تو ستیہ نارائن کی کتھا بھی کروائی۔ پنڈت جی کو دھوتی اور دوشالہ دیا۔ ہم نے تم سے پوچھا بھی نہیں تم نے ہمارے لئے جو کچھ بھی کیا وہ گناہ تھا یا ثواب حرام تھا یا حلال ہم نے تم سے کبھی کچھ نہیں پوچھا۔"

میری بڑی مصیبت میں جان تھی۔ کوچوان کہانی نہیں سناتا۔

"شبری نے شری رام چندر کو جھوٹے بیر کھلائے تھے۔ وہ کہانی سناؤ کوچوان" میں خوشامد کرتی ہوں۔

"پھر سیارام چندر کی جے بولو گی؟" وہ شرط لگاتا ہے۔ میں راضی ہو جاتی ہوں۔

"شبری نے سری رام چندر جی کو بیر کھلائے تو آدھے کاٹ کاٹ کر....."

"کیوں؟"

"کہ بیر میں کوئی کیڑا دیڑا نہ ہو۔ اچھے اچھے بیر کھلائے۔ کیڑا لگے بیر پھینک دیتے۔ بولو سیارام چندر کی جے" میں ادھر اُدھر دیکھ کر جے بول دیتی ہوں۔ ورنہ پھر وہ سروپ نکھا کی ناک کان کاٹنے کا قصہ ہرگز نہیں سنائے گا۔ ادھر ادھر اس لئے دیکھ لیتی ہوں کہ جگنو کہتے ہیں جے بولنے سے سخت گناہ ہوتا ہے۔ میری زبان میں فرشتے کانٹے چبھوئیں گے۔ اور دہکتی آگ میں میری زبان جلائی جائے گی۔

میں رات سے بہت ڈرتی ہوں۔ ڈراؤنے خواب مجھے بہت ستاتے ہیں خواب میں دیکھتی ہوں کہ میری زبان دہکتے کوئلوں پر مینڈک کی طرح پھدک رہی ہے۔ میں چیخنے لگتی ہوں اور دھموکہ مار کے جگا دی جاتی ہوں پھر آنکھ بند کرتے ڈرتی ہوں۔ جگنو کی رائے ہے کہ مجھے زبان پہ کوئین ملنی چاہیئے مگر کوئین نا ملتی رہتی ہے اس لئے صرف نمک سے

زبان گھس کر پاک کر لیتی ہوں۔ مجھے دوزخ سے بہت ڈر لگتا ہے صرف نمک سے زبان گھس کر پاک کر لیتی ہوں۔ مجھے دوزخ سے بہت ڈر لگتا ہے اور کوچوان کے نرک سے بھی اور سسٹر شیلا ٹامس کے ہیل سے بھی کیوں کہ تینوں بہت ڈراؤنے ہیں۔

اب میں ان تینوں مقامات میں سے کسی میں بھی نہیں جاؤں گی میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں تو بس جنت ہی میں جاؤں گی۔

"دیکھ لینا فرشتے تمہیں دوزخ کی آگ میں جھونک دیں گے، جگنو ڈراتے ہیں۔

"میں ایسی سرپٹ بھاگوں گی کہ بس"

"کہاں بھاگو گی للی"

"لحافوں والی کوٹھڑی میں چھپ جاؤں گی مگر میں جگنو کو نہیں بتاتی۔ وہ اتنے وثوق سے احکامات الٰہی صادر فرماتے ہیں کہ لگتا ہے کہ ان کا کافی رسوخ ہے انہوں نے قرآن شریف جو ختم کر لیا ہے اور میں پہلے سیپارے میں ہی پھنسی ہوں۔

نہیں، میری مکتی محال ہے۔

مگر خیر خط آیا ہے کہ باجی آ رہی ہیں۔ میرا پورا وجود جاگ پڑتا ہے۔

لکھنؤ جانے کے لئے میں پہلے علی گڑھ گئی۔ مجھے لکھنؤ کا جغرافیہ نہیں معلوم تھا۔ بھلا جودھپور سے سیدھے لکھنؤ کیسے جاتی۔ ویسے علی گڑھ میں کچھ دل کو ڈھارس بندھانے والے تھے۔ نیا قدم اٹھانے سے پہلے بابا میاں اور اعلیٰ بی سے بات چیت کرنا چاہتی تھی۔ بجائے اپنی ممانی جان کے یہاں ٹھہرنے کے لئے خاتون آپا سے اجازت لے کر بورڈنگ ہاؤس ہی میں ٹھہری۔ نصیر تو لاہور کینئرڈ کالج ایک سال پہلے ہی چلی گئی تھیں حمیدہ اسلام الدین فرسٹ ایئر میں تھیں۔ پہلے بھی اس کے ساتھ رہتی تھی۔ معلوم ہوا علی گڑھ سے تو کوئی لڑکی لکھنؤ نہیں جا رہی ہے۔ اس لئے اکیلی ہی روانہ ہو گئی۔

لکھنؤ کا پلیٹ فارم ہی علی گڑھ کے مقابلے میں مرعوب کن ثابت ہوا۔ اس وقت علی گڑھ میں سب ہی سڑکیں کنکر کی تھیں اور بے حد ناہموار۔ لکھنؤ میں پہلی بار سیمنٹ کی سڑک

دیکھی جودھپور ابھی نہایت پچھڑا ہوا تھا۔ لکھنؤ ان مقامات کے مقابلہ میں پیرس لگ رہا تھا۔

جب میرا تانگہ کالج کے پورٹیکو کے سامنے رکا تو چند منٹ میں ساکت کھڑی پورٹیکو کے بلند ستون نظروں سے ناپتی رہی۔ میں نے اتنی شاندار عمارت پہلی بار دیکھی۔ آئی۔ ٹی کالج ایشیا کا سب سے شاندار ویمنز کالج تھا اور شاید اب بھی ہے۔ کوئی کالج اتنا وسیع اور مرعوب کن نہیں۔ آئی۔ ٹی۔ کالج سے شاندار یونیورسٹی برسوں بعد صرف ماسکو میں نظر آئی جہاں جا کر آنکھیں کھل جاتی ہیں۔

پرنسپل مس تھین کے سامنے پہنچی تو انہوں نے اٹھ کر ہاتھ ملایا خوش آمدید کہا جیسے میں کوئی معزز مہمان ہوں۔ چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد، نہایت معصوم صورت گلاب کی پنکھڑی جیسا رنگ گہری نیلی آنکھیں سر پر زرد پیلے بالوں کا تاج بھاری بھرکم جسم اتنی زور سے میرا ہاتھ دبایا کہ انگلیاں چیخ گئیں۔

لق ودق کالج میں تنہائی کے خوف سے میں نے ڈبل روم پسند کیا۔ خدا جانے روم میٹ ملے گی۔ میں چند نو وارد طلباء میں سے تھی۔ بورڈنگ ہاؤس خالی پڑا تھا۔ میٹرن نے مجھے کمرہ پسند کرنے کی اجازت دے دی۔ دو پلنگ پڑے تھے میں نے ایک پر بستر بچھا کر ایک نہایت بھڑک دار مارواڑی بندھانی کے کام کا پلنگ پوش بچھا دیا۔ کپڑے الماری میں جما دیئے۔

اب سمجھ میں نہیں آیا کیا کروں۔ بس جدھر منہ اٹھا چلنے لگی چہرے پر بڑی سنجیدگی جیسے نہایت ضروری کام سے جا رہی ہوں اور قطعی جہاں جانے کا مقصد ہے پہنچ جاؤں گی۔

دو چار لڑکیاں آپس میں باتیں کرتی قہقہہ لگاتی گزر گئیں۔ انہوں نے جیسے مجھے دیکھا ہی نہیں۔ تنہائی کا احساس دم گھونٹنے لگا۔

دوپہر کا کھانا ہی نہیں کھایا کہ پتہ ہی نہیں تھا کہاں ہے۔ ڈائننگ روم ڈھونڈنے

کوجی چاہ رہا ہے۔ شام کی چائے کی گھنٹی پر میں نے آواز کی سمت قدم اٹھا دیئے اور ڈائیننگ روم کا سراغ مل گیا۔ اکا دکا لڑکیاں بیٹھی آپس میں بے تکلفی سے باتیں کر رہی تھیں۔

بھوک بہت لگی تھی ورنہ میں تو کھانا گول کر جاتی۔ اکیلا پن کھائے جا رہا تھا۔

"تسیں پنجابی او" ایک چھوٹے سے قد کی گول مٹول سی لڑکی آکر سامنے بیٹھ گئی

"نہیں"

"میں پنجابی ہوں، الیما موہن لال"

میں نے اپنا نام بتایا۔ جو مشکل سے گرفت میں آیا۔

"حالانکہ تم پنجابی لگتی ہو اور میں ہندوستانی"

عموماً پنجابی اپنے علاوہ سب کو ہندوستانی کہتے تھے۔

"کیا سبجیکٹ لیتے ہیں۔ میں نے تو پالیٹکس اور اکنامکس لی ہے"

"ارے یہی سبجیکٹ میں نے بھی لئے ہیں" الیما چہکی "کون سے ہوسٹل میں ہو"

"نشاط میں ڈبل روم ہے"

"ارے بابا اپن تو ڈارمیٹری میں ہیں"

"تو میرے کمرے میں آجاؤ"

"نا بھئی بہت مہنگا ہے۔ تم ڈرم میں آجاؤ ایک روپیہ فی کس، چھ لڑکیاں ہیں ہم ابھی دو پلنگ خالی ہیں۔ آجاؤ بہت بڑا مزا آئے گا۔ ساتھ پڑھیں گے مل کر"

تین ہوسٹل تھے۔ نشاط، نوبہار اور میتری بھون سب سے مہنگا اور نیا نشاط تھا۔ پھر نوبہار اور سب سے پرانا میتری بھون تھا۔ جس میں ڈارمیٹری تھی۔

میں الیما کے ساتھ اس کی ڈارمیٹری میں گئی تو پانچویں لڑکی آگئی تھی۔ وہ زہرہ الحسن تھی جو علی گڑھ سے میٹرک کرکے آئی تھی۔ نیر کی کلاس میں تھی اور دو سے اس کا رتھی بس ہلکی سی جان پہچان تھی مگر بس علی گڑھ کی لڑکی دیکھ کر دل جھوم اٹھا۔

میں اسے اپنے کمرے میں لے آئی تھی۔ بہت امیر اور لاڈلی تھی۔ دبلی پتلی سانولی بلکہ کالی۔ مس شیشتن نے اس کی مسکین صورت دیکھ کر میتری بھون بھجوا دیا تھا۔

آئی ٹی کالج کا بورڈنگ ہاؤس بھی طبقوں میں بٹا ہوا تھا۔ نشاط میں امیر اور ولائتی لڑکیاں رہتی تھیں۔ نوبہار میں درمیانہ درجہ کی حیثیت کی اور میتری بھون میں کم حیثیت اور زیادہ تر عیسائی لڑکیاں تھیں۔

کیونکہ مشنری کالج تھا۔ عیسائی کو بہت رعائتیں ملتی تھیں۔ بہتوں کی فیسیں معاف تھیں کھانے کا دینا پڑتا تھا۔ وظیفے سب عیسائی لڑکیوں کو ملتے تھے۔ چونکہ ہندو باورچیوں نے گائے کا گوشت پکانے سے انکار کر دیا تھا اس لئے سارا عملہ عیسائی اور مسلمان تھا، مہتر، مالی، چوکیدار جو تعداد میں درجن بھر سے اوپر ہوں گے۔ سب بہری جن سے عیسائی ہو گئے تھے۔ مسلمان بے حد اکھڑ مزاج تھے اور مسلمان لڑکیوں سے کچھ عقیدہ بھی ہوتے تھے۔ اور مروت بھی برتتے تھے۔ زیادہ مکھن کے توس دیتے تھے۔

عیسائی جس طبقہ سے لائے گئے تھے ان سے ولائتی اساتذہ زیادہ چھوت چھات کرتے تھے۔ وہ ڈرائیننگ روم میں داخل نہیں ہو پاتے تھے۔ انگریز اور امریکی لڑکیوں کی الگ میز تھی۔ انہیں کچھ انگریزی کھانا ملتا تھا۔ ان میں بہت گوری اینگلو انڈین بھی شامل کر لی گئی تھیں۔ جن میں اندرا دیال ڈاکٹر گرجا دیال اور ان کی ڈاکٹر میم کی سرخ سفید لڑکی تھی۔ ولایت سے آئی تھی۔ اسکرٹ اور فراک پہنتی تھی۔ بہ انہیں ڈاکٹر کی بیٹی تھی جن کی میم صاحب نے ہماری ماں کے زیادہ تر جاپے کئے تھے۔ بڑی گہری دوست تھیں۔ ابا میاں کی جب بدلی ہوتی تو وہ گرجا دیال کو بھی کسی طرح ٹرانسفر کرا لے جاتے۔ بچپن میں میرا نیچ میں ہمارا کافی میل جول تھا اور ان کا بڑا بیٹا بھاؤ ہمیں بہت ستایا کرتا تھا۔ خوب ٹھکائی کرتا رو تے تو چڑھاتا۔

اندرا نے جب یاد دلایا تو پہلے میں نے اس کے بھائی کی خیریت پوچھی جو انتہا مرکھنا

اور گورا ننھا سا چہرا سے ہم اپنے ہوسٹل میں لے آئے تیسرے دن سلطانہ اور آمنہ بھی
آ گئیں ہم نے انہیں تانگہ میں دیکھ کر ہی پکڑ لیا اور ہمارے کمرے کے بعد جو ڈبل روم تھا
وہ انہیں دلوا دیا۔ ہم بار بار بیچ کے کمرے سے گزر کر ایک دوسرے کے پاس آتے
جاتے رہتے تھے۔ اس لئے وہ سینیئر لڑکی کمرہ چھوڑ کر میتری بھون چلی گئی جہاں لڑکیاں
بہت پڑھاکو تھیں۔ اس کا بی اے کا آخری سال تھا اور سلطانہ، آمنہ بالکل برابر کے
کمرے میں آ گئیں۔ زہرہ، سلطانہ، آمنہ ایف اے کے پہلے سال میں تھیں مگر علی گڑھ
کے ناطے ہم اکثر ساتھ ہی رہتے تھے۔

سب سے زیادہ جس بات نے مجھے متاثر کیا وہ لائبریری اور ڈرائنگ روم تھا
اتنی خوبصورت اور وسیع لائبریری میں نے اس سے پہلے نہیں دیکھی تھی۔ علی گڑھ
کالج میں ایک کمرے میں چار الماریاں کھڑی تھیں جن میں اردو اور انگریزی کی کتابیں
دو چار ڈکشنریاں اور انسائیکلوپیڈیا بھی آئی ٹی میں کئی ہزار کتابیں تھیں۔ پہلے چند
روز تو صرف کتابیں دیکھنے میں صرف ہو گئے۔ پڑھائی شروع ہونے میں ابھی چند دن
باقی تھے۔ ایک ہفتہ تو لڑکیوں کو جمنے میں لگ جاتا تھا گیمز اپنی مرضی سے لڑکیاں کھیل
رہی تھیں۔ نوٹس بورڈ پر مختلف کھیلوں میں حصہ لینے والی لڑکیاں اپنے نام لکھ رہی تھیں
ہم چاروں نے ہر گیم میں نام لکھ دیئے۔ باسکٹ بال والی بال اور بیڈمنٹن تو علی گڑھ
سے ہی آ گیا تھا۔ بیس بال ہاکی اور ٹینس نئے کھیل تھے۔

ہمارے ہوسٹل میں صرف ڈاکٹر ٹکر تھیں۔ وہ اسّی برس کی تھیں اور انگریزی ان
کے ذمہ تھی۔ ڈاکٹر چھوٹے سے قد کی کم روپ کی انتہائی سفید خاتون تھیں اور پہلی
بار پتہ چلا کہ سفید رنگ بدصورت بھی ہو سکتا ہے۔ سر پر نہایت مختصر سے سفید لڑکوں
کی طرح کٹے ہوئے بال تھے۔ عموماً بہت سادہ لباس پہنا کرتی تھیں۔
ڈاکٹر ٹکر کیمبرج ہارورڈ اور کیلی فورنیا یونیورسٹی میں پڑھا چکی تھیں اور ایک عمر

سے ریٹائر ہو چکی تھیں۔ ازابیلا تھوبرن کالج میں آرام کرنے آئی تھیں مگر ساری عمر
پڑھانے کے بعد بیکاری سے وحشت ہونے لگی۔ اور پھر پڑھانا شروع کر دیا۔ ان
کے شاگرد منسٹر اور سفیر تھے۔ کمانڈر ان چیف اور جنرل تھے ان کا علم بحر ذخار تھا
جس کی تھاہ نہیں ملتی تھی۔ شیکسپیئر تو انہیں ازبر تھا۔ پڑھانا شروع کرتیں اور کتاب کھول
کر صفحہ الٹنے کی بھی ضرورت نہ محسوس کرتیں۔ یہی حال برنارڈ شا اور تمام انگلش شعراء
کے کلام کا تھا۔ لڑکیاں کتابیں کھول لیتیں اور ڈائس پر ٹہل ٹہل کر سبق دیا کرتیں۔ اس قدر
مسحور کن انداز میں پڑھتی تھیں کہ طالب علم مدہوش ہو جاتے۔

علی گڑھ میں خاتون آپا انگلش کی بہترین استاد مانی جاتی تھیں اور ان کے پڑھائے
ہوئے سبق دماغ کا ایک حصہ بن جاتے تھے۔ مگر جب خاتون آپا کی استاد ڈاکٹر ٹکر
سے واسطہ پڑا تو معلوم ہوا علم کا ایک سمندر ہے کہ امڈا چلا آتا ہے مجھے وہ دن
ہمیشہ یاد رہے گا۔ جب انہوں نے ورڈس ورتھ کی نظم MATGH GIRL
LITTLE اور WE ARE SEVEN کلاس میں پڑھایا تو پہلے سناٹا پھر سسکیاں
اور پھر بھوں بھوں شروع ہو گئی خود ڈاکٹر ٹکر کا منہ سرخ انگارہ ہو رہا تھا اور چیال کی
جیسی نیلی آنکھیں بھرائی تھیں، وہ خود اتنی ڈوب کر پڑھتی تھیں کہ بوڑھے ہاتھ پیر لرزنے
لگتے تھے۔

جب دوسری کلاس کی لڑکیاں دروازے پر آ کر رک گئیں تب ہمیں پتہ چلا کہ گھنٹہ
ختم ہو گیا۔ ڈاکٹر ٹکر کی ہر کلاس میں یہی ہوتا کہ بیٹھی ہوئی لڑکیاں اٹھنے کو تیار نہ ہوتیں اور
دوسری کلاس کی لڑکیاں اٹھنے کو تیار نہ ہوتیں اور دوسری کلاس کی لڑکیاں گھس کر
احتجاج کرتیں۔

ڈاکٹر ٹکر کبھی لان پر چہل قدمی کے لئے نکلتیں تو انہیں گھیر لیتیں دنیا کے ہر
موضوع پر وہ اتنے پیارے انداز میں گفتگو کرتیں کہ دماغ کی کھڑکیاں کھلنے لگتیں

بے حد خوش مزاج تھیں۔ موڈ آجاتا تو مضحکہ خیز کردار کی اتنی دلچسپ نقل کرتیں کہ ہم لوگ ہنستے ہنستے بے دم ہو جاتے۔ کبھی فالسٹاف بن جاتیں، کبھی ڈیوڈ کاپرفیلڈ کا مسٹر بارکس۔ کبھی شائیلاک کبھی ایک دم لیڈی پورشیا، کبھی برنارڈ شا کی کینڈیڈا تو کبھی قلوپطرہ بائیبل بھی کافی از بر تھی، انہوں نے ابھی فیصلہ نہیں کیا تھا کہ فائنل میں برنارڈ شا اور شیکسپیئر کا کون سا ڈرامہ لیں گی۔ سلیبس میں تین تین ڈراموں میں سے ایک ایک سلیکٹ کرنا تھا۔ اسی طرح نظم کے حصے میں بھی ورڈس ورتھ، میتھیو آرنلڈ، بائرن کیٹس، شیلی اور ملٹن کے بارے میں بھی کچھ نہیں طے کیا تھا کہ کون کون سے حصے کورس میں ہوں گے۔ بس کہہ دیا سب شیکسپیئر کے ڈرامے دلچسپ کتاب کی طرح پڑھ ڈالو تمام شعراء کا پورا کلام کتابی صورت میں دو دو روپیہ میں سستے ایڈیشن حضرت گنج سے خرید لاؤ اور سب تیزی سے پڑھ جاؤ۔"

میری انگریزی علی گڑھ کے معیار سے بھی کمزور تھی کیونکہ میں نے انگریزی بہت دیر میں اور بڑی تیزی سے پڑھی تھی۔ انگریزی شعراء کی ایک آدھ نظم کورس میں ہوتی تو رٹ ڈالی تھی، معنی بھی کچھ کلاس میں کچھ "کنجی" کی مدد سے ازبر کر لئے تھے۔ مگر جانکاری ہوتے ہوئے بھی تحریری طور پر مار کھانا پڑتی تھی جو سمجھتی تھی اسے لکھنے کے لئے زبان کی کمزوری کھل دیتی تھی۔ بیان میں بھی مار کھانا پڑتی تھی کیونکہ بولنے کی عبارت نہ تھی۔ بانا ہر جملہ کا ترجمہ کر کے بولتی تھی دماغ میں بہت کچھ بھرا ہوتا اور ادائیگی کا راستہ نہ ملے تو بڑی ذہنی کوفت ہوتی ہے۔ مگر کالجوں میں "کنجی" ایک ایسی نعمت ہے کہ وقت تو ہوتا

مگر شوق میں کمی نہ آئی پھر ڈکشنری بھی کام آئی

لائبریری میں جا کر مجھ پر عجیب مسحور کن خوشبو ہوتی ہے جو داخل ہوتے ہی چہار طرف سے دماغ پر حملہ آور ہوتی ہے۔ میں گھنٹوں کتابیں کھول کھول کر انہیں پھر سے سونگھا کرتی۔ اب بھی نئی کتاب اور رسالہ نہ جانے کیوں میں کھول کر پہلے

اخبار سونگھتی ہوں، چینی اور روسی کتابوں میں خدا معلوم کیسا گوند لگا ہوتا تھا کہ سڑے ہوئے گوشت کی بو آتی تھی۔ اور جی متلانے لگتا تھا۔ میں نے چاہا تھوڑا بوڑھی کلول جمپر کو تو اور بھی بھیانک بدبو آنے لگی۔ میں ہی جانتی ہوں۔ میں نے کیسے ناک بند کر کے ان کتابوں کو پڑھا ہے۔ مجھے کتابوں سے عشق ہے میرے بستر پر کتابیں اور رسالے نہ پڑے ہوں تو وحشت ہوتی ہے۔ میرے گھر کے ہر کونے میں کسی نہ صورت میں کتابیں رکھی ہیں یہاں تک کہ غسل خانہ میں بھی کامک اور ادھر ادھر کے ہلکے پھلکے رسالے رکھے رہتے ہیں۔ یہی حال میری بیٹیوں کا ہے اور میرا نواسہ بھی کتابوں کا دیوانہ ہے۔ جب سوجاتا ہے، تو اس کے سینے اور پہلو سے کتابیں سمیٹنی پڑتی ہیں۔ شاہد کو بھی کتابوں سے عشق تھا۔ ان کے ایک ہاتھ میں سگریٹ اور دوسرے میں کتاب ضرور رہتی تھی۔ کتابیں خریدنے کا تو جنون تھا۔ شاید ہی کوئی مہینہ ایسا جاتا ہو جب وہ تین سو کی کتابیں نہ خریدتے ہوں۔ ایسی کتابیں جو نایاب ہوں پرانی کتابوں کی دکانوں سے خریدتے تھے۔ انہوں نے اتنی لاجواب کتابیں جمع کی تھیں کہ میرا پڑھتے پڑھتے دماغ گھوم گیا۔ انہیں پڑھنے کی کم فرصت ملتی تھی۔ میں نے ان کی زندگی میں خود کتاب کبھی نہیں خریدی ضرورت ہی نہ پڑی۔ اتنی کتابیں پڑھنا آسان کام نہ تھا۔ مگر خدا کتاب چوروں کو سمجھے۔ بہت سی کتابیں اڑا لے گئے تب میں نے بہترین کتابیں لوہے کی الماری میں رکھ کر کنجی کھو دی ہے جس کی بجائے رہائش صرف مجھے معلوم ہے۔

میں نے مکمل کلام ان تمام شعراء کا شیکسپیئر اور برنارڈ شا کو پڑھ ہی ڈالا۔ چند کتابیں پڑھنے کے بعد پھر "کنجی" کی ضرورت نہ رہی اور نثر میں برادنی ٹی سسٹرس سے شروع کر کے تمام روسی ادیب خاص طور چیخوف ٹالسٹائی، گورکی دستوئیفسکی۔ پھر چارلس ڈکنس ایمیل زولا۔ بالزاک سامرسٹ ہیمنگ وے کو بھی پڑھا۔

میں کبھی حسرت سے کتابوں سے بھری الماریوں کو دیکھتی کہ زندگیاں چاہئیں ان

سب کو پڑھ ڈالنے کے لئے پھر کالج کی پڑھائی۔ مقررہ وقت پر لائٹ بند کر دینا پڑتی۔ کبھی کوئی کتاب جان کو لگ جاتی اور روشنی بجھانے کا گھنٹہ بج جاتا۔ پھر میٹرن آکر ڈانٹتی اور بغیر روشنی گل کئے سر سے نہ ٹلتی۔ تو جی جل کر خاک ہو جاتا۔ میرے اوپر اکثر جرمانہ ہوتا۔ تب میں کسی سینئر یعنی بی اے فائنل ایم اے یا بی ایڈ کے کمرے میں جاکر پڑھتی۔ اگر وہاں بھی میٹرن کے آنے کی چاپ سنتی تو باتھ روم میں جاکر بلب جلا لیتی۔ اُف میرے مزاج میں بلا کی ضد تھی۔

ڈاکٹر ٹکر نے میرا اور ناس مارا وہ میرے کمرے سے تھوڑی دور رہتی تھیں۔ بڑھاپے میں نیند مشکل سے آتی ہے کھانے کے بعد جب وہ اپنے کمرے میں سونے کے لئے آتیں تو میں ان کی تاک میں بیٹھی رہتی۔ میں انہیں وش کرتی اور وہ باتیں کرنے لگتیں پھر مجھے کمرے میں بلا لیتیں۔ سونے کی گھنٹی بج جاتی ایا بج پھر دس اور پندرہ منٹ گزر جاتے۔ ان کی باتوں سے میری پیاس اور بڑھتی اور وہ جن کتابوں کے کردار کا ذکر کرتیں دوسرے دن میں انہیں کتابوں میں ڈھونڈتی۔ اس کے علاوہ انہوں نے شام کو کھانے کے بعد علمی بات چیت کے عنوان سے ایک دلچسپ مشغلہ شروع کیا تھا۔ جو لڑکیاں چاہیں آدھ گھنٹہ ان کے پاس جاکر سوال و جواب میں شرکت کر سکتی ہیں لڑکیاں لوٹ پڑیں۔ ان کا چھوٹا سا کمرہ کھچا کھچ بھر جاتا۔ ہم زمین پر بیٹھ جاتے وہ آرام کرسی پر۔ کبھی کوئی نظم یا ڈرامے کا ٹکڑا۔ کبھی ہومر اور دوجل کے بارے میں مثالوں کے ساتھ بات چیت کبھی بائبل کی تفسیر۔ چند لڑکیوں کا خیال تھا کہ بڑھیا ہمیں کرسچان بنا رہی ہے کچھ بھی ہو ہماری معلومات میں اضافہ ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے ایک دن انگریزی موسیقی کے بارے میں بھی بتایا۔ ہر ہوسٹل میں ڈرائنگ روم تھا جہاں پیانو رکھا رہتا تھا لڑکیاں پریکٹس کرتی تھیں یا پروفیسر دل بہلانے کو شغل کرتی تھیں۔ ہمارے کان مغربی موسیقی سے قطعی ناآشنا تھے۔ بس گوڈ سیو دی کنگ علی گڑھ میں پہلے گا یا جاتا تھا۔

جیسے ہم لیں منہ پھاڑ پھاڑ کر بغیر آواز کے گاتے تھے۔ ابا میاں گانا سننا پسند کرتے تھے مگر گھر میں کوئی ہندوستانی گانا بھی نہیں جانتا تھا۔

ڈاکٹر ٹکر نے میوزک ایپریشیئشن کی بیٹھک میں ہمیں جو گانا سنایا تو مارے ہنسی کے دم نکل گیا۔ ولائتی سُر ہمارے کانوں کے لئے قطعی اجنبی تھے۔ ہم لوگ منہ پر ہاتھ رکھ کر بے دم ہو گئے۔

ڈاکٹر ٹکر کا منہ سرخ ہو گیا انہوں نے بتایا کہ یہ گانا ایک حبشی گویئے پال رابسن نے گایا ہے اور شاہکار سمجھا جاتا ہے۔ انہوں نے بار بار ریکارڈ بجایا اور کہا "غور سے سنو، اس گویئے کی آواز میں والگا ندی کی گھن گرج ہے۔ آنکھیں بند کرلو۔ اور سوچو تم ناؤ میں سوار والگا ندی پار کر رہی ہو۔ دریا میں بھیانک طوفان آرہا ہے۔ دیو زاد موجیں، بادل کی گرج، پانی کا عتاب۔ اور اکیلا بے سہارا مانجھی مجبور و لاچار نیگرو مانجھی جس کی زندگی ایک طوفان میں گھری ہوئی ہے۔"

ہم کھسیانے شرمندہ سنتے رہے اور جب تیسری بار انہوں نے بجلی بجھا کر ریکارڈ بجایا تو رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

پھر انہوں نے امریکی نیگرو کے بارے میں پڑھنے کی رائے دی۔ شمال اور جنوب کی جنگ نیگرو درگت، اور میں نے UNGLE TOM 'S GABIN پڑھا اور پال روبسن کی آواز کی عظمت پہچانی۔

دوسرا مضمون سیاست پہلے سبق سے ہی دل کو جکڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ پالیٹکس کی پروفیسر مس چاکو ساؤتھ انڈین تھیں۔ بالکل نیگرو جیسا چکنا مخملیں رنگ گھونگروالے بال بڑا سا جوڑا سیدھی مانگ بے حد رسیلی، چمکدار اور بڑی بڑی آنکھیں کھنچی ہوئی بھویں گہرے اودے ذرا پھیلے ہوئے اور جگمگاتے ہوئے سفید چمک دانت نہایت موزوں سڈول جسم لانبی ہنسی جیسی گردن زیادہ تر سفید فام

استاد محترم مہدی اور کم رو تھیں۔ ان میں مس چاکو سیاہ ہنسنی کی طرح پر وقار چال سے چلتیں تو بالکل کسی ملک کی شہزادی معلوم ہوتیں۔ ان کی آواز بھاری مگر انتہائی گہری اور پر اثر تھی۔

کالج کی بہت سی لڑکیاں ان کی دیوانی تھیں۔ ہم سب ہی ان پر مرتے تھے کیونکہ وہ بے حد اچھا لیکچر دیتی تھیں کہ ذہن میں بیٹھ جاتا تھا۔

مس چاکو بہت لیئر کرار کا بی کاکریزی، اودی، نیلی، عنابی ساڑھیاں پہنتی تھیں جن سے ان کی ہستی نہایت پر اسرار اور گھمبیر لگتی وہ بہت کم ہنستی تھیں عموماً طلبا کی کسی کوتاہی اور غلطی پر ہنس پڑتی تھیں اور وہ لڑکی رو پڑتی تھی۔

سیاست کے ساتھ تاریخ پڑھنا ضروری تھی۔

کیڑے سے مینڈک پھر بندر سے انسان۔ تھیوری آف ایوولیوشن یعنی ارتقاء کی منزلیں۔

کن فیکون! خدائے بزرگ نے فرمایا "ہو جا" اور دنیا تعمیر ہو گئی۔ پھر مٹی سے حضرت آدم کو تخلیق کیا اور سجدہ کرنے کا حکم صادر فرمایا۔

فرشتوں کا سردار اعلیٰ، ابلیس بغاوت پر تل گیا۔ مٹی کے حقیر پتلے کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ اور راندۂ درگاہ ہوا۔ مگر اُسے رہتی دنیا تک انسان کو ورغلا کر خدا کی حکم عدولی کی اجازت مل گئی۔

آدم جنت میں بور ہوئے تو ان کی دل بستگی کی خاطر حوا بنا دی گئیں۔ عورت مرد کا کھلونا!

... ن جانتا تھا کہ آدم اس کے چکمے میں نہیں آئیں گے لہٰذا حوا کو بھڑکایا اور بادل ناخواستہ آدم نے بھی شجر ممنوعہ سے پھل توڑ کر کھا لیا کیونکہ ابلیس کی بہکائی حوا نے آدم کو بھی ورغلایا۔ شیطان کی چیلی عورت! اسی کی وجہ سے دونوں دنیا میں پھینکے گئے۔

آدم اور حوا کے روز ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہونے لگے۔ ایک دن پیدا ہونے والے جو فوراً جوان ہو جاتے تھے ایک دوسرے پر حرام قرار پائے۔ ایک دن پیدا ہونے والے دوسرے دن پیدا ہونے والے سے ہی شادی کر سکتے تھے۔ مگر بدذات قابیل نیک نہاد ہابیل کی جائز عورت پر ریجھ گیا شیطان نے اسے قتل کرنے کا ہنر سکھایا اور اس طرح قابیل کے ہاتھوں دنیا کا پہلا قتل ایک عورت کے کارن ہوا۔ بھائی نے بھائی کا خون بہایا۔

عورت پھر فساد کی جڑ!

سیاست کے مضمون میں ہسٹری کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ مس چاکو جو بڑی خوبصورتی سے ارتقا کی تھیوری پڑھا رہی تھیں۔

کیڑے سے مینڈک، پھر بندر پھر انسان ظہور میں آیا۔ پچھلے ہفتہ ولیپرز یعنی شام کی دعا میں انہوں نے کن فیکون ہ کی روداد سنائی تھی۔ دماغ قلابازیاں کھانے لگا۔ ڈرتے ڈرتے اظہارِ خیال کیا۔

مس چاکو کی طنزیہ ہنسی بڑی زہریلی ہوتی تھی۔ بڑی بڑی غلافی آنکھوں میں سانپ پھنکارنے لگتے تھے۔ تھوڑی دیر کلاس میں سناٹا رہا۔

"عقیدے اور تاریخ کو غلط ملط مت کرو۔" انہوں نے جھک میری نوٹ بک دیکھی۔ گھبرا کر اور بھی غصہ سے بولیں "یہ کیا لکھ رہی ہو؟"

"نوٹس" میں نے مری ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"مگر یہ ......" انہوں نے کاپی اٹھا کر کلاس کو دکھایا۔

"یہ تو اردو ہے!" کشور بولی۔

"میری کلاس میں سنجیدگی سے کام ہو گا۔" مس چاکو نے کاپی پٹخ دی۔

"حروف اردو کے ہیں، مگر الفاظ انگریزی کے ہیں۔" میں نے ان کے دبتے ہوئے

نوٹ پڑھ کر سنائے۔

"مگر ......"

"مس چیا کو آپ بہت تیز بولتی ہیں ہم اتنی تیزی نہیں لکھ پاتے ہیں اردو میں نوٹ لکھی ہوں۔ میں انگریزی میں آسانی سے منتقل کر لیتی ہوں۔ اردو بہت تیز لکھی جاتی ہے۔ یہ ایک طرح کی شارٹ ہینڈ ہے۔

نوٹ سن کر مس چیا کو مطمئن ہو گئیں۔ لڑکیاں میرے نوٹ سے اپنے چھوٹے ہوئے الفاظ لکھا کرتی تھیں۔ اس طرح لیکچر سننے کا اچھا موقع ملتا تھا۔

یہ ترکیب میرے بہت کام آئی۔ ہندو کے حروف اتنے مختصر نہیں ہوتے ہندو کی لڑکیاں بھی میرے نوٹ مانگا کرتی تھیں۔

کئی دن ہم بائبل کے پہلے سبق پر بحث کرتے رہے۔ عورت پر ساری غلطیوں کا بوجھ۔ اس کی ثانوی حیثیت سبھی غلطی یہ ذاتی حملہ محسوس ہوا۔ دکھ بھی ہوا اور غصہ بھی آیا۔

تو پھر کورس کی کتابیں مذہبی عقیدوں کی کاٹ کیوں کرتی ہیں۔ وہ دو متضاد باتیں طلبا کو کیوں پڑھائی جاتی ہیں۔ ان دونوں پر صدق دل سے ایمان لانے کا حکم ہوتا ہے۔ تھیوری آف ایولیوشن سے اور ہی بات معلوم ہوتی ہے۔ اگر عقیدے پر سوال کا جواب دیں تو ممتحن کا کیا فیصلہ ہو گا۔

پتھر کا زمانہ پھر لوہے کی دریافت ہزاروں سال بندروں کی طرح پیڑوں اور غاروں میں رہا۔ پھر مکان کا تصور ابھرا۔ غول قبیلوں کی صورت میں جم گئے۔ کاشت اور مویشی پالنے کا گر سیکھا۔ شکار کے لئے ہتھیار بنے جو قبیلوں کے درمیان خون خرابے کے کام آنے لگے۔

ابتدا میں عورت اور مرد قریب قریب برابر تھے، جسمانی طور پر بھی زیادہ فرق نہ تھا

قبیلوں کے رہن سہن میں تقسیم محنت کے اصول لاگو ہوئے عورت بچہ پیدا کرتی تھی جو قبیلہ کی طاقت میں اضافہ کرتا تھا۔ لہٰذا اس کی زیادہ اہمیت تھی۔ شادی کے رواج سے پہلے بچے ماں کے ہی ہوا کرتے تھے جن کے مختلف باپ ہوا کرتے تھے اور حق جتانے کا کوئی وسیلہ نہ تھا۔ نام ماں سے چلتا تھا اور ماں ہی قبیلے کی سردار مانی جاتی تھی۔ آہستہ آہستہ آرام طلبی نے جسمانی طور پر کمزور بنا دیا۔ جیسے عشق پرست حاکموں، بادشاہوں کا وجود ناکارہ ہو گیا اور نام کو بادشاہت رہ گئی ہے اسی طرح اسی طرح عورت کی اہمیت ختم ہو گئی اور وہ بچے بنانے کی مشین رہ گئی۔ یا گھر کا کام اس کے حصہ میں آیا۔

کیونکہ قبیلے ہر وقت ایک دوسرے سے لڑتے رہتے تھے۔ کام ہی کیا تھا سوائے اس کے کہ ایک دوسرے کو مار کر ان کی ملکیت پر قبضہ کر لیں۔ عورت جو مرنے والوں سے پیدا ہونے والی خلا کو پورا کرتی تھی۔ اس لئے وہ بھی مال غنیمت بن گئی۔ ڈھور ڈنگر کے ساتھ وہ بھی لوٹ لی جاتی جس کے قبضہ میں زیادہ عورتیں ہوتیں اس کا کنبہ بڑا اور زیادہ طاقتور ہوتا اور وہ سردار بن جاتا۔

اور مال اسباب کی طرح عورتوں کی بھی لوٹ ہوتی اور قبضہ کا تصفیہ کرنے کے لئے قبیلہ کے افراد اپنی عورتوں کی تعداد بھیڑ بکریوں کے ساتھ گن دیتے کوئی نئی عورت کا اضافہ ہوتا وہ بھی قبیلہ کو جتا دیا جاتا کہ فلاں فلاں کی ملکیت ہے یہ بعد میں شادی کی صورت اختیار کر گئی۔ لوگوں کو جمع کرنے کے لئے تاکہ ان میں گڑبڑ نہ ہو ڈھول پیٹ کر اطلاع دی جاتی یا گاؤں میں گھوم پھر کر جتا دیا جاتا کہ بھائیو اچھی طرح پہچان لو یہ مال فلاں کا ہے۔ بعد میں یہی رسم شادی کی دھوم دھام بن گئی۔

قبیلے کے افراد دوسرے قبیلوں ہی سے نہیں آپس میں بھی لڑا کرتے تھے۔ باپ اور بیٹے میں سے جس کو موقع مل جاتا یا زیادہ طاقتور ہوتا تو مار ڈالتا۔ اس لئے رشتوں کی اہمیت

پر زور دیا گیا۔ باپ بیٹے کو پالے پوسے محبت دے۔ اس کے جواب میں بیٹا باپ کا شکر گزار ہو اور عزت کرے فرمانبردار ثابت ہو۔

باپ کے مرنے کے بعد بیٹے اس کی دولت کے مالک ہوتے تھے۔ ساتھ ہی اس کی بیویوں پر بھی ان کا حق ہو جاتا تھا۔ آپس میں چھین جھپٹ اور خون خرابہ ہونے لگتا۔ عموماً سب سے بڑی عورت کا سب سے بڑا لڑکا اور بچوں سے زیادہ طاقتور ہوتا تھا، عمر میں بھی باپ سے قریب ہوتا تھا۔ وہ اپنی اہمیت منوا لیتا تھا۔ اس لئے بڑا بیٹا ولی عہد مان لیا گیا۔ اس کی وجہ سے اس کی ماں بھی دلیر ہو گئی اور پٹ رانی بن گئی۔ سردار کی پہلی بیوی یعنی خاتون اول۔

شادی کی اتنی عجیب و غریب تفصیل پڑھ کر سارے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔ رنگین خواب چیت کبرے بن گئے۔ عورت کی کھیت کھلیان اور مویشیوں کی طرح حفاظت ہوتی تھی۔ مالک اور ملکیت کے لئے الگ الگ اصولِ زندگی بن گئے۔ مرد پالن ہار، پتی اور خدائے مجازی۔ عورت کے فرائض مرد کی خدمت۔ کہ روزی روٹی کی خاطر براہ راست حوادث زمانہ کا مقابلہ نہیں کرنا پڑتا تھا جب تک مرد کو خوش کرتی زیادہ سے زیادہ سپاہی پیدا کرتی محفوظ چین کی زندگی گزرتی۔ اس کے بعد وہی انجام ہوتا جو بوڑھے ناکارہ مویشیوں کا ہوتا ہے۔ اسی لئے عورت بوڑھاپے سے ڈرتی ہے عمر چھپاتی ہے کہ آج بھی وہ شوہر اور بیٹوں کے رحم کی محتاج ہے۔

بڑھاپا تو ٹھوکر پہ کھاتا ہی ہے۔ جب اپنی حفاظت کا دم نہیں رہتا تو سب سے پہلے آدم خور کمزور اور بوڑھوں ہی کا صفایا کرتے تھے۔ کچھ ہوشیار بڑھیاں نئی نوجیوں کی تربیت کے لئے زندہ چھوڑ دی جاتیں جو انہیں مرد کا دل جیتنے کے گر سکھاتیں، ماتا کا درس دیتیں تاکہ ان کے بچے بڑے ہو کر ان سے دور نہ ہو جائیں۔

"ماں کے پیر کے نیچے جنت ہے" بچوں کے دل میں بیٹھایا جاتا۔

بزرگوں کا قول تھا، اب بھی ہے کہ لڑکی کو زیادہ تعلیم نہیں دینا چاہئے۔ تباہ ہو جاتی۔ اچھی ماں بیوی بننے کی صلاحیتیں مر جاتی ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا یہ منفولہ دونوں پر کیوں نہیں آتا یہ مقولہ مردوں پر کیوں نہیں لاگو ہوتا۔ علم خطرناک ہے تو ہر جاندار کے لئے برابر کا سم قاتل ہوگا۔ یہ نہیں کہ عورت کے سانپ کاٹے تو مر جائے اور مرد سرخ رو ہو۔ ایک کے لئے زہر دوسرے کے لئے تریاق کیا احمقانہ مقولے بنائے ہیں یار لوگوں نے!

ہماری سب ہی پروفیسر کے سوا غیر شادی شدہ تھیں۔ یہ دو ہندوستانی تھیں بال بچوں والی تھیں۔ ڈاکٹر ٹکر، ڈاکٹر شیئن، مس پیرسن، مس جونس غرض سب ہی نے شادی نہیں کی۔ ایک دن ہم نے ڈاکٹر ٹکر سے پوچھ ہی لیا۔

"آپ نے شادی کیوں نہیں کی؟"

"کیوں؟ آپ جوانی میں بہت پیاری ہوں گی۔ لڑکوں کی کمی تھی؟"

"ہاں، لڑکوں کی کمی تھی۔ ہر ملک میں عورتیں زیادہ پیدا ہوتی ہیں۔ پھر میرا اصل وطن انگلینڈ ہے نوجوان وطن سے دور کالونیز میں سلطنتِ برطانیہ کا سکہ جمانے میں جٹے ہوئے تھے۔ صرف بوڑھے اور نکمے رہ گئے تھے۔ جو وطن سے برسوں کے لئے جاتے تھے۔ ان کی بیویاں کنواریوں سے بدتر، ساتھ جاتیں تو صعوبتیں برداشت کرنے کا دم نہ تھا۔ کسی زمانے میں تو مرد نیٹو عورتوں میں ہی دلچسپی لینے لگے تھے۔ شادیوں سے کتراتے تھے۔ اس پر عورتوں نے بہت غل مچایا۔ سفید لوگوں پر کالے نیٹو میل جول پر سرکار نے پابندی لگا دی عورتیں خود کالونیز میں شوہر کی کھوج میں گئیں بڑے دکھ جھیلے۔ مرنے کٹنے میں مرد ہی کام آجاتا ہے۔ عورتوں کو ان کی جگہ وطن میں سنیاس لینی پڑتی ہے۔ شادیاں نہ ہو سکیں تو تعلیم نسواں لامحالہ بڑھی۔ میرا خاندان، بس کھاتے پیتے لوگ تھے ہم لوگ۔ تعلیم اتنی گراں نہیں تھی۔ میرے دو بھائی افریقہ میں فوت ہو گئے۔ ان کی شادی

کی بات چیت چل رہی تھی کہ موت کی پکار آ گئی۔ چھوٹی بہن بیوہ ہو گئی۔ کچھ ایسے حالات تھے کہ علم کے سوا ہر چیز دائرہ اختیار سے باہر تھی۔ مگر تم لوگ شادی ضرور کرنا۔"

"کیوں؟"

"تاکہ دنیا کو اعلیٰ دماغ بچے دے سکو۔ میرے خاندان میں صرف ایک بہن نے شادی کی تین بچے ہوئے۔"

"تعلیم یافتہ تھیں؟"

"ہاں، اڑتیس سال کی عمر میں ایک ٹانگ کا دولہا ملا۔ سکول ٹیچر تھی الیس اس کی اولاد نے تعلیم پائی۔ پوتے نواسے دنیا کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ایک ملک کو ترقی کرنے کے لئے تعلیم یافتہ ماؤں کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیا تم کوئی ایسی مثال دے سکتی ہو کہ ماں گریجویٹ ہو اور اولاد جاہل رہ گئی ہو۔ جس خاندان کی عورت تعلیم پا لے اس کے مرد اعلیٰ تعلیم پاتے ہیں۔"

آج ڈاکٹر ٹھکر کی باتیں یاد کر کے حساب لگاتی ہوں تو واقعی ان کی پڑھائی ہوئی جتنی طالبات ہیں کسی کے بچے جاہل نہیں۔

"ذہین ماں کا دودھ ذہانت بخش ہوتا ہے۔" ڈاکٹر ٹھکر نے کہا تھا۔

پھر ایک دم نئی طالبات کو خوش آمدید کہنے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ اب ہم آئی ٹی روایات اور اصولوں سے اچھی طرح واقف ہو گئے تھے۔ ٹرمنل اگزامس شروع ہونے والے تھے۔ اس سے پہلے ہم آئی ٹی کے "شہری" بنا دیئے گئے۔

اعلان کیا گیا کہ سب لڑکیاں آئی ٹی کلر یعنی سفید اور سنہری رنگ کے لباس پہنیں گی زیادہ تر سفید سوتی ساڑھیاں زردکتی کی خرید لی تھیں ہفتہ، اتوار چھٹی ہوا کرتی تھی اس لئے جمعہ کی سہ پہر سارا اسٹاف اور طالبات پورٹیکو میں جمع ہوئیں۔ نئی لڑکیاں پورٹیکو کے باہر سیڑھیوں کے نیچے اور سٹاف اور پرانی طالبات پورٹیکو میں سنہری اور سفید کریپ پیپر کے لمبے لمبے ستونوں سے باندھ کر دربندی کی گئی۔ دور میوریل پیانو کی سُر چھیڑ رہی

تھی۔ مس شبنم نے بڑی گمبھیر آواز میں قسم لی۔ ہم ان کے الفاظ دہراتے گئے۔

"ہم کالج کے اصولوں کی پابندی کریں گے۔"

"آپس میں مذہب، رنگ، ذات پات کی تفریق کو بھول کر محبت اور دوستی کا سلوک کریں گے۔"

"دل لگا کر علم حاصل کریں گے تاکہ دوسروں تک پہنچا سکیں۔"

کالج کے سامان کو اپنا جان کر احتیاط سے استعمال کریں گے۔"

"لائبریری کو عبادت گاہ کا درجہ دیں گے۔"

"پروفیسر کو اپنا بزرگ دوست سمجھیں گے اور بے تکلف اپنی مشکلات میں رائے لیں گے۔"

"کوئی ایسی حرکت نہیں کریں گے کہ کالج کے نام پر حرف آئے۔"

"پابندی وقت کی قدر کریں گے۔"

دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ ہاتھ ٹھنڈے ہو رہے تھے۔

اس کے بعد مس شبنم نے سنہری سفید فیتے کھول دیئے اور کہا۔

"آج تم اصلی معنوں میں کالج میں داخل ہو کر اس کنبے کا ایک فرد بن گئیں، ہم وعدہ کرتے ہیں، جو علم ہمارے استادوں نے بطور قرض ہمیں دیا ہے ہم تمہیں دیں گے کہ تم دوسروں تک پہنچاؤ۔ علم کا لین دین چلتا رہے۔ ہم تمہیں خوش آمدید کہتے ہیں۔"

ہم لوگ سیڑھیاں چڑھتے وقت بڑے جذباتی ہو گئے۔

جیسے کسی عبادت گاہ میں داخل ہو رہے ہیں۔ تالیوں کے شور میں بالکل مہمانوں کی طرح استقبال کیا گیا۔

پھر ڈنر ہوا۔ کالج کے گانے گائے۔ چٹکلے سنائے اور بے تحاشہ قہقہے لگائے سال بڑا مبارک گزرا۔

ایک تو مہاتما گاندھی کے درشن ہوئے آئی ٹی کالج امریکی ادارہ تھا میتھوڈسٹ

جرنلزم سے وابستہ کلاس میں ہم آزادی سے حکومت برطانیہ کی پالیسی پر اعتراض کر سکتے تھے۔ غدر اور برٹش راج پر کھل کر بات کر سکتے تھے۔ امریکہ نے برطانیہ کا راج کیسے ختم کیا۔ برطانیہ کی ایک نوآبادیات میں سے تھا۔ ہمیں ہندوستانی لیڈروں کی تقریریں سننے کی اجازت ہی نہیں بلکہ تلقین کی جاتی تھی۔ امریکہ اس وقت تک سامراجی طاقت نہیں بنا تھا اور برطانوی نوآبادیات سے ہمدردی تھی۔ امریکی قوم کھلے دل کی صاف گو اور مخلص تھی۔ نہ ہتھیار کا دھندا ہوتا تھا۔ نہ دوسرے ملکوں سے تجارتی لین دین اتنا وسیع تھا۔ ضرورت کے مطابق پیداوار تھی اور کسی ملک کا خام کے معاملے میں دست نگر نہیں تھا۔ امریکی مصنوعات کو بازار کی ضرورت تھی۔

اور بڑے مزے کی بات ہے کہ آج امریکہ کا سب سے بڑا حریف روس امریکہ کی ہمدردی وصول کر رہا تھا۔

ہم نے روس کی مدد کے لیے کپڑے اور چندہ جمع کیا تھا کیونکہ مس شیٹن نے بتایا تھا کہ اس سال روس میں بڑی سخت سردی پڑی تھی اور ملک کے بڑے کٹھن دور سے گزر رہا تھا۔

انہیں دنوں ایک فلم "راسپوٹین" آئی تھی۔ اسے دیکھنے سے پہلے زار روس اور زارینہ کے بارے میں باقاعدہ لیکچر دیئے۔ کس طرح زارینہ راسپوٹین کی دیوانی تھی اسے پیغمبر سمجھتی تھی۔ امیرزادیاں اس کی محبت میں دیوانی تھیں وہ سب پر دست شفقت پھیرتا تھا۔

"کیتھرین دی گریٹ" فلم دیکھنے سے پہلے ہمیں کیتھرین کے بارے میں مواد جمع کرنے میں مدد دی بڑی گرماگرم بحثیں کلاس میں ہوتیں۔

یونیورسٹی میں کبھی کسی مشہور شخصیت کو مدعو کیا جاتا تو ہمیں جانے کی اجازت دے دی جاتی۔

خالدہ ادیب خانم سے یونیورسٹی میں ملنے کے بعد انہیں اپنے کالج میں بھی مدعو کیا، ان کے متعلق جتنا بھی مواد مل سکا ہم نے پڑھا وہ آئیں تو ان سے سوالات کئے ترکی کے انقلاب کے متعلق ان سے گفتگو کی۔ کوئی اکنامکس یا پالٹیکس کا پروفیسر لیکچر ٹور پر آتا تو ہم باقاعدگی سے شریک ہوتے پھر کلاس میں مباحثہ کرتے۔

یونیورسٹی پہلی بار گئے تو مس شیٹن نے اسمبلی ہال میں ہمیں سمجھایا چونکہ پہلی بار ہم لڑکوں کے ساتھ بیٹھیں گے اس لئے ہمیں احتیاط برتنی ہوگی۔ بعض چھچھورے لڑکے اوچھے مذاق کرنے لگتے ہیں۔ کوئی ایسی بات نہیں ہونی چاہیئے کہ لوگ معترض ہوں۔ ابھی لوگ مخلوط تعلیم کے عادی نہیں ہیں۔

مجھے عام طور پر بزرگانہ نصیحتوں سے چڑھ تھی۔ مگر آئی ٹی کی پروفیسر ایسے نرمی سے مسکرا کے دوستانہ انداز میں رائے دیتیں کہ ہم بڑی فرمانبرداری سے سن لیتی اور کبھی سرکشی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ بات کہنے کا انداز کچھ ایسا ہوتا تھا کہ اتھارٹی اور دباؤ کی بو نہیں آتی تھی۔

مجھے ہر بات میں دلچسپی تھی، مزہ آتا۔ وہ آزادی اور روشنی جو اس ماحول میں مل رہی تھی، میرا دماغ تیزی سے جذب کرنے میں غرق تھا نئے نئے دروازے اور کھڑکیاں دماغ میں کھل رہی تھیں، علم و دانش کے اس بے پناہ طوفان میں چند بوندیں بھی انسان سمیٹ لے تو راہیں روشن ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ ہم نے فولادی دیواروں سے سر ٹکرایا تھا۔ اور سر میں کوئی دراڑ نہیں پڑی تھی، دن بدن مجھے اپنے شعور کا قد بلند ہوتا دکھائی دے رہا تھا اور دنیا بڑی پیاری لگ رہی تھی۔

مشکل یہ ہے کہ دماغ کے ساتھ قدرت نے جسم بھی منسلک کر دیا ہے دماغ اور جسم میں کبھی کھٹ پٹ بھی ہو جاتی ہے کبھی اس دھر پکڑ میں راہوں کے دیئے بجھ بھی جاتے ہیں۔ توازن قائم نہیں رہتا۔ ان میں سے ایک کی موت دونوں کو لے ڈوبتی ہے

لکھنؤ میں پہلی مرتبہ آزادی سے بازاروں میں گھومنے کے مواقع کے ساتھ لڑکوں سے بھی واسطہ پڑا۔

علی گڑھ میں تو کالج کے گرد کے دور فاصلے پر ایک گینلک سا خواب تھے لڑکی کے دل میں جو خوف جنس مخالف کے لئے بچپن سے بٹھایا جاتا ہے اس کی جڑیں بڑی گہری اور مضبوط ہوتی ہیں۔ میں چونکہ بھائیوں کی صحبت میں پلی تھی۔ باپ کا سر پر سایہ نہیں قریب میسر ہوا تھا۔ رشتہ کے بھائیوں کو بھگتا تھا۔ لہذا لڑکے مجھے ہوا نہیں لگتے تھے اور ایک شریف لڑکی مرد ذات کو ہوا سمجھے تو یقیناً وہ نیک نہاد نہیں ہو سکتی۔ سلطانہ، آمنہ بھی ذہنی طور پر مرد ذات سے خائف نہیں۔ نہ مرعوب، ہر خاندان میں نالائق مرد ہی ہوتے ہیں۔ ان سے موازنہ کر کے تعلیم یافتہ لڑکی کے ذہن سے عورت کی کمتری کے سارے ڈھکوسلے دھول جاتے ہیں۔ عورت کا مرد پر سبقت لے جانا خلاف قدرت نہیں ہے اور پٹا ہوا یقین کہ عورت مرد سے کمتر ہے فرد کی سطح پر آ کر احمقانہ ثابت ہو سکتا ہے۔

پھر بھی یہ قدرت کا تقاضہ ہے کہ جنس مخالف کا وجود ایک دوسرے کے لئے ہنگامہ خیز ہوتا ہے۔ جب یونیورسٹی جاتے تو اس احساس سے خوفزدہ ہو کر ہم ہی گٹھ بنا کر ساتھ ساتھ رہتے، کیونکہ گروہ میں ہر حملہ کی مدافعت کی طاقت ہوتی ہے۔

یونیورسٹی میں کلاس روم یا لیکچر ہال میں اگر لیکچرر قابل اور زوردار ہوتا تو ایسے محو ہو جاتے کہ ایک دوسرے کے جنسی وجود کو بھی فراموش کر دیتے۔ ہاں کوئی بور لیکچرار ہوتا تو نگاہیں آس پاس بھٹکنے لگتیں رومانی گیند کی فقرہ پردازیاں شروع ہو جاتیں مگر عموماً ایسا بہت کم ہوتا اور لیکچرار چاہے اپنے مضمون پر قدرت نہ رکھتا ہو اس رویہ کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ عموماً یونیورسٹی جب ہی جانا ہوتا تھا جب کوئی مشہور دانشور آتا اور ہم ایسے مسحور ہو جاتے کہ کبھی دھیان نہیں بھٹکا۔ لڑکے لڑکیاں معیاری طالبعلم

ثابت ہوتے۔

لیکن ہال سے نکل کر پھر فضا میں بارود کی بو پھیل جاتی اور لڑکیاں لگنے کی صورت میں الگ اور لڑکے بھیڑیوں کے غول کی طرح پیچھے پیچھے خاص طور پر ایک لڑکا ہسری تو بس بے پناہ تھا۔ لڑکیاں اسے "ہائے" کہا کرتی تھیں۔ اس کا نام مینڈو سا بھی رکھ لیا تھا کہ مینڈو سادہ آسیب تھا جسے دیکھنے والی پہلی نظر میں پتھر ہو جاتا تھا۔ ہسری کا چھ فٹے سے بھی کچھ نکلا ہو قد ڈس لینے والی غلافی آنکھیں ولایتی ماں اور بنگالی باپ کے میل سے میٹھا شہد جیسا رنگ، اور سے ہونٹوں میں سے بجلی کی طرح کوندتی ہوئی موتیوں کی قطار۔

ہسری کی دہشت صنف نازک پر بے طرح بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے بڑے بڑے شکار کئے تھے جب سکول ہی میں تھا تو کانونٹ کی ایک نن کا تقدس بھنگ کر چکا تھا۔ کافی دن سے وہ آئی ٹی کے گروہ کو کالج کے پھاٹک تک پہنچانے جا رہا تھا۔ اور یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ وہ نشاط محل گروپ پر دست شفقت پھیر رہا تھا۔ ہمارے گروہ میں سلطانہ اور کئی فتالۂ عالم تھیں۔ سلطانہ تو نہایت پھکڑ تھی، مگر آمنہ اس کی چھوٹی بہن بے حد بھولی اور گلاب کے پھول کی طرح نازک تھی بے حد پڑھاکو، جنس مخالف سے بے خبر نطفی لقمۂ تر تھی۔ سب سے زیادہ بُرد بار بزرگانہ نصیحتیں، اصولوں کی پابندی کی یاد دہانی؛ دولت علم کی اہمیت پر کافی زور تھا۔ ایک دن ہم سیڑھیوں پر بیٹھے قہقہے لگا رہے تھے آمنہ منہ سجائے کمرے سے نکلیں اور ڈانٹنے لگیں۔

"خود نہیں پڑھتیں تو دوسرے کو بھی نہیں پڑھنے دیتیں۔" جب وہ بڑبڑانے لگی تو میں نے کہا۔

"اچھا دادی اماں۔ اب منہ پر تالہ ڈال لیں گے۔"

ایک دم آمنہ روتی ہوئی کمرے میں بھاگ گئی۔ صبح بات کا جواب ندارد۔ دو تین دن گزرے ساتھ کھانا پینا اٹھنا بیٹھنا مگر بات کا جواب ندارد۔ یا خدا کیا ماجرا ہے۔

"کہتی ہے تم نے اسے گالی دی۔"

"گالی؟"

"ہاں دادی۔"

"ارے یعنی اپنے دادا کی بیوی۔ مگر وہ تو کبھی کے انتقال فرما گئے" نہ جانے کیوں ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ یہ چھوٹی سی بچی اور میرے دادا! جو آگرہ میں منوں مٹی تلے بے خبر سو رہے تھے۔ اور میں ان کے ناطے جوڑ رہی تھی میں نے بڑی مشکل سے سمجھایا کہ یہ تو کہاوت ہے جو چھوٹی بچیاں بزرگانہ باتیں کرتی ہیں انہیں طنزیہ دادی اماں کہہ دیتے ہیں بڑا بہلایا تب جا کے ہنسیں۔

ہم جب بھی باہر نکلتے آمنہ ہمیشہ بیچ میں رہتیں۔ یعنی قلعہ بند کہیں کوئی لڑکا کہنی مارتا نہ نکل جائے۔ میرے ایک دفعہ لڑکا کہنی مار کے آگے چلنے لگا بے ساختہ میں نے بڑھ کے اس کی پیٹھ پر ایک کس کے دھموکا جڑ دیا۔ حرکت ایسی بے اختیاری تھی کہ میں خود بوکھلا گئی اور لڑکوں نے قہقہے لگانے شروع کر دیئے۔ وہ لڑکا سر پٹ بھاگا میرے ساتھ ایلیا تھی اس نے بہت ڈانٹا۔

شمیم جب مارتا تھا تو میرا بھی بے اختیار ہاتھ اُٹھ جاتا تھا۔ پھر بھی جب میری بہت لے دے ہوئی تو مجھے اپنی حرکت بہت بے جا لگی۔ بات پھیل گئی اور استاد تک پہنچی لیکن کسی نے ذکر تک نہ چھیڑا نہ ملامت کی۔ کلاس میں کبھی استاد ایسے دیکھتیں کہ جی چاہتا چوہے کے بل میں گھس جاؤں میں نے نسوانی وقار کو ٹھیس لگائی تھی۔

مگر دل کے کسی کونے میں کوئی کہتا تھا میں نے کوئی جرم نہیں کیا! وہ یقیناً شیطان ہو گا۔ اسی شیطان نے بچپن میں بھی مار کھلوائی اور اب بھی رسوائی کی ڈگر پہ لے جا رہا ہے۔ شیطان کے سر الزام تھوپ کر مجھے گو نہ سکون ہوا شیطانی حرکتوں کی میں ذمہ دار نہیں تھی۔

مجھے نہیں یاد کہ مجھے کبھی کسی نے چھیڑا ہو۔ راہ چلتے یا تو میں ساتھ والوں سے اتنے جوش و خروش سے باتیں کرتی ہوں کہ سوائے اپنی آواز کے اور کچھ نہیں سنائی دیتا ورنہ نہ جانے کہاں دور خلاؤں میں کھو جاتی ہوں کہ کچھ نہ سنائی دے نہ دکھائی دے۔ اکثر حادثہ سے بچی ہوں۔ موٹر کا ہارن ایسی حالت میں کبھی نہیں دکھائی دیتا۔ اکثر کہیں کی کہیں نکل جاتی ہوں۔ جب جاگتی ہوں تو پلٹ کر سیدھی راہ چلنے لگتی ہوں۔ ادھر ادھر دیکھتی ہوں کسی کو میری حماقت کا پتہ تو نہیں چلا۔ بھلا کسی کو کیا پتہ میں بھٹک گئی ہوں۔

میں نے اپنے بڑے الجھے ہوئے مسائل لمبی چہل قدمی کے دوران سلجھائے ہیں کہانیاں ایڈٹ کی ہیں۔ برے وقت ٹالے ہیں۔ اب بھی جب کہیں سوئی اٹک جاتی ہے۔ میں میرین ڈرائیو پر سمندر کے کنارے چوپاٹی کی طرف چلنا شروع کر دیتی ہوں۔ راستہ میں کبھی کوئی جان پہچان کا مل جاتا ہے میں باتوں باتوں میں اپنے مسئلہ کو کسی کہانی کا پلاٹ کہہ کر یا کسی اور کے سر تھوپ کر نہایت غیر جانبداری سے تبادلۂ خیال کرتی ہوں۔ تنی ہوئی ڈوریاں نرم پڑ جاتی ہیں۔

سال کے خاتمہ پر جب بی اے سینیئر کی لڑکیوں کو الوداعی ڈنر دیا گیا تو پھر آئی۔ ٹی کالج کی روایت کے مطابق خوب رنگ جما بہت ہی جذباتی رسم ادا کی گئی۔ ہال کا سارا فرنیچر دیواروں سے لگا دیا گیا۔ بیچ میں رخصت ہونے والی لڑکیاں ایک حلقے میں کھڑی ہوتیں اور جن کا آخری سال تھا وہ ان کے پیچھے کھڑی ہوتیں۔ اگلی قطار کی لڑکیوں کے ہاتھ میں مٹی کی ہانڈیوں کی رنگ برنگی قندیلیں تھیں جن میں چراغ روشن تھے۔ کالج کے گانوں کے بعد آخری رسم میں سینیئر لڑکیوں نے وہ قندیلیں جونیئر لڑکیوں کو سونپ دیں۔

"یہ علم کی شمع جو ہمیں ہماری سینیئر بہنوں نے تھمائی تھی۔ ہم تمہیں سونپتے ہیں۔ یہ بجھنے نہ پائے۔"

بے اختیار لڑکیاں پھوٹ کر رو پڑیں - پروفیسروں کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔
ان قندیلوں کی روشنی آج تک دماغ میں محفوظ ہے۔

ددھیال والوں کا خیال تھا کہ میں پورم پور اپنی ننھیال والوں پر گئی ہوں نگوڑے پیچ پلی دال کھانے والے - مگر ننھیال والوں کو یقین تھا کہ میں سو فیصدی ددھیال پر پڑی ہوں وہی اپنی پھوپھی جیسا نہیا اور گز بھر کی زبان - چنگیز خان کی اولاد سے اور کیا امید کی جا سکتی ہے۔

لیکن اگر کوئی اماں سے پوچھتا کہ بیٹی کو کیا ہو گیا ہے تو وہ ٹھنڈی سانس بھر کر کہتیں "نہ ددھیال کا قصور نہ ننھیال کا - یہ سب نصیب کا پھیر ہے"

ایسی صورت میں کس کا نام لے دوں وہ بیج جس سے میری ہستی وجود میں آئی قطعی ٹیڑھا میڑھا نہ تھا - ضرور پانے پوسنے میں کہیں بھول چوک ہو گی۔

مگر مجھے بذات خود اس ماحول سے کوئی شکایت نہیں جہاں میری تراش خراش ہوئی کچر بچر بچوں کے جم غفیر میں ایک پا پیادہ سپاہی کی طرح تربیت پائی - نہ لاڈ ہوئے نہ نخرے نہ کبھی تعویز گنڈے بندھے نہ نظر اتاری گئی - نہ خود کو کبھی کسی کی زندگی کا اہم حصہ محسوس کیا۔

بہنیں چونکہ بڑی نکل گئیں اس لئے بھائیوں کی صف میں جگہ ملی کھیل کود کا زمانہ انہیں کے ساتھ گلی ڈنڈا، فٹ بال اور ہاکی کھیل کر گزرا - پڑھائی بھی ان کے ساتھ ہی ہوئی -

سچ پوچھئے تو اصل مجرم میرے بھائی ہی تھے جن کی صحبت نے مجھے ان ہی کی طرح آزادی سے سوچنے پر مجبور کیا - وہ شرم و حیا جو عام طور پر درمیانہ طبقہ کی لڑکیوں میں لازمی صفت سمجھی جاتی ہے پنپ نہ سکی چھوٹی سی عمر سے دوپٹہ اوڑھنا جھک کر سلام کرنا، شادی بیاہ کے ذکر پر شرمانے کی عادت بھائیوں نے چھیڑ چھاڑ کر پڑنے ہی نہ دی - سوائے عظیم بھائی کے سب ہی گھر میں چاق و چوبند تھے - کنبہ کا کنبہ حد درجہ با مذاق اور باتونی، آپس میں جھپٹیں چلتیں، نئے نئے جملے تراشے جاتے، ایک

دوسرے کی دھجیاں اڑائی جاتیں - بچے بچے کی زبان پر سان رکھ جاتی -

ابا پنشن لے کر آگرہ کے موروثی گھر میں رہنے لگے کھلی ہوا میں آڑنے کے بعد ایکدم سے نہایت بوسیدہ ماحول کی گھٹن سے واسطہ پڑا - کہاں فٹ بال اور گلی ڈنڈا اور کہاں آگرہ محلہ پنجہ شاہی کی بوسیدہ گلیاں اور ان گھٹی ہوئی گلیوں میں پلنے والی جھکی جھکی نیم مدقوق لڑکیاں جو اپنے دل کی دھڑکن سے سہم جائیں - میری ان لڑکیوں سے بالکل نہ بنی اور ان بڑھیوں سے بھی ٹھن گئی جو مجھے چھتوں پر قلانچیں بھرتا دیکھ کر ہیبت زدہ ہو جاتیں -

"نوج لوا، نچھو کی لونڈیا ہے کہ موا نجبار توبہ توبہ"

اور میری اماں جان نصرت خانم جنہیں لوگ پیار میں نچھو کہتے تھے، شرم کے مارے پانی پانی ہو جاتیں۔

اور آگرہ کی ان مردہ گلیوں میں پہلی بار مجھے اپنے لڑکی ہونے کا صدمہ ہوا - عورت خدا نے کیوں پیدا کی - مری پٹی مجبور و محکوم ہستی کی کیا ضرورت - دھوبن روز رات کو پٹتی تھی - میرانی کے آئے دن جوتے پڑا کرتے تھے - پاس پڑوس کی تمام ہی عورتیں آئے دن اپنے شوہروں کے جوتے کھایا کرتی تھیں اور میں خدا سے گڑگڑا کر دعائیں مانگتی اے اللہ پاک مجھے لڑکا بنا دے کہ میں بھی چھت پر پتنگ اڑانے پر نہ پٹوں۔ گلیوں میں کبڈی کھیل سکوں اور آزادی سے بندروں کے پیچھے بھاگتی پھروں مگر آگرہ میں گندی گلیاں ہی نہ تھیں ان گلیوں میں سارے دور اور قریب، کے رشتہ دار بھی رہتے تھے جن سے اماں لرزا کرتی - جب تک دوسرے شہروں رہے آزاد رہے اپنے کنبہ میں آ کر تو جیسے بیڑیاں پڑ گئیں۔

مگر مجھے آگرہ کی ان سڑیلی دبلی دبالی لڑکیوں سے مجبوراً بہناپہ جوڑنا پڑا - اور مجھے معلوم ہوا کہ بظاہر میں بھولی نظر آنے والی لڑکیاں بڑی چلتی پرزہ ہیں چھپ کر

وہ گل کھلائے جاتے ہیں کہ الہٰی توبہ۔ بڑھیوں کو چٹکیوں میں اُلّو بنا کر گلی کے لونڈوں سے خوب خوب پینگیں بڑھتی ہیں۔ مجھے اس دوغلی زندگی سے بڑی کراہت آئی۔

آگرہ کی مکروہ فضا سے جلد ہی پیچھا چھوٹ گیا۔ اور ہم لوگ علی گڑھ منتقل ہو گئے۔ اماں کو بھی کچھ خاندان والوں سے وحشت ہوتی تھی۔ علی گڑھ کی کھُلی فضا میں پھر ہماری پرانی زندگی لوٹ آئی۔ وہی پھوس کے بنگلے ڈگی کا کنارہ اور ہرے بھرے کھیت اور ان کھیتوں میں ککڑیاں کھیرے چُرانا، پیڑوں پر چڑھنا، اور پھر مجھے اپنے لڑکی ہونے کا غم نہ رہا بلکہ لڑکی ہونے کے کچھ فائدے نظر آنے لگے۔ مثلاً ابا کا حکم تھا کہ لڑکیوں کی چوٹی نہ کھینچی جائے۔ اور نہ ان کی بالیوں میں اُنگلی ڈال کر جھٹکے دیئے جائیں۔ لڑکیاں اگر ماریں تو سرکار سے شکایت کی جائے۔ مناسب سزا دی جائے گی۔ لڑکیاں کہاں بس خاکسار ہی ایک لڑکی تھی جس کی شکائتیں ابا حضور کے دربار میں آئے دن پیش کی جاتیں۔ مگر بھائی اتنے بد نام ہو چکے تھے کہ عموماً سزا نہیں ملتی، اُلٹے ڈانٹ دیئے جاتے۔

علی گڑھ آ کے عظیم بھائی کے وجود کا احساس دن بدن بڑھنے لگا۔ خدا جانے انہیں مجھ سے کیوں ایکدم دلچسپی پیدا ہو گئی۔ مجھے تو بڑے بھائی نسیم ہمیشہ سے اچھے لگتے تھے۔ ان سے مار کھانے میں بھی مزا آتا تھا، کیونکہ وہ پیسے اور مٹھائیاں بھی تو دیتے تھے۔ عظیم بھائی نہ پیسے دیتے نہ چپتیں مارتے تھے۔ بڑی سنجیدگی سے بات کرتے۔

اور پھر انہوں نے مجھے تاریخ اور انگریزی پڑھانا شروع کی۔ یہ یاد نہیں رہا کہ ابتدا کیسے ہوئی مگر اتنا یاد ہے کہ شام کو جب وہ کام سے تھکے ہارے آتے تھے تو اپنے برآمدے میں پلنگ پر لیٹ جاتے تھے اور مجھ سے کہتے زور زور سے پڑھو۔ میرا ترجمہ درست کرواتے اِملا لکھواتے اس کے بعد باتیں کیا کرتے۔ یاد نہیں کیا باتیں تھیں

جن سے ابتدا ہوئی۔ بعد میں تو حدیث و قرآن کے بارے میں بتایا کرتے تھے ان کے پڑھانے کا طریقہ عجیب تھا۔ کوئی ناول دیتے کہ اس کا ترجمہ کر ڈالو۔ انگریزی سے اردو میں اور اردو سے انگریزی میں۔ دس دس صفحے ترجمہ کروا ڈالتے۔ ناولوں کا ترجمہ کروانے میں کئی فائدے ہوتے تھے۔ ایک تو یہ کہ پوری ناول کا ترجمہ کرنے سے پہلے ناول ختم کرنا پڑتی تھی۔ اور اسی زمانہ سے مجھے شدت سے ناولیں پڑھنے کا چکر پڑ گیا۔ ساری ساری رات ناولیں پڑھیں خاک پلے نہیں پڑا۔ لہذا پھر پڑھنا پڑھیں۔ ہارڈی وہ پہلا ناولسٹ تھا جسے میں نے بقول عظیم بھائی گھول کر پی لیا۔

اس زمانہ میں عظیم بھائی نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ میں بالکل ان کی آواز بازگشت بن گئی۔

"منصور کے پردے میں خدا بول رہا ہے" جب میں بولتی تو سب چڑاتے کہ یہ میں نہیں عظیم بول رہے ہیں اور عظیم بھائی نے میری ناسمجھی سے فائدہ اٹھایا۔ وہ بات جو وہ خود نہ کہہ پاتے بڑی ہشیاری سے میرے کان میں ڈال دیتے اور میں پھٹ سے کہہ دیتی۔ اس دور میں بقول خاندان والوں کے انہوں نے مجھے خوب بھڑکایا۔ میری طبیعت جو پہلے ہی خودسر اور ضدی تھی۔ ان کی شہ پا کر اور بھی قابو سے باہر ہو گئی۔

وہ ان دنوں قانون پڑھ رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ ایک کارخانہ میں نوکری بھی کرتے تھے۔ مضمون بھی لکھا کرتے تھے۔ اس قدر محنت کرنے کے بعد وہ رات کو مجھے کئی گھنٹے پڑھایا کرتے کبھی انہیں حرارت ہو جاتی کبھی سینے میں درد ہوتا۔ ہاتھ پیر اینٹھتے، ان کی بیوی بیٹھی ان کی چھاتی سینکا کرتیں، اور وہ مجھے پڑھایا کرتے کبھی مجھ سے سر یا پیر دبانے کو نہیں کہا۔ اور میں نے کوئی نہیں کہا۔ اور میں نے بھی کبھی ان کا کوئی کام کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی بڑے بھائی جو تھے۔ اس لئے مجھے پڑھانا تو ان کا فرض تھا۔ ایک دفعہ ان کو بڑی شدت کا کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ دو گھنٹے ہو گئے اور صفحوں

کا ترجمہ ختم نہ ہو پایا مجھے جھلاہٹ آنے لگی۔

"ہم نہیں پڑھتے آپ سے۔ آپ اتنا تو کھا نستے ہیں۔" میں نے جل کر کہا۔

"بے وقوف کہیں کی، ہم جان بوجھ کر کھانس رہے ہیں۔" انہوں نے ہنس کر کہا اور وعدہ کیا کہ اب نہیں کھانسیں گے۔

پتہ نہیں انہیں میرے مستقبل سے کیوں دلچسپی ہو گئی تھی۔ میٹرک کرنے پر تو اس قدر خوش ہوئے کہ اپنے بیٹے کے پیدا ہونے پر بھی نہ ہوئے ہوں گے۔ چھٹیوں میں انہوں نے مجھے اپنے گھر بلا لیا، چونکہ اب وہ جودھ پور میں وکالت کرنے لگے تھے۔ ان دنوں انہوں نے مجھے قرآن کا ترجمہ اور حدیث پڑھنے میں مدد دی۔

اور شاید کیا بلکہ قطعی میں نے ان کے افسانے پڑھ پڑھ کر خود بھی چھپ کر لکھنا شروع کر دیا۔ حجاب امتیاز علی، مجنوں گورکھپوری اور نیاز فتح پوری کے افسانے پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا گویا یہ سب کچھ میرے ہی اوپر بیت رہی ہے، اور پھر میں نے خود کو افسانہ کی ہیروئن تصور کر کے نہایت چٹ پٹے قسم کے واقعات لکھنا شروع کئے۔

نیلی آنکھیں۔۔۔۔ قرمزی رنگ کا لبادہ اوڑھے نیم دراز ہوں، ہیرو آتا ہے۔۔۔ میرا پہلا ہیرو ہمیشہ ڈاکٹر ہوتا تھا۔ شاید اس لئے کہ اس زمانہ میں ڈاکٹر ہی ایسا غیر مرد ہوتا تھا جو گھر میں آکر نبض ٹٹول سکتا تھا۔ یہ ڈاکٹر لازمی طور پر بہت حسین ہوتا تھا۔ رات بھر میرے سرہانے بیٹھا رہتا۔ میری حالت خراب ہونے پر زار و قطار روتا۔ بے تابانہ مجھے چومتا، اور میری حسین موت پر ڈاڑھیں مار کر روتا اور عموماً خودکشی کر لیتا۔ کیا مزے دار ہوا کرتی تھیں یہ کہانیاں۔ انہیں لکھنے میں اتنا ہی لطف آتا تھا جیسا چٹ پٹی کہانیاں پڑھنے میں آتا ہے۔ جیسے رومانی ناولوں میں جب ہیرو ہیروئن کے لبوں کا بوسہ لیتا ہے تو پڑھنے والے کے پسینے چھوٹ جاتے ہیں۔ یہی حال لکھنے میں بھی ہوتا ہے۔ عموماً ایسی کہانیاں

لکھ کر میں فوراً پھاڑ ڈالا کرتی کیونکہ مجھے معلوم تھا وہ "گندی" ہیں اور اگر کسی نے پڑھ لیں تو وہ جوتہ کاری ہوگی کہ بس۔

مگر نہ جانے کیوں لکھ کر دوبارہ سہ بارہ پڑھنے میں لطف آتا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے میں نے نہیں کسی اور نے لکھی ہیں۔ اور واقعی وہ میری تصنیف نہ تھی اور نہ میرا روزنامچہ تھیں بلکہ وہ ان کہانیوں کا نچوڑ تھیں جو مجھے بھا چکی تھیں۔

ایسی کہانیوں کا میرے سرہانے انبار جمع ہو گیا اور وہی ہوا جس کا مجھے خوف تھا۔

ایک دن شمیم جو عمر میں مجھ سے ڈیڑھ سال بڑے ہیں، میرے پلنگ پر لیٹ گئے۔ سرہانے کاغذ سرسرائے تو نکال کر پڑھنے لگے "آہا ہا۔۔۔ چھُنّی نے کیا گندی باتیں لکھی ہیں۔ توبہ توبہ۔"

شمیم نے زور زور سے پڑھنا شروع کر دیا۔

ڈاکٹر جمیل نے اپنا سفید براق ہاتھ میرے سینے پر رکھا اور میرے گلابی ہونٹ"

میں پاس ہی غسل خانے میں نہا رہی تھی، کرتہ میں ڈال چکی تھی۔

افوہ بیان نہیں کر سکتی کہ کیا حالت ہوئی۔۔۔۔۔ یا خدا اگر ایک سطر اور آگے پڑھ لی تو پھر ڈوب مرنے کے سوا کہیں ٹھکانا نہ رہے گا۔

ہیبت زدہ ہو کر میں نے غسل خانہ ہی سے وہ زور زور کی چیخیں ماریں کہ سارا گھر ہل گیا۔ لوگ سمجھے کہ شاید موری سے سانپ نکل آیا۔ اور مجھے ڈس لیا۔ شمیم بیچارہ کاغذ پھینک پھانک میری جان کی خیر منانے لگا۔ میں نے الٹے سیدھے کپڑے پہنے اور باہر نکل کر شمیم کا منہ نوچ ڈالا۔ وہ بے چارہ ہونق منہ پھاڑ کر رہ گیا۔ آگے اسے پڑھنے کا ہوش ہی نہیں رہا۔ وہ خود میری زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ میں نے اسی وقت سارا پلندہ جلا کر خاک کر دیا۔ شمیم نے بہت کہنے کی کوشش کی کہ میں نے نہایت گندی کہانیاں لکھی تھیں مگر میں نے جھٹلا دیا کہ ٹرانسلیشن تھا۔ وہ بیچارہ پڑے

درجے کا جھوٹا مشہور تھا اس لئے کسی نے نوٹس نہ لیا۔

اب اس خیال سے کوفت ہوتی ہے کہ اگر بجائے شمیم کے کوئی دوسرا پڑھ لیتا تو واقعی قیامت آجاتی۔ بس اس دن سے میں نے توبہ کی کہ اول تو ایسی بیہودہ کہانیاں لکھوں گی نہیں جو اگر لکھیں بھی تو فوراً پھاڑ ڈالوں گی۔ حالانکہ اب اگر غور کرتی ہوں تو ہنسی آتی ہے۔

ان کہانیوں میں تو کچھ بھی نہیں تھا۔ سوائے اوپری مچو ماچا چانڈ کے جو مجھے نہایت پھس پھسی لگنے لگی تھی۔

پھر کئی سال کچھ نہیں لکھا۔ بی اے کے بعد دنیا ہی بدل جاتی ہے۔ چار سال میں انسان کتنا بڑا ہو جاتا ہے۔ میٹرک کے بعد چار سال میں نے کورس کی کتابیں مجبوراً پڑھیں۔ یونانی ڈرامہ پیتھین پلے اور شیکسپیئر سے لے کر ابسن اور برنارڈ شا تک بہت کچھ پڑھ ڈالا۔ برنارڈ شا نے میرا دل مٹھی میں لے لیا۔ میں نے اپنا پہلا مضمون یا ڈرامہ "فسادی" برنارڈ شا سے حد درجہ متاثر ہو کر لکھا۔ مواد میں نے اپنے اردگرد سے لیا اور اینٹ گارا برنارڈ شا سے سیکھا۔ بی اے کلاس میں میری ہم جماعت عذرا حمید مجھے برنارڈ شا کہہ کر مجھے خوب چڑایا کرتی۔ اس لئے میں نے فوراً برنارڈ شا کے شکنجے سے نکل کر کہانیاں لکھنا شروع کیں۔ میری پہلی تحریر شاہد احمد دہلوی کے مشہور رسالے "ساقی" میں چھپی۔

اور زندگی کے اس دور میں مجھے ایک طوفانی ہستی سے ملنے کا اتفاق ہوا جس کے وجود نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ روشن آنکھوں اور مسکراتے شگفتہ چہرے والی رشیدہ آپا سے کون ایسا واقف تھا ایک دفعہ مل کر پھنسا نہ جائے۔

پہلی دفعہ میں نے انہیں نہ جانے کون سے جلسے میں دیکھا تھا۔ بیگم بھوپال صدارت کی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ کڑکڑاتے جاڑے میں بیویاں موٹے موٹے دوشالے اور کوٹ ڈاٹے پنڈال کے اندر سوں سوں کر رہی تھیں۔ اور رشیدہ آپا بغیر آستین کا بلاؤز پہنے دھواں دھار کچھ کہہ رہی تھیں۔ ان کے سیاہ بھونرا اور

گھنگھریالے بال ہوا میں اُڑ رہے تھے کیونکہ تقریر شروع کرنے سے پہلے انہوں نے سامنے کی کھڑکی کھول دی تھی۔ بیویاں بڑبڑا رہی تھیں ان کے کٹے ہوئے بالوں پر بغیر آستین کی بلاؤز پر اور کھلی ہوئی کھڑکی سب سے آتی ہوئی برفیلی ہوا پر۔ مگر ان کی تقریر بھی شاید کچھ کم خاردار نہیں تھی۔ کیونکہ تقریر کے بعد انہیں بیگم بھوپال نے خوب ڈانٹا۔ اس دن ان کی بے حیائی اور بے باکی کا تہلکہ مچ گیا تھا۔ اور میں نے بے سمجھے بوجھے ان کے ہر لفظ کو موتی سمجھ کر چن لیا تھا۔

۱۹۳۸ء میں رشیدہ آپا انگاروں والی رشیدہ آپا بن چکی تھیں۔ اب ان کی سلگتی ہوئی باتیں پلے بھی پڑنے لگی تھیں۔

اور پھر وہ میرا حسین ڈاکٹر، ہیرو، ریشمی انگلیاں، نارنگی کے شگوفے اور قرمزی لبادے چھو ہو گئے مٹی سے بنی ہوئی رشیدہ آپا نے سنگ مرمر کے سارے بت منہدم کر دیئے۔

زندگی ننگی چم سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ ان سے گھنٹوں باتیں کر کے بھی جی سیر نہ ہوتا تھا جی چاہتا انہیں کھا جاؤں اگلا کروں، جو رشیدہ آپا سے مل چکے ہیں۔ انہیں اچھی طرح جانتے ہیں اگر وہ میری کہانیوں کی ہیروئن سے ملیں تو دونوں جڑواں بہنیں نظر آئیں۔ کیونکہ انجانے طور پر میں نے رشیدہ آپا کو ہی اٹھا کر افسانوں کے طاقچہ میں بٹھا دیا کہ میرے تصور کی دنیا کی ہیروئن صرف وہی ہو سکتی تھیں۔ مگر جب غور سے اپنی کہانیوں کے بارے میں سوچتی ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ میں نے صرف ان کی بے باکی اور صاف گوئی کو گرفت میں لے لیا۔ ان کی بھرپور سیاسی شخصیت میرے قابو میں نہ آئی۔ مجھے روتی بسورتی بچے جنتی ماتم کرتی نسوانیت سے ہمیشہ سے نفرت تھی خواہ مخواہ کی نفرت اور وہ حیلہ خوبیاں جو مشرقی عورت کا زیور سمجھی جاتی ہیں مجھے لعنت معلوم ہوتی ہیں۔ جذباتیت سے مجھے سخت کوفت ہوتی ہے۔ عشق قطعی وہ آگ نہیں جو قطعی لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے۔ عشق میں محبوب کی جان کو لاگو ہو جانا، خودکشی کرنا، واویلا کرنا میرے مذہب میں جائز نہیں۔ عشق معنوی دل و دماغ

ہے نہ کرمی کا روگ۔

یہ سب میں نے رشیدہ آپا سے سیکھا اور یقین ہو گیا کہ رشیدہ آپا جیسی لڑکی سو لڑکیوں پہ بھاری پڑ سکتی ہے۔

ملک کی تقسیم کے بعد سوائے فسادات کے اور کچھ ذہن میں باقی نہ رہا۔ ملک بکھرا۔ دنیا بکھری اور اس کے ساتھ کتنی حسین و نازک قدریں چور چور ہو گئیں۔ مقصدی ادب کے نعرے نے اور زیادہ گڑبڑا دیا۔ کیوں لکھیں اور کیا لکھیں؟ کے مخمصہ میں پڑ کر ادبی راستہ گم ہو گیا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین نے بہت کچھ دیا اور بہت کچھ مٹا دیا۔ کتنے نئے ساتھی ملے اور پرانے بچھڑ گئے۔ اور پھر۔

وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا

انجمن کے پرخچے اُڑ گئے۔ بمبئی گروپ جس کی طرف لوگوں کی نظریں اُٹھا کرتی تھیں۔ فلموں میں غرق ہو گیا۔ ظاہر ہے صرف رسالوں کے لئے لکھ کر روزی نہیں کمائی جا سکتی۔ نہ ناولیں اور افسانوں کے مجموعوں سے بمبئی کا خرچہ چل سکتا ہے۔ فلم ہی ایک ایسی لائن ہے جہاں اگر ہاتھ لگ جائے تو قلم چلا کر روٹی کا سہارا ہو سکتا ہے۔

فلموں کے لئے لکھتے وقت معلوم ہوا کہ یہاں نہ بیباکی کی دھونس چلتی ہے نہ فصاحت گوئی کام آتی ہے۔ یہاں تو وہ چیز چاہیئے جو چھپر پھاڑ کر دولت لائے یہاں ایک خاص بندھی ہوئی لکیر کے مطابق چلنا ہو گا۔ لہٰذا چلنے والے چلے اور ناک کے بل چلے۔

فسادات کے بارے میں تجربہ سُنی سنائی سے آگے نہ بڑھ پایا۔ "دھانی بانکپن" اور جڑیں سے زیادہ نہ محسوس کر پائی اور نہ لکھ پائی۔ مگر ان دو مضامین کو لکھتے وقت میرے دل نے بڑے زور سے قلابازی لگائی۔ اس وقت تک میں نے جتنی کہانیاں لکھی تھیں ان میں ماں باپ یا تو تھے ہی نہیں اگر تھے تو نہایت فضول لگتے۔ انہیں نظر انداز کر کے ہی میری دانست میں اُن پر فتح پائی جا سکتی ہے۔ والدین سڑک کا روڑا ہی تو ہیں جو اولاد کا راستہ میں رکاوٹوں کے سوا کچھ نہیں پیدا کرتے "یہ نہ کرو"

وہ نہ کرو۔ اب تک میرے دماغ میں بسا ہوا تھا۔ لیکن یہ دو مضمون لکھتے وقت میں نے اپنی ماں کو دیکھا۔

سب انہیں اکیلا چھوڑ کر پاکستان جا چکے تھے۔ میں ان سے ملنے جودھپور گئی۔ اماں ہمارے ذاتی مکان کے ساتھ ایک مختصر سے کمرے میں منتقل ہو گئی تھیں۔ ہمارا اپنا وسیع مکان رفیوجیوں کے قبضہ میں تھا۔

میں پہنچی تو ڈھنڈار اُجڑے ہوئے کمرے میں میری اماں بیٹھی تھیں۔ اماں کو ہم لوگوں کو چومنے چاٹنے کی کبھی فرصت نہ ملی۔ مجھے نہیں یاد اس سے پہلے کبھی انہوں نے محبت کا اظہار کیا ہو مگر اس وقت مجھے دیکھ کر وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ اپنے قیام کے زمانے میں بار بار میں نے دیکھا وہ خاموش کھڑکی سے اپنے گھر کو تک رہی ہیں جہاں بھرے پُرے خاندان کے ساتھ ہم سب ہنسی خوشی رہتے تھے۔ بچے قلانچیں بھرتے تھے۔ لڑائیاں ہوتی تھیں، ملاپ ہوتے تھے۔ میں نے ان کی عمر کی طرف دیکھا۔ موٹے تازے دس بچے پیدا کر کے وہ وہ اکیلی تھیں۔

میرے دل میں پیار کا طوفان اُبل آیا۔ مامتا جاگ اُٹھی۔ میں نے اپنی ماں کی طرف دیکھا پھر اپنی بچی کی طرف دیکھا اور ان دو ہستیوں کے بیچ میں خود کو جکڑا ہوا پایا۔ اپنی ماں کو دیکھ کر مجھے پہلی دفعہ دنیا کی بڑھیوں پہ پیار آنے لگا۔ جو دنیا کو بساتی ہیں۔ مر مر کر جنم دیتی ہیں۔ انہیں پالتی پوستی ہیں۔ جو کچھ ان پہ نچھاور کرتی ہیں نہ ان سے اسٹامپ لکھاتی ہیں نہ پکے کاغذ پر رسید۔ اب اگر اولاد ان کے بڑھاپے کا خیال کر لے تو فرمانبردار ہے جو ماں باپ بال بچوں کے خرچ سے کچھ نہ بچے تو مجبور ہے۔ پرانے زمانے میں بڑے بوڑھوں کو لوگ بے کار جنس سمجھ کر زندہ دفن کر دیا کرتے تھے۔ یہ سنسان بڑھاپا کس قدر مہیب شے ہے۔

اور یہ بھی اتفاق ہی تھا جو میری اپنی آماں سے ملاقات ہو گئی اور کچھ سوئے ہوئے تار جاگ اُٹھے ۔ ابھی کتنے تار ہیں جو مُردہ خاموش سوئے پڑے ہیں۔ کون جانے کون سے نئے مضراب اور پیدا ہوں گے جن کی چوٹ سے بہت سی نیندیں ٹوٹیں گی ۔

ٹھہرے ہوئے پانی پر کائی جم جاتی ہے ' ایک ننھا سا کنکر سطح پر گرتا ہے .. کائی چھٹ جاتی ہے ..... جگمگاتی دنیا کا عکس پانی کی سطح پر لَو دینے لگتا ہے انسان ایک دم آگے بڑھتا ہے ۔

مجھے کہنا ہے کچھ ....

میری سوا برس کی بیٹی سیما بڑی دیر سے کھڑکی پر چڑھنے کی کوشش کر رہی تھی ۔ میں اور شاہد چائے پی رہے تھے ۔ مگر کا نیچہ بار بار حلق میں ارٹھنس جاتا ۔ چڑیل منہ کے بل گرے گی ۔ کئی دفعہ ہٹایا ۔ پھر جُٹ گئی ۔ تنگ آ کر میں نے اسے جنگلے کے پاس بٹھا دیا ۔

بجائے خوش ہونے کے چڑیل ایسی دھاڑی جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو اور مچل کر اُنز آئی ۔ مگر فوراً ہی پھر چڑھنے لگی ۔ بار بار روکنے پر بھی اڑی رہی تو شاہد نے کہا " مرنے دو کمینی کو "

" ارے واہ منہ ٹوٹ جائے گا ۔ اور صندوق کا کونا کھوپڑی میں گھس گیا تو ..! "

میں پھر اسے اتارنے لگی مگر وہ زور مار کے چڑھ گئی ۔ میری سانس رُک گئی ۔ وہ تالیاں بجا کر اپنی کامیابی پر ہنسنے لگی ۔ میں نے اسے نیچے اتار دیا مگر وہ پھر چڑھنے لگی ۔

دو چار دن کی مشق سے وہ بڑی پھرتی سے چڑھنے لگی ۔

جب جدیدیوں نے لکھنا شروع کیا تو قدرتی طور پر لپک کر انہیں سنبھالنے

کو جی چاہا ۔ ہر ایک دوسرے پر ڈانٹنے لگا کہ وہ ایک مدلّل مضمون لکھے ۔

" بھئی میں تو نہیں لکھوں گی " میں نے فیصلہ کیا ۔

" کیوں ؟ "

" میرے بارے میں جو لکھا گیا ، مجھے ملامتیں دی گئیں ، ڈانٹا پھٹکارا گیا تو میں نے کب ان کی سنی ۔ فرض کیجئے ۔ یہ نئے نوجوان میری سن بھی لیں تو مجھے سخت ناامیدی ہوگی ۔ "

" بھئی وہ کیوں ؟ کیا بزرگوں کا فرض نہیں کہ وہ نوجوانوں کی رہنمائی کریں ؟ "

" سچا ادیب وہی ہے جو رہنمائی سے کترا جائے ۔ وہی لکھے جو اس کے دل کی گہرائی سے اُبھرتا ہے ۔ جو وہ دیکھتا ہے محسوس کرتا ہے جو اس پر بیتتی ہے "

اکثر بحثیں ہوئیں کہ پھر میں نے عینی پر کیوں حملہ کیا تھا ؟

" عینی ہمارے زمانے سے قریب تھیں ۔ ذرا بھٹکی تھیں مگر ہمیں ان سے بہت امیدیں تھیں جو پوری ہوئیں " !

" تو کیا ان نئے ادیبوں سے ناامیدی تھی ؟ "

" نہیں یہ بات نہیں تھی ۔ اصل میں اپنے پلّے ہی نہیں پڑتی تھیں اور سب ایک ہی انداز میں لکھ رہے تھے اور یہ فیصلہ مشکل تھا کہ ان میں سے کون اصلی ہیں اور کون نقلی اور بھیڑ میں کیو بنا کر کھو گئے ہیں اور آنکھیں بند کر کے چلتے جا رہے ہیں ان سے یہ کہنا کہ ہماری طرح لکھو انتہائی خود پرستی ہوگی ۔ احمقوں کی طرح اعتراض کرنا خود اپنی کم مائیگی کا ثبوت ہو سکتا ہے کہ کیا معلوم یہ بڑے پتے کی بات کہہ رہے ہوں ۔

جدیدیت پہلے پاکستان میں پھیلی ۔ وہاں بڑی پابندیاں تھیں کھل کر لکھنے پر سزائیں مل رہی تھیں ۔ کمیونسٹ پارٹی پر پابندی لگ چکی تھی ۔ ترقی پسند دبک کر بیٹھ گئے تھے یہ بات سن اکیاون باون کی ہے ۔

یہ ایک کھلی حقیقت تھی کہ ترقی پسند ادیب کمیونسٹ پارٹی کے زیرِ اثر تھا ہندوستان میں بھی کمیونسٹ ادیب، شاعر اور ان کے ہم خیال جیلوں میں بھرے جا رہے تھے۔ حالانکہ بھیمبڑی کانفرنس بے حد گھن گرج کے ساتھ قلم کی جگہ تلوار اٹھانے کے حق میں تھی۔ انقلاب دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ وہ وقت آ گیا تھا جب ادیب اور شاعر کو بھی بندوق اٹھانا تھی۔ زور شور کی تقریریں نہایت مرعوب کن تھیں۔ لیکن میں اپنے دل کی بات کہتی ہوں کہ کچھ لفظی ڈرامہ سا لگ رہا تھا۔ انقلاب ہم نے بھگتنا تو تھا نہیں جو پتہ چلتا کیسے آتا ہے۔ مگر جب مظفر شاہجہان پوری نے کہا۔

اب اُجالے میری دیوار تک آ پہنچے ہیں۔

تو بے حد متاثر ہوئے۔

اور کیفیؔ نے کہا۔

کوئی کھڑکی اسی دیوار میں کھل جائے گی۔

تو بے انتہا یقین کرنے کو دل چاہا بلکہ اس وقت تو یقین محکم ہُوا۔ یہ بھی تو یقین ہُوا تھا کہ انگریز چلا جائے گا تو دیس کی قسمت جاگ جائے گی۔ اگر انسان کے پاس یقین بھی نہ ہو تو کیسے جی سکتا ہے یہ یقین پھر وہم ثابت ہو تو پھر ادیب کا یا شاعر کا کیا قصور۔ ہاں مغالطے بے شک کہہ سکتے ہیں۔ اس وقت جو نعرے اٹھائے گئے تھے ان پر اتنی ہی ایمانداری سے یقین تھا جتنا جدید لوں کو اپنی تنہائی، گھٹن، تاریکی اور چند دروازوں کا یقین ہے۔ انسان کا یقین قید نہیں کیا جا سکتا۔

کمیونزم سے امریکہ بے حد خائف ہے۔ ذرا سے شبہے پر کمیونسٹ کا الزام لگا دیا جاتا ہے۔ امریکن پر کمیونزم کی بے حد ہیبت طاری ہے۔ اس لئے نہیں کہ وہاں کمیونسٹوں نے کچھ تباہ کاریاں مچائی ہیں۔ اس سے پہلے کہ امریکہ میں کمیونزم کا بیج پھلتا جڑ پر کاری ضرب پڑی اور وہ جاگیرداری سرمایہ دار جنہیں کمیونزم سے خوف

آتا ہے کہ ان کی اجارہ داری پر ضرب پڑنے کا خطرہ ہے۔ ایک دم ایک کمیونسٹ ملک کی فتح اور ترقی سے بھونچکے رہ گئے۔

کروڑوں ڈالر کمیونزم کے خلاف پروپیگنڈے میں خرچ کئے جاتے ہیں۔ جہاں بھی کمیونزم سر اٹھاتا ہے۔ امریکہ کا پتہ کٹ جاتا ہے۔ نہ وہاں ہتھیار کھپ پاتے ہیں نہ خام مال پر قبضہ ہو سکتا ہے۔

سی آئی اے کمیونزم کی بیخ کنی کے لئے نہایت کامیاب کدال ثابت ہو چکی ہے مجھے ایک امریکی نوجوان نے بتایا کہ ہندوستان کی ترقی پسند تحریک کمیونزم کا پرچار کرتی ہے اور روس کی طرفدار اور امریکہ کی دشمن ہے۔ ترقی پسند سرمایہ داری کے خلاف زہر اگلتے ہیں اور روس کے گن گاتے ہیں۔ چین سے بھی اس وقت امریکہ بدکتا تھا کیونکہ روس اور چین کی دوستی تھی۔ وہ تو جب ان دو کمیونسٹ ملکوں میں کھنچاؤ پیدا ہُوا تو امریکہ چین کو سراہنے لگا۔ اور دوستی کا ہاتھ بڑھایا، گو چین اب بھی اکڑا ہی رہتا ہے مگر امریکہ حرف بغضِ معاویہ کے اصول پر چل کر چین کے ہر طرح مکھن لگاتا ہے۔

میں نے اس امریکی نوجوان سے پوچھا کہ "کیا واقعی ترقی پسند تحریک سے امریکہ کو خوف آتا ہے۔ اتنا دم تو نہیں معلوم ہوتا اس تحریک میں؟"

"ہم لوگ احتیاط میں یقین رکھتے ہیں۔ چھینک آئے تو نمونیے کا امکان ہو سکتا ہے کہ بوند بوند ہی سمندر بنتا ہے۔ اگر پہلی بوند کو ہی طوفان نہ سمجھا تو ہو سکتا ہے انجام خوشگوار نہ ہو۔"

امریکی بہت صاف گو اور کمیونسٹوں کے مقابلے میں بھولے ہوتے ہیں وہ نوجوان سی۔ آئی۔ اے کی کارگزاریوں کی تفصیل بڑے فخر سے بیان کرتا رہا۔ اسے شبہ بھی نہ تھا کہ میرا ترقی پسند تحریک سے کوئی واسطہ ہوگا اور نہ میں نے بتایا۔

"میں سی۔ آئی۔ اے کی گرانٹ پر ہندوستان اور پاکستان کے اردو ادب

پر تحقیقات کے لئے بھیجا گیا ہوں کہ ان کا جھکاؤ کس رخ ہے یہی مجھے معلوم کرنا ہے۔

"اور ہندی ادب پر بھی تحقیقات ہو رہی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

وہ دوسرا گروپ ہے۔ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔"

"تمہاری تحقیقات کے بعد کیا ہوگا؟"

"یہ میرا کام نہیں۔ مجھے صرف اپنے کام سے کام۔"

"پھر بھی کچھ اندازاً بتاؤ۔"

"کچھ روک تھام کی جائے گی۔"

"تحریک کو کمزور کرنے کی۔"

"ہاں۔"

"کیسے؟"

"جیسے کمیونسٹ اپنے حمایتی بناتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کی ہمت افزائی کر کے۔"

"تم غیر ترقی پسند تحریک کی ہمت افزائی کرو گے؟"

"یقیناً۔"

کچھ ہی سال بعد ایک دم ترقی پسند ادیبوں پر حملے ہونے لگے۔

(۱) ترقی پسند گٹھ بند ہیں۔ اپنوں کو جھنڈے پر چڑھاتے ہیں۔

(۲) ترقی پسند نعرے باز ہیں۔

(۳) ترقی پسندی بس پروپیگنڈہ ہے۔ رومانیت سے خالی، خشک بے مزہ۔

(جبکہ ترقی پسندوں کے اپنے جریدے یا تو پاکستان چلے گئے تھے اور دم توڑ رہے تھے اور شمع، بانو، اور کھلونا میں جو عوامی رسالے ہیں۔ ان کی تحریریں بڑی دلچسپی سے چھاپی اور پڑھی جاتی تھیں۔)

(۴) ادب میں جمود ہے۔

(۵) ترقی پسند مر گئے، ختم ہو گئے۔

(۶) ترقی پسند نئے لکھنے والوں کی رہنمائی نہیں کرتے (مرنے کا فتویٰ ملنے کے بعد)

سیما سے میں نے بڑے پیار سے کہا "سیما ڈاکٹری پڑھو گی۔"

تنتنا کے بولی "نہیں۔" اور پھر چپ ہو گئی۔ میری اماں نے کہا تھا "شادی کرو۔"

"نہیں" میں نے کہا تھا اور میری ماں کی ایک نہ چلی تھی۔

جب ادب میں جمود کا فتویٰ دیا گیا تھا تو جو ترقی پسند ادیب تھے وہی سالوں بعد پاکستان اور ہندوستان کے ادیبوں کی رائے سے برصغیر کے عظیم ترین ادیب مانے گئے اور ان کی تحریریں دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوئیں۔

راجندر سنگھ بیدی نے "ایک چادر میلی سی"، "متھن"، اور "بل" نہیں لکھی تھی۔ قرۃ العین نے "آگ کا دریا"، "پت جھڑ کی آواز"، "کار جہاں دراز"، اور سردار جعفری کی "نئی دنیا کو سلام" بھی شاید نہیں چھپی تھی۔ "ایک خواب" اور "لہو پکارتا ہے" بھی نہیں چھپی تھی۔

ساحر لدھیانوی نے "پرچھائیاں" نہیں لکھی تھی۔

اور جیلانی بانو تو شاید گڑیوں سے کھیل رہی تھی۔ "ایوانِ غزل" کی چوکھٹ سے بھی انجان تھی۔

آمنہ ابوالحسن نے بھی پر نہیں نکالے تھے۔

فیض احمد فیض بھی شاید جیل میں تھے۔

احمد ندیم قاسمی شاعر تھے (جب تک افسانے کم ہی لکھے تھے۔ اور شاید (منٹو تو مرنے کے بعد ہی پیدا ہوا)

ترقی پسند ادیبوں اور جدیدیوں کے درمیان ایک دیوار تعمیر کی گئی۔ اور وہ عظیم معاصر وہ تنقید نگار تھے جنہیں ترقی پسندوں نے نظرانداز کیا تھا۔ ان سے اپنی کتابوں کے مقدمے لکھوانے کی التجا نہیں کی تھی۔ ان کی تنقیدوں کو ایک

کان سن کر دوسرے سے اُڑا دیا تھا۔ جنہیں عزت اور محبت تو دی تھی لگامیں ان کے ہاتھوں میں نہیں تھمائی تھیں۔ تجزیئے نہیں کروائے تھے۔

آج تنقید نگاری سب کچھ ہے۔ اس کی بڑی دھونس ہے۔ جو خود تو نہ لکھ سکے دوسروں کے اناج کی چھان پھٹک سے ہی کھیر کا حصہ لے گئے۔

ترقی پسندوں کی موت کا سرٹیفکیٹ دینے کے بعد نئے بچوں کے منہ میں چسنیاں ٹھونس دیں۔ فرد کی اہمیت یعنی جم غفیر سے کراہت۔ معنی فضول لفاظی پر زور، کہانی کیا ہے اور کیا نہیں اور ساتھ میں مغرب کے تنقید نگاروں کے وزنی وزنی حوالے، مغربی تنقید نگاروں کو چونکہ جدید ادب کے معماروں کو پڑھنے کا موقع نہیں ملا ہوگا۔ ضرور دھونس میں آجائیں گے۔ بھلا دلائی فرج ٹی۔ وی، مکسر، استری اتنی قابل فخر اشیاء ہوتی ہیں تو سوچیے کہ ٹکس کتنے دھانسو ہوں گے۔

ترقی پسند تحریک جدیدیت، کے دھوم دھڑکے کے آگے سو گئی۔ کچھ عمر کا تقاضہ کچھ تندرستی کی بے وفائی، ہزاروں فکریں۔

انہیں، ترقی پسند ادب مرگیا، غریب کو دفن کر دو۔ یہ ضد کی ایک چوتھائی تک سینہ کوبی کی کیا ضرورت ہے؟"

مگر ہٹلر کا قول تھا کہ اگر ایک بات بار بار دہرائی جائے تو جھوٹ بھی سچ معلوم ہونے لگتی ہے۔ تنقید نگار لوہر کرتے ہوں مگر نفسیات سے بخوبی واقف ہیں۔

ایک تو حالاتِ زمانہ اوپر سے رسالوں کی قلت۔ رہ گئے شمع۔ روبی اور بیسویں صدی تو وہ قطعی معیاری نہیں۔ نئے نویلے ترقی پسند جو نئے ادیب کی لگام میں جکڑے ہوئے ہیں۔ وہ صرف معیاری رسالے نکالنے پر مُصر ہیں جو شمع اور بیسویں صدی کی طرح عوام کی دسترس سے بچے رہیں۔ صرف خواص کے لئے مخصوص رہیں۔ جب یہ کہانی اور ساتھ میں ان کے تجزیے یعنی بالکل سلیقہ سے بوٹیاں کر کے پہ لیٹیر لگکر میں دم دے

کر زود ہضم ڈش تیار۔ نسخہ استعمال منسلک کر...... کہیں کسی غبی کو لڑھ مزے یا منہ چڑھ گیا تو بجائے ہولے ہولے مزے لے کر چوسنے کے کڑکڑ چبا جائے گا۔ اور کمبخت کو بدہضمی یقینی بے چاری جدیدیت!

مغرب میں ادیب تنقید نگار سے کانپتے ہیں۔ اس کے قلم کی ایک جنبش موت اور زندگی پر بھاری پڑتی ہے۔ اکثر رشوت وصول کرتے ہیں ورنہ ایسے اوٹ پٹانگ قطعی سمجھ میں نہ آنے والے تبصرے لکھ دیتے ہیں کہ کتاب قتل ہو جاتی ہے۔

مغرب میں لوگ اشتہار باز کے رحم و کرم پر جیتے ہیں۔ جتنا دھماکے کا اشتہار ہوگا اتنے ہی فرّاٹے سے مال بکے گا۔ لوگ اندھا دھند ٹوٹ پڑیں گے جب کہ زیادہ تر مال ناقص ہوگا۔ بس اشتہار کی ٹیکن سے بازار میں ٹِک جائے گا۔

تنقید بھی ایک قسم کا اشتہار ہے۔ جو کہانی کوئی ویسے پڑھنے پر تیار نہ ہو، اسے کسی بھاری بھرکم تنقید نگار کی نلکی کے ذریعہ حلق سے نیچے اُتار دیا جائے اور "قاری" کو دھونسیائے بغیر بعض جدید چیزیں شاید بھاڑے بغیر نہ پلائی جا سکیں۔

مگر مشکل یہ آن پڑی ہے کہ "قاری" کی مقدار جہاں تک اردو کا معاملہ ہے دن بدن مختصر ہوتی جاتی ہے۔ زیادہ تر ایسا طبقہ پیدا ہو رہا ہے جو کتاب کے بجائے سینما کی ٹکٹ کی خریداری میں زیادہ دلچسپی لیتا ہے یا شمع، روبی فلمی رسالے پسند کرتا ہے۔ بھلا اپنا بھ بجین۔ دیکھا۔ دھرمیندر اور ہیما مالینی کے رومانوں کے آگے بیچارے فرد کی تنہائیوں، اندھیروں اور بند دروازوں کی کیا چل سکتی ہے۔

کبھی ترقی پسند تحریک کا مدعا تھا کہ عوام تک پہنچا جائے۔ آج عوام پسند رسالوں پر ناک بھوں چڑھائی جاتی ہے۔ فلموں کے ذریعہ روزی کمانے کو نہایت نیچا اور اکیڈمیوں کے ذریعہ ادب نوازی نہایت بلند و بالا! حالانکہ بڑے بڑے ادبی سورما فلمی دنیا میں دھنسنے کی کوشش کر چکے ہیں۔ ناکامی کی صورت میں ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ کبھی ادب نوازی ادب کی خاطر کی جاتی تھی۔ آج اکیڈمیوں کی مہربانی کی محتاج، روزی اور اہمیت

حاصل کرنے کا ذریعہ بنتی جا رہی ہے۔

تنقید نگار کے لئے ضروری نہیں کہ وہ خود بھی کہانی یا شعر لکھنا جانتا ہو۔ وہ تو بالکل ڈاکٹر کی طرح چیر پھاڑ کے فن میں یکتا ہوتا ہے۔

اس تنقید نگار کا کیا بھروسہ جو کل تک جدیدیت کی تعریفوں میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہا تھا۔ آج پھر ترقی پسندی کا دامن تھام رہا ہے۔ کیا ادیب کو ...ملانا ہی مقصد تنقید ہے۔

اس سے اندازہ لگا لیجئے کہ تنقید نگار نے کیا جادو کی چھڑی گھمائی ہے کہ آج ہر صاحب قلم تنقید پر اُتر آیا ہے۔ اور تو اور جوگندر پال انور عظیم اور عابد سہیل بھی اس میدان میں اُتر آئے۔ ادیب یعنی شاعر اور کہانی کار ناول نگار اتنا تھک گیا ہے کہ اسے تنقید کی ہوا بھرنے کی ضرورت پڑتی ہے ورنہ غبارہ نہیں اُڑے گا۔

قاضی عبدالستار سے بات ہوئی کہ یہ تنقید پر کیوں یونہی بول دیا کہنے لگے " بھئی ڈیپارٹمنٹ میں بھاری بھرکم مقالوں کی قدر ہوتی ہے۔ تنقید نگار کا ایک رتبہ بنتا ہے۔ یعنی ریڈر سے ڈین آف فیکلٹی یا پروفیسری کے لئے ضروری ہے کہ آپ کوئی وزنی پتھر ڈھوئیں۔ تب ہی رعب پڑے گا۔ ان کہانیوں اور شاعری سے ترقی کے دروازے نہیں کھولے جا سکتے۔

فاہم ایکٹرس جب کوئی اچھا رول مانگتی ہے تو اپنی سب سے بھاری ساڑھی پہن کر پروڈیوسر سے ملنے جاتی ہے۔

کوئی بھی "معیاری" رسالہ اٹھا لیجئے۔ بس یہی لکھا ہوگا کہ کیسے لکھوں؟ کیا لکھوں؟ یاخدایا بھٹکے ہرنوں کے غول کب تک ہانکتے رہیں گے۔